صیہونیت اور عالم اسلام

طارق اسمٰعیل ساگر

ہر قسم کے ناول و ڈائجسٹ کرایہ پر حاصل کریں
خرید و فروخت کے لیے تشریف لائیں
عمران لائبریری

مکتبہ القریش چوک اردو بازار لاہور

خلیجی جنگ اور یہودیت

یہودی فلسطین کی ایک پہاڑی صیہون کو مقدس سمجھتے ہیں۔ اس کے نام پر انہوں نے اپنی دہشت گرد تنظیم یہودیت کی ابتداء کی۔ یہودیوں کے چند بڑے دانشمندوں نے 1897 سے 1905 تک خفیہ اجلاس کیے اور تمام عرب ممالک پر قبضہ کے لئے منصوبہ تیار کیا اور یہ منصوبہ ایسی خوبی سے پوشیدہ رکھا گیا کہ اعلیٰ سطح کے یہودیوں کے سوا کسی دوسرے کی اس تک رسائی نہ تھی اور اس کی تحریر عبرانی زبان میں تھی۔ اس منصوبے کی بنیاد فری میسن کی کامیابی پر رکھی گئی۔ فری میسن کی بنیاد 1717ء میں یہودیوں نے مملکت انگلستان میں رکھی۔

یہودیوں نے اپنے منصوبے عظیم اسرائیل کو علامتی سانپ کا نام دے رکھا ہے۔ جو تمام عالم اسلام کو اپنے گھیرے میں لئے ہوئے ہے۔ اور اس کا منہ یروشلم کی طرف ہے۔

گذشتہ صدی پر ایک نظر ڈالیے تو آپ پر واضح ہو جائے گا۔ کہ یہودی یروشلم کس طرح پہنچے۔ اور انہوں نے ساری دنیا کو صیہونیت کے چنگل میں لینے کے لئے کیا کیا منصوبے بنائے اور اب عراق، امریکہ اور اتحادی ٹکراؤ بھی اسی منصوبے کی ایک اہم کڑی تھی۔

1905ء میں روس کے ایک پادری پروفیسر اے نیلس کے ہاتھ اس منصوبے کی ایک کاپی لگ گئی۔ پروفیسر اے نیلس نے روسی زبان میں اسے شائع کر دیا۔ یہ تاریخ عالم کی ایک خطرناک دستاویز ہے۔ اسلام کے لئے ایک بھیانک خطرہ اور چیلنج ہے۔ اس منصوبے میں تمام غیر یہودیوں کو (جن میں عرب اور عیسائی ہیں) مویشی اور حیوان کہا گیا ہے۔

پروفیسر اے نیلس لکھتے ہیں۔ کہ اس یہودی منصوبے کے اغراض و مقاصد کسی غیر یہودی کو معلوم نہیں اور نہ ہی یہ مویشی (مسلمان، عیسائی) شک کر سکتے ہیں۔ یہ صرف ظاہری نمود و نمائش کو دیکھ کر موج در موج ہمارے بلاک میں چلے آ رہے ہیں۔ اور ہم ان کی آنکھوں میں

دھول جھونک رہے ہیں۔ دنیا کی وہ کون سی ملت ہے۔ جس کے صاحبان اقتدار کی آنکھوں پر ہم نے اپنے مطلب کا رنگ دار چشمہ نہیں رکھ دیا ہے۔ اس چشمہ سے انہیں وہی کچھ نظر آتا ہے۔ جو انہیں ہم دکھانا چاہتے ہیں۔ اور یہ غیر یہودیوں کی حماقت ہے۔

وہ ابھی تک کہتے ہیں کہ ان کے سرکاری راز ڈھکے چھپے ہیں۔ غیر یہودی سمجھتے ہیں کہ وہ سب کچھ جانتے ہیں مگر یہ ان کی بھول ہے کیونکہ ہم ہی ہیں۔ جو سب کچھ جانتے ہیں۔ یہ لوگ جاہل اور کم عقل ہیں۔ ان کی سرگرمیوں کی قیادت ہمارے ہاتھ میں ہے۔ اور ہم انہیں ایک سوچے سمجھے مقصد کے تحت ایک خاص منزل کی طرف لے جا رہے ہیں۔ یہ لوگ ایک خاص قسم کی شہرت و اہمیت کے بھوکے ہیں۔ جو ہم انہیں مہیا کر دیتے ہیں۔

1950ء میں ڈیوڈ بن گوریان نے قوم سے خطاب کرتے ہوئے کہا کہ ہمیں جوش و خروش کے ساتھ یہ جنگ جاری رکھنا ہوگی۔ ہمیں ایک بار پھر سلیمانؑ کے زمانے کی سلطنت قائم کرنا ہے۔ 29 جولائی 1951ء کو وزیر اعظم ڈیوڈ بن گوریان نے اسرائیلی پارلیمنٹ میں تقریر کرتے ہوئے اس بات پر زور دیا کہ تحریک صیہونیت کا اولین منشاء بکھری ہوئی بھیڑوں کو جمع کرنا ہے۔

اس کا مطلب 50 لاکھ یہودیوں کو دس سال کے اندر اندر اسرائیل میں جمع کرنا ہے۔ مگر اسرائیل کے وسائل اس کے متحمل نہیں ہو سکتے۔ اس لئے ہمیں خارجہ پالیسی میں یہ بات پیش نظر رکھنی چاہیے کہ اسرائیل کی ساری زمین کو خالی کرایا جائے اور اسرائیل کی ساری زمین سے مراد دریائے نیل کے کنارے سے فرات تک پھیلا ہوا علاقہ ہے۔ چنانچہ جب 13 اگست 1951ء کو یروشلم میں عالمی صیہونی کانفرنس منعقد ہوئی۔ تو اس میں سب سے اہم زیر بحث موضوع یہی تھا۔

1952ء کے اوائل میں وزیر جنگ موشے دایان نے قوم کے نام پیغام میں کہا کہ ہر ایک یہودی کو میدان جنگ میں نکل آنا چاہیے۔ اور میں نے فوج سے کہہ دیا ہے کہ وہ دن رات تیاری میں مصروف رہیں۔ یہودی سلطنت کا قیام ہمارا نصب العین ہے۔ اور ہم اسے حاصل کر کے دم لیں گے۔

13 مارچ 1952ء کو یہودی ریاستوں کی سرحدوں کا تعین کرتے ہوئے لیبر پارٹی کے سربراہ ڈاکٹر عاری القمان نے اس منصوبے کو فاش کر دیا۔ جو اب تک مخفی رہا۔ اس نے کہا۔ عظیم تر اسرائیل عراق سے سویز تک پھیلا ہوا ہے۔ یہی وہ طاقتور ریاست ہو سکتی ہے۔ جو مشرق وسطیٰ میں اندرونی اور بیرونی امن و استحکام کی ضمانت دے سکے۔ ہمارا فرض ہے کہ ہم دنیا کو صاف صاف اور واضح الفاظ میں بتا دیں کہ فلسطین میں دنیا بھر کے یہودیوں کو جمع کر کے فوجی بنانے کا مطلب اسرائیل کی نئی سرحدوں کا تعین کرنا ہے۔ جو عراق سے سویز تک پھیلی ہوئی ہے۔ اس کے بعد ہی اسرائیل مشرق وسطیٰ میں جمہوریت کا گہوارہ بن کر اپنے آپ کو تباہی سے بچا سکتا ہے۔ قبل ازیں اسرائیل کے وزیر اعظم ڈیوڈ بن گوریان نے پارلیمنٹ میں 1951ء کی سالانہ رپورٹ پیش کرتے ہوئے کہا تھا کہ ہمیں کوئی وسیع ملک نہیں ملا بلکہ ہم 70 سال کی مسلسل جدوجہد کے بعد اپنے ملک کے چھوٹے سے حصے کی ابتدائی منزل میں داخل ہوئے ہیں۔

اس سال اسرائیل میں اپنی میراث کے ملک کی نشان دہی کرتے ہوئے پارلیمنٹ کی پیشانی پر یہ الفاظ کندہ کئے "اے عظیم اسرائیل تیری سرحدیں نیل سے فرات تک ہیں"۔

ایک یہودی مصنف نے لکھا ہے کہ اس "عظیم تر اسرائیل" میں پورا شام، پورا لبنان، اردن و عراق کا بڑا حصہ صحرائے سینا بالائی نجد اور مدینہ منورہ تک کا علاقہ شامل ہے کیونکہ سرور کائناتؐ کے عہد میں یہودی مدینہ میں آباد تھے۔ یہودیوں کے لئے الگ سلطنت کا قیام صیہونیت کا واحد مقصد نہیں ہے بلکہ اسرائیل کے قیام کے بعد ہمارے لئے اپنی تحریکوں کو آگے بڑھانا ضروری ہو گیا ہے۔ اسرائیل کی حکومت صرف ایک وسیلہ ہے، منزل نہیں ہے۔

مسٹر بیگن نے اسرائیلی پارلیمنٹ میں بہت پہلے بتا دیا تھا کہ اسرائیل کے لوگوں اور خود اسرائیل کی اس وقت تک کوئی اہمیت نہ ہوگی۔ جب تک ہم اپنا پورا علاقہ صلح ناموں پر دستخط کئے بغیر آزاد نہ کرا لیں۔

بہر حال یہودی منصوبے کا ایک مرحلہ مکمل ہو چکا ہے۔ فلسطین اور جزیرہ نمائے سینائی

پر اسے تسلط حاصل ہو گیا ہے۔ اب وہ اسی منصوبے کے آخری مرحلے کی تکمیل کے لئے کام کر رہا ہے۔

اس مرحلے کے دو اجزاء اہم ترین ہیں۔

(1) ایک یہ کہ مسجد اقصیٰ اور قبتہ الصخرا کو منہدم کر کے ان کی جگہ ہیکل سلیمانی تعمیر کیا جائے۔

(2) دوسرا یہ کہ اسرائیل اپنی میراث کے ملک پر قبضہ کر لے۔

اس سلسلے میں امریکہ اور اس کے ہمنوا پوری طرح اسرائیل کا ساتھ دے رہے ہیں۔ اس کا واحد اور آخری حل یہی ہے کہ مسلمان نفاق پر لعنت بھیج کر خدا کی رسی کو مضبوطی سے تھام لیں اور متحد ہو جائیں۔

یاد رکھئے کہ قوموں کی تقدیر ایوانوں میں نہیں، میدان جنگ میں بنتی ہے اور جو لوگ ایوانوں پر انحصار کرتے ہیں انہیں ہزیمت اور ذلت کا سامنا کرنا پڑتا ہے۔ اگر اب بھی آنکھیں نہ کھولی گئیں تو وہ وقت دور نہیں جب مسلم اقوام دشمن کے رحم و کرم پر ہوں گی اور مسلم ماؤں، بہنوں اور بیٹیوں کی عصمتیں دشمنوں کے رحم و کرم پر ہوں گی۔ امریکہ، اسرائیل، بھارت اور دوسرے یورپی اتحادی ممالک کی عالم اسلام کے خلاف موجودہ یلغار ہمارے سامنے ہے۔

آپ نے دیکھا کہ مسلمانوں کے باہمی نفاق سے فائدہ اٹھا کر کس طرح دشمن بھوکے گدھوں کی طرح عالم اسلام پر ٹوٹ پڑا۔ آج صرف عراق تباہی سے دوچار نہیں ہوا بلکہ کویت جو فی کس آمدن کے لحاظ سے دنیا میں نمبر ایک ملک شمار ہوتا تھا، وہ کویت بھی تباہی، بربادی اور ناامیدی سے دوچار ہے۔

مسلمانوں کا کالا سونا جل رہا ہے---!!

اگر کوئی بیوقوف دانشور یہ کہتا ہے کہ صدام نے کویت کے چشموں کو آگ لگا دی۔ اس کی معیشت تباہ کر دی تو وہ احمقوں کی جنت میں رہتا ہے۔ آگ کویت میں تیل کے چشموں کو نہیں لگی۔ مسلمانوں کے دلوں میں لگی ہے اور یہی صیہونیت کا منشا ہے۔

یہودی پروٹوکول ہمیں بتاتا ہے کہ یہودیوں نے مسلمانوں کو مسلمانوں کے ہاتھوں ذلت اور تباہی سے دوچار کرنے کے لئے کیسے کیسے گھناؤنے منصوبے بنا رکھے ہیں۔ دکھ کی بات تو یہ ہے کہ یہ کوئی ایسی ڈھکی چھپی دستاویز نہیں رہی۔ مسلمانوں نے ماضی میں (اور حال میں بھی) یہودیوں کی حرام کاریوں کا مزہ چکھ لیا ہے اور اب بھی وہ ہوش میں آنے کے لئے تیار نہیں ہیں۔

یاد رکھئے اگر کوئی قوم اپنے ہاتھوں اپنی قبر کھودنے پر تل جائے۔ اگر کسی قوم نے تباہ ہونے کا عزم مصمم کر لیا ہو---- تو پھر دنیا کی کوئی طاقت اسے نہیں بچا سکتی اور لگتا یوں ہے کہ یا تو ہم من حیث القوم پاگل ہو گئے ہیں یا پھر زبردستی اور جانتے بوجھتے ہوئے بھی تباہی خود پر مسلط کرنے کے درپے ہیں۔

خداوند عزوجل ہمارے حال پر رحم فرمائے اور ہمیں ہدایت نصیب کرے کہ ہم اب تو سنبھل جائیں کیونکہ اب کھونے کو ہمارے پاس رہ ہی کیا گیا ہے۔

حیرت کی بات یہ ہے کہ موجودہ خلیجی جنگ میں اسرائیل نے ایک گولی فائر کئے بغیر صرف اپنے تیس چالیس شہریوں اور چند عمارات کی قربانی دے کر جنہیں عراق کے سکڈ میزائل نے نشانہ بنایا ایک عظیم معرکہ سر کر لیا۔

جی ہاں! ذرا چشم تصور سے دیکھئے کہ جب عراق کی فوجی قوت جو اسرائیل کے لئے سب سے زیادہ خطرہ تھی پاش پاش ہو رہی ہو گی تو یہودیوں کے دل میں کیا کیا لڈو نہ پھوٹ رہے ہوں گے۔

اس بات میں کیا شک ہے کہ اسرائیل کے لئے دنیا میں عراق سے بڑھ کر خطرناک ملک کونسا تھا اور یہ اسرائیل ہی تھا جس نے عراق کے ایٹمی پلانٹ پر حملہ کر کے تباہ کیا اور جو برملا عراق کی تباہی کی خواہش کا اظہار کرتا رہا۔

کیا آج بھی ہم یہ ماننے سے انکار کریں گے کہ بین الاقوامی پریس میں موجود یہودی گماشتوں نے جان بوجھ کر عراق کی فوجی طاقت کی موجودہ اتحادی حملے سے سالوں پہلے ہی ایسی بھیانک تصویر پیش کرنی شروع کر دی تھی جس نے ایک طرف عیسائی مغربی طاقتوں کو گمراہ کیا

وہاں سادہ لوح مسلمان بھی اس دھوکے کی چال میں آ گئے اور انہوں نے ضرورت سے زیادہ توقعات عراق سے وابستہ کرلیں۔

یہ موجودہ خلیجی جنگ کا بڑا بھیانک روپ ہے جس پر "پاکستانی پریس کا کردار" والے حصے میں بحث کی جائے گی۔

آیئے پہلے دیکھیں کہ بین الاقوامی پریس نے واقعات کی کس انداز سے تصویر کشی کی۔

بین الاقوامی پریس

ڈیلی ٹیلی گراف۔ لندن

15-1-91

الفاظ کے محاذ پر سرگرمیوں کا آغاز

صدام حسین نے گذشتہ جولائی میں خلیجی ریاستوں اور امریکہ پر الزام لگایا کہ انہوں نے تیل کی قیمتوں میں کمی کر کے عراق کی پشت میں زہریلا خنجر گھونپا ہے۔ اگست میں انہوں نے کویت پر حملہ کر کے اسے اپنی ریاست میں ضم کرلیا۔ اس ننگی جارحیت کے نتیجہ میں آج پوری دنیا جنگ کے دہانے پر آ کھڑی ہوئی ہے۔ ذیل میں جولائی 90ء سے 14 جنوری 91ء تک کے ان اہم واقعات کی جھلکیاں پیش کی جا رہی ہیں جو اس سنگین عالمی بحران کا سبب بنے۔

عراق کی الزام تراشیاں اور دھمکیاں

17 جولائی۔ صدام حسین نے خلیج کی ریاستوں پر الزام لگایا کہ انہوں نے امریکہ کے ساتھ ایک سازش میں شریک ہو کر تیل کی قیمتوں میں جو کمی کی ہے۔ وہ عراق کی پشت میں خنجر گھونپنے کے مترادف ہے عراقی اس بات کو ہرگز نظرانداز نہیں کر سکتے کہ کسی کے ذرائع معاش میں رکاوٹ ڈالنے سے اس کی گردن کاٹ دینا بہتر ہے۔

18 جولائی۔ عراق کے وزیر خارجہ طارق عزیز نے عرب لیگ سے شکایت کی کہ کویت نے عراق کا 1.3 بلین ڈالر کی مالیت کا تیل چوری کیا ہے۔ مزید یہ کہ اس نے عراقی علاقہ میں فوجی چوکیاں بھی قائم کرلی ہیں۔

عراق کی جنگی تیاریاں

22 جولائی۔ مصر کے صدر حسنی مبارک نے کہا ہے کہ عراق کویت اور متحدہ عرب امارات کے مابین تنازعہ ایک ایسا بادل ہے جو جلد ہی گذر جائے گا۔

24 جولائی۔ عراق نے ٹینکوں کے ساتھ 30,000 فوجی دستے کویت کی سرحد پر بھیج دیئے۔

25 جولائی۔ عراق نے کویت سے مطالبہ کیا کہ وہ 1.3 بلین ڈالر کی رقم مسروقہ تیل کے معاوضہ کے طور پر ادا کرے۔ عراق نے مصر کو یقین دلایا کہ وہ کویت پر حملہ نہیں کرے گا۔

26 جولائی۔ عراق اور کویت کے مابین کشیدگی میں کمی کو محسوس کرتے ہوئے روزنامہ "عرب ٹائمز" (کویت) نے خیال ظاہر کیا کہ معاملہ ختم ہو گیا ہے۔

27 جولائی۔ عراق کی طرف سے دباؤ پڑنے پر اوپیک نے تیل کی قیمت میں اضافہ کر دیا۔ نئی قیمت 21 ڈالر فی بیرل مقرر کی گئی۔

31 جولائی۔ عراقی اور کویتی حکام کے مابین جدہ میں گفت و شنید، کویت کی سرحد پر عراق کی ایک لاکھ فوج کا اجتماع۔

یکم اگست۔ جدہ مذاکرات ناکام ہو گئے۔

کویت کے خلاف لشکر کشی

2 اگست۔ عراقی افواج مقامی وقت کے مطابق رات کے دو بجے کویت میں داخل ہو گئیں۔ عراق نے خبردار کیا کہ اگر کسی نے جارحیت کا ارتکاب کرنے کی کوشش کی تو کویت کو قبرستان بنا دیا جائے گا۔ امیر کویت فرار ہو کر سعودی عرب پہنچ گئے تاہم ان کا بھائی لڑائی میں مارا گیا۔ کویت نے عربوں سے امداد کی اپیل کی۔ بغداد نے دعویٰ کیا کہ عراق نے کویت کی دعوت پر مداخلت کی ہے۔ کویتیوں پر مشتمل ایک آزاد عبوری حکومت قائم کر دی گئی۔

اقوام متحدہ کی سلامتی کونسل نے عراقی حملہ کی مذمت کی۔ امریکہ نے بحرہند سے لڑاکا طیارے خلیج کو روانہ کر دیئے۔ برطانیہ، فرانس اور امریکہ میں عراق اور کویت کے اثاثے منجمد کر دیئے گئے۔ ماسکو نے عراق کو اسلحہ کی ترسیل روک دی۔

3 اگست۔ امریکہ کی طرف سے خلیج میں بحری فوج روانہ کرنے کا اعلان، عرب لیگ نے عراقی جارحیت کی مذمت کی، امریکہ نے ترکی اور سعودی عرب سے کہا کہ وہ عراق کی تیل کی پائپ لائنیں بند کر دیں۔

عراقی فوجوں کا سعودی عرب کی سرحدوں کی طرف مارچ۔ عراق کی طرف سے اعلان کہ وہ 5 اگست کو کویت سے نکل جائے گا۔

4 اگست۔ عراق کی طرف سے سعودی عرب پر حملہ کے منصوبہ کی تردید۔ تاہم اس کے فوجی دستوں کے بارے میں بتایا گیا کہ وہ کویت اور سعودی عرب کے مابین نیوٹرل زون میں داخل ہو گئے ہیں۔ عراق نے کویت میں 35 برطانوی باشندوں کو گرفتار کر لیا۔

5 اگست۔ یورپی برادری نے کویتی اثاثے منجمد کر دیئے اور عراق کے تیل کا بائیکاٹ کر دیا۔ صدر بش نے اعلان کیا کہ کویت سے واپسی کے بارے میں عراق نے ایک بار پھر جھوٹ بولا ہے۔ عراق نے پابندیاں لگانے والے ان ملکوں کو خطرناک نتائج کی دھمکی دی جن کے باشندے کویت میں مقیم ہیں۔

6 اگست۔ سلامتی کونسل نے عراق پر پابندیوں کی قرارداد منظور کر لی۔ کیوبا اور یمن غیر حاضر رہے۔ عراق نے خبردار کیا کہ ایسی پابندیاں کویت سے اس کی واپسی میں تاخیر کا سبب بنیں۔ عراقیوں نے برطانیہ، امریکہ اور جرمنی کے باشندوں کو نظربند کر دیا۔

خلیج میں امریکی افواج کی آمد

7 اگست۔ بش نے 82 ویں ایئربورن ڈویژن اور ایف۔15 لڑاکا طیاروں پر مشتمل 4,000 فوجی دستے سعودی عرب روانہ کر دیئے اور اس عزم کا اظہار کیا کہ عراق کے خلاف اقوام متحدہ کی عائد کردہ پابندیوں کو موثر بنایا جائے گا۔ صدام نے دعویٰ کیا کہ اس نے "کویت کے قارون کا تختہ الٹ دیا ہے"۔

8 اگست۔ بش نے اعلان کیا کہ خلیج میں امریکہ کا مشن کلیتہً دفاعی نوعیت کا ہے۔ عراق نے کویت کو یہ کہہ کر ضم کر لیا کہ ریت میں ایک لکیر کھینچ دی گئی ہے۔

9 اگست۔ سلامتی کونسل نے کویت کے ادغام کو خلاف قانون قرار دے دیا۔ عراق نے کویت میں موجود سفارتخانوں کو حکم دے دیا کہ وہ 24 اگست تک بغداد منتقل ہو جائیں۔ عراق

نے حفاظتی اقدام کے طور پر غیر ملکیوں کیلئے اپنی سرحدیں بند کردیں۔ برطانیہ نے ٹارنیڈو اور جیگوار طیاروں پر مشتمل سکواڈرن خلیج میں بھیج دیئے۔

10 اگست۔ قاہرہ میں منعقدہ عرب لیگ کے اجلاس میں 20 میں سے 12 سربراہان مملکت نے کویت سے عراق کے انخلاء کا مطالبہ کیا اور سعودی عرب میں عرب افواج بھیجنے پر اتفاق رائے ہوا۔ یورپی برادری نے سفارتخانے بند کرنے سے متعلق حکم کو مسترد کردیا۔ صدام کا امریکہ کے خلاف اعلان جہاد۔

11 اگست۔ یمن، اردون، لیبیا اور اسرائیل کے زیر تسلط مغربی کنارے کے علاقوں میں عراق کی حمایت میں مظاہرے ہوئے۔

12 اگست۔ صدام نے قوم سے اپیل کی کہ اقتصادی پابندیوں کے پیش نظر خوراک میں کمی کردیں۔ انہوں نے اقوام متحدہ سے پابندیاں ختم کرنے اور سعودی عرب سے امریکی افواج نکال کر اس کی جگہ مصر کے سوا دیگر عرب ملکوں کی فوج متعین کرنے کا مطالبہ بھی کیا۔ صدام نے عراق کی کویت سے واپسی کو اسرائیل کے مقبوضہ عرب علاقوں اور شامی افواج کے لبنان سے انخلاء کے ساتھ منسلک کردیا۔

اس دن ایک برطانوی باشندہ ڈگلس کراسکی کویت سے فرار ہونے کی کوشش میں مارا گیا۔

13 اگست۔ سعودی عرب نے عراقی ٹینکر کو بحیرہ احمر میں اس کے ٹرمینل مواجز سے نکال دیا۔ شاہ حسین کا دورہ بغداد۔

14 اگست۔ صدام حسین نے امریکہ پر "سنگین قذاقی" کا الزام لگایا۔ شاہ حسین کی امریکہ آمد۔ امریکہ نے یہ تجویز مسترد کردی کہ وہ اپنے جہازوں پر اقوام متحدہ کا جھنڈا لہرائے۔

15 اگست۔ صدام نے ایران کے ساتھ صلح کرلی تاکہ خلیج کی جنگ باضابطہ طور پر ختم ہو جائے۔ عراق نے ایران کے جنگی قیدی رہا کرنے اور شط العرب میں ایران کے حقوق تسلیم کرنے کا اعلان بھی کیا۔ روس نے الزام لگایا کہ اس کے 5,000 باشندوں کو عراق چھوڑنے کی اجازت نہیں دی جارہی ہے۔ 4 غیر ملکی یرغمال بنالئے گئے۔

16 اگست۔ عراق نے 400 برطانوی اور 2,500 امریکی باشندوں کو حکم دیا کہ وہ ہوٹلوں میں

منتقل ہو جائیں ورنہ انہیں گرفتار کرلیا جائے گا۔ جن انگریزوں نے حکم پر عمل کیا، انہیں کسی کے ساتھ ملنے کی اجازت نہیں دی گئی۔ صدر بش نے توقع ظاہر کی کہ شاہ حسین اقوام متحدہ کی طرف سے عراق پر لگائی گئی پابندیوں پر عمل کریں گے۔ امریکی پائلٹوں نے بتایا کہ انہوں نے عراق کے میراج طیاروں کی ناکہ بندی کردی ہے۔

17 اگست۔ عراق کی طرف سے اعلان کیا گیا کہ جارحیت پسند اقوام کے شہریوں کو روک لیا گیا ہے اور انہیں کلیدی تنصیبات کے قریب رکھا گیا ہے تاکہ بوقت ضرورت بطور ڈھال استعمال کیا جاسکے۔ عراق نے ایران کے محاذ سے اپنے فوجی دستے ہٹانے شروع کردیئے۔ برطانوی وزیر خارجہ ڈگلس ہرڈ نے عراق پر الزام لگایا کہ وہ غیر قانونی ہتھکنڈوں سے کام لے رہا ہے۔

18 اگست۔ حکومت عراق نے اعلان کیا کہ ناکہ بندی کے نتیجہ میں خوراک کی قلت پیدا ہوئی تو سب سے پہلے غیر ملکی اور ان کے بچے فاقہ کشی کا شکار ہونگے۔ سلامتی کونسل نے عراق پر زور دیا کہ وہ غیر ملکیوں کو جانے کی اجازت دے دے۔ کویت سے آنے والے ایک لاکھ مہاجرین اردن کے راستے عراق میں داخل ہوگئے۔ ایک عراقی اخبار نے خبردار کیا کہ اگر ہم پر حملہ کیا گیا تو ہم بھاری تباہی لانے والے ہتھیار استعمال کریں گے۔

19 اگست۔ عراق نے کویت میں مقیم مغربی باشندوں کو ہدایت کی کہ وہ ہوٹلوں میں جمع ہو جائیں، بصورت دیگر انہیں حراست میں لے لیا جائے گا۔ برطانیہ نے ان لوگوں کو مشورہ دیا کہ ایسے غیر قانونی احکام پر عمل نہ کریں۔

20 اگست۔ برطانیہ نے الزام لگایا کہ عراق نے اس کے 82 شہریوں کو گرفتار کرلیا ہے۔ اس طرح نظر بند انگریزوں کی تعداد 123 ہوگئی۔ بش نے 20 سٹیلتھ بمبار طیارے سعودی عرب بھیج دیئے۔

21 اگست۔ ایک خبر میں بتایا گیا کہ عراق کے ایک ٹینکر کو اقوام متحدہ کی پابندیوں کے خلاف عدن میں سامان اتارتے ہوئے دیکھا گیا ہے۔

22 اگست۔ بش نے 40 ہزار ریزرو فوجیوں کو طلب کرلیا۔ اردن نے عراق کے ساتھ اپنی

سرحد بند کردی تاکہ کویت سے آنے والے مہاجرین کا بوجھ کم ہو سکے۔

23 اگست۔ صدام نے ٹی وی نشریہ پر "سٹوارٹ لاک وڈ" کو سراہا۔

عراق کی ایک خبر میں بتایا گیا کہ اب تک پچاس لاکھ رضا کار پیپلز آرمی میں اپنے نام لکھوا چکے ہیں۔

24 اگست۔ عراقی فوج نے کویت میں واقع سفارت خانوں کا گھیراؤ کر لیا۔ روسی صدر گورباچوف نے خبردار کیا کہ اگر عراق نے کویت خالی نہ کیا تو اقوام متحدہ مزید اقدامات کرنے پر مجبور ہو جائے گا۔ روسی باشندے کویت چلے گئے۔

25 اگست۔ اقوام متحدہ نے پابندیوں پر عمل در آمد کیلئے عراق کے خلاف طاقت استعمال کرنے کی منظوری دے دی۔ آسٹریا کے صدر والڈ ہائیم نے بغداد میں صدام حسین سے ملاقات کی۔

سفارتی جارحیت

26 اگست۔ اقوام متحدہ کے سیکرٹری جنرل پیرز ڈی کوئیار نے اعلان کیا کہ وہ مصالحت کرانے کی کوشش کریں گے۔ شاہ حسین دوسرے امن مشن پر لیبیا پہنچے۔ عراق نے دھمکی دی کہ اگر کسی نے کویت اور عراق میں مقیم غیر ملکیوں کو پناہ دی تو اسے تختہ دار پر لٹکا دیا جائے گا۔

27 اگست۔ شاہ حسین کی امن مشن پر تیونس آمد۔ بش نے واشنگٹن سے 36 عراقی سفارتکاروں کو نکال دیا۔ برطانیہ نے بتایا کہ اس کے 157 باشندے عراقیوں کی حراست میں ہیں۔

برطانیہ سے ٹارنیڈو طیاروں کا ایک اور سکوارڈن خلیج میں پہنچ گیا۔

28 اگست۔ صدر صدام نے غیر ملکی عورتوں اور بچوں کو اپنے وطن جانے کی اجازت دے دی۔

29 اگست۔ برطانیہ کی طرف سے تمام مرد یرغمالیوں کی رہائی کی اپیل۔ خلیج میں جانے والا امریکہ کا ایک ٹرانسپورٹ طیارہ مغربی جرمنی میں گر کر تباہ ہو گیا۔ فضائیہ کے 13 افراد جاں بحق

30 اگست۔ برطانیہ کی وزیر اعظم مارگریٹ تھیچر نے یورپ پر الزام لگایا کہ وہ خلیج کے بحران سے نمٹنے میں بڑے سست اور بے ربط رد عمل کا مظاہرہ کر رہا ہے برطانوی پارلیمنٹ کا ہنگامی اجلاس طلب کرنے پر اتفاق رائے۔ پیرز ڈی کوئیار اور طارق عزیز کے مابین مجوزہ مذاکرات ملتوی کر دیئے گئے۔

31 اگست۔ امریکی بحریہ کا عراقی ٹینکر پر حملہ۔ مسز تھیچر نے لندن میں شاہ حسین کو بتایا کہ جب تک عراق کویت خالی نہیں کرتا، مذاکرات کے ذریعے کوئی تصفیہ نہیں ہو سکتا۔

یکم ستمبر۔ یرغمالیوں کا انخلاء جاری ہے۔ امریکہ اور روس کے سربراہوں کے بارے میں اعلان کہ 9 ستمبر کو ہیلسنکی میں ملاقات کریں گے۔

امیدیں دم توڑنے لگیں۔

2 ستمبر۔ اقوام متحدہ کے سیکرٹری جنرل عمان میں طارق عزیز کے ساتھ مذاکرات کے بعد ناکام و نامراد لوٹے۔ لیبیا کے کرنل قذافی نے اعلان کیا کہ ان کا ملک عراق کو فضائی راستے سے خوراک اور ایندھن فراہم کرے گا۔

3 ستمبر۔ کویت میں روپوش انگریز عورتوں اور بچوں سے کہا گیا کہ وہ باہر نکل آئیں تاکہ انہیں بغداد جانے والے قافلہ میں شامل کر لیا جائے۔

4 ستمبر۔ امریکی جنگی جہاز سے عراقی جہاز پر حملہ جو سری لنکا سے چائے اور دوسرا سامان لے کر آرہا تھا عراقی جہاز بچتے بچاتے مسقط پہنچ گیا امریکی وزیر خارجہ جیمز بیکر نے کانگریس کو بتایا کہ "یہ بحران نئی دنیا کے لئے ایک نازک لمحہ ہے"۔

"300 انگریز خواتین اور بچوں کو لے کر عراقی گاڑیاں بغداد پہنچ گئیں"

5 ستمبر۔ صدام نے قوم کے نام ایک پیغام میں کہا کہ "فتح بالکل قریب ہے" شاہ حسین نے صدام سے اپیل کی کہ مغربی یرغمالیوں کو رہا کر دیا جائے۔

6 ستمبر۔ پیدل فوج بھی جلد ہی روانہ کر دی جائے گی، مسز تھیچر کا اعلان۔ بیکر نے سعودی عرب

میں اس مسئلہ پر مذاکرات کئے کہ عراق پر حملہ کی اجازت کون دے سکتا ہے۔ عراق نے روسی ماہرین کو چلے جانے کی اجازت دے دی۔

7 ستمبر۔ سعودی عرب نے پیش کش کی کہ وہ خلیج میں امریکی افواج کا خرچہ برداشت کرے گا۔ ڈگلس ہرڈ نے تجویز کیا کہ اتحادی فوجوں کی کمان اقوام متحدہ کے ہاتھ میں نہیں ہونی چاہئے۔ عراق نے یرغمالیوں کو خبردار کیا کہ اگر کسی نے فرار کی کوشش کی تو اسے عمر قید کی سزا دی جائے گی۔

روس۔ امریکہ سربراہی ملاقات

بش اور گورباچوف کے مابین کویت سے عراق کے انخلاء پر اتفاق رائے، تاہم فوجی طاقت کے استعمال کے بارے میں اختلاف۔ امریکہ کی قریباً ایک لاکھ فوج خلیج میں پہنچ گئی۔ بحری جہازوں پر سوار دستے اس کے علاوہ ہیں۔ مسٹر طارق عزیز کی ایرانی حکام سے بات چیت کے لئے تہران میں آمد۔ 1979 کے بعد عراق کے اعلیٰ حکام کا پہلا دورہ۔ عراق کے خلاف کثیر القومی اتحاد کا قیام۔

10 ستمبر۔ بیکر نے نیٹو ممالک سے فوجی امداد دینے کی اپیل کی۔ صدام نے تیسری دنیا کی اقوام کو مفت تیل فراہم کرنے کی پیش کش کی بشرطیکہ وہ ٹرانسپورٹ کا انتظام کر سکیں۔ ایران نے عراق کے ساتھ سفارتی تعلقات بحال کر لئے۔ تاہم اس پر عائد پابندیاں ختم نہیں کیں۔

11 ستمبر۔ بش نے کانگریس سے خطاب کرتے ہوئے دعویٰ کیا کہ آخر کار صدام حسین اپنے مشن میں ناکام ہوں گے۔

جنرل کولن پاول نے اخباری نمائندوں کو بتایا کہ اب تک امریکہ کے 1'62'000 فوجی خلیج میں بھیجے جا چکے ہیں۔

12 ستمبر۔ ایران کے روحانی پیشوا آیت اللہ علی خامنہ ای نے خلیج میں امریکی افواج کے اجتماع پر کڑی نکتہ چینی کی۔

13 ستمبر۔ ایران نے یقین دلایا کہ عراق پر عائد کردہ پابندیاں ختم نہیں کرے گا۔ دفتر وزارت

خارجہ نے برطانوی باشندوں کو ہدایت کی کہ وہ کویت چھوڑ دیں۔

14 ستمبر۔ عراق کے فوجی دستے کویت میں واقع فرانس سمیت مغربی سفارت خانوں میں داخل ہو گئے۔

15 ستمبر۔ فرانس کے صدر متراں نے خلیج میں چار ہزار فوج بھیجنے کا حکم دیا۔

16 ستمبر۔ عراق کی طرف سے سرحد کھولنے پر لاکھوں کویتی باشندے سعودی عرب داخل ہو گئے۔ حکومت فرانس نے عراق کے 29 سول اور فوجی افراد کو ملک سے نکال دیا۔ عراقی ٹیلیویژن نے عراقیوں کے نام صدر بش کا ایک پیغام نشر کیا انہوں نے عراق کو یکہ و تنہا اور سب سے کٹا ہوا، قرار دیا۔ سابق برطانوی وزیر اعظم ایڈورڈ ہیتھ نے تجویز پیش کی کہ عراق کو کویت سے نکلنے کے لئے استحقاق کے مطابق پیش کش کی جائے۔

17 ستمبر۔ یورپی برادری نے عراق کے فوجی اتاشی کو نکال دیا۔ اور عراقی سفارت کاروں کی نقل و حرکت پر پابندی لگا دی۔ اقوام متحدہ میں عراق کی فضائی ناکہ بندی پر بحث ہوئی۔

18 ستمبر۔ پی ایل او کے لیڈر جارج حباش نے اعلان کیا کہ "ان کے گروپ کی انگلیاں لبلبی پر ہیں، جونہی امریکہ عراق پر حملہ کرے گا، وہ اتحادیوں کو چن چن کر موت کے گھاٹ اتاریں گے"

19 ستمبر۔ اسرائیلی وزیر اعظم اسحاک شمیر نے عراق کو خبردار کیا کہ اگر امریکہ واپس چلا گیا تو اس کا ملک اکیلا عراق سے لڑے گا۔

20 ستمبر۔ عراق کا دو ٹوک اعلان کہ کویت سے واپسی کا کوئی امکان نہیں۔ برطانیہ اور امریکہ کے مابین اس بات پر اتفاق رائے ہو گیا کہ سعودی عرب میں برطانوی افواج امریکی کمان کے ماتحت ہوں گی۔

21 ستمبر۔ عراق نے جوابی کارروائی کرتے ہوئے یورپی برادری، مصر اور امریکہ کے سفارت کار نکال دیئے۔

ریاض میں مبصرین نے خیال ظاہر کیا کہ شاید صدام حسین کویت سے ایسی واپسی پر غور کر رہے ہیں جس سے ان کی انا کو ٹھیس نہ لگے۔

22 ستمبر۔ سعودی عرب نے اردن کے 20 اور یمن کے 50 سفارتی نمائندوں کو ریاض سے چلے جانے کا حکم دے دیا۔ نیز اردن کو سستے داموں تیل کی فراہمی بند کر دی۔

23 ستمبر۔ صدام نے دھمکی دی کہ اگر امریکہ کی زیر قیادت افواج نے عراق کا گھیراؤ کرنے کی کوشش کی تو عراق اسرائیل کو تباہ اور تیل کے کنوؤں کو جلا کر بھسم کر دے گا۔

25 ستمبر۔ سلامتی کونسل نے 14:1 کی اکثریت سے عراق کی فضائی ناکہ بندی کی قرارداد منظور کر لی۔ روسی وزیر خارجہ ایڈورڈ شیورنادزے نے اقوام متحدہ کو بتایا کہ روس عراق کو کویت سے نکالنے کے لئے طاقت کے استعمال کے لئے تیار ہے۔

8 اکتوبر۔ اسرائیل نے ٹیمپل ماؤنٹ پر 21 فلسطینیوں کو گولیوں سے شہید کر دیا۔ اس طرح اس نے فلسطینی مسئلہ کو خلیج کے بحران سے منسلک کرنے کا جواز پیدا کر دیا۔

19 اکتوبر۔ عراق میں تیل کی راشن بندی کر دی گئی۔

ایڈورڈ ہیتھ کا مشن

21 اکتوبر۔ برطانیہ کے سابق وزیر اعظم مسٹر ایڈورڈ ہیتھ نے بغداد میں صدر صدام حسین سے ملاقات کی اور ان سے برطانیہ کے بوڑھے اور بیمار باشندوں کی رہائی کا مطالبہ کیا۔

23 اکتوبر۔ عراق نے فرانس کے جملہ 330 اور برطانیہ کے 33 یرغمالیوں کو مسٹر ہیتھ کے ہمراہ بذریعہ ہوائی جہاز بغداد سے جانے کی اجازت دے دی۔

25 اکتوبر۔ امریکہ کے وزیر دفاع مسٹر ڈک چینی نے توقع ظاہر کی کہ مزید ایک لاکھ امریکی فوج جلد سعودی عرب بھیج دی جائے گی۔

سی آئی اے نے انکشاف کیا کہ عراق کی مزید فوج کویت پہنچ گئی ہے۔

28 اکتوبر۔ صدام حسین نے اپنے وزیر تیل کو معزول کر دیا۔

29 اکتوبر۔ سلامتی کونسل نے بحران سے متعلق نویں قرارداد منظور کی جس میں عراق کو کویت میں جنگی نقصانات اور شہریوں کے ساتھ بدسلوکی کا ذمہ دار ٹھہرایا گیا۔

7 نومبر۔ مسٹر بیکر اتحادی ملکوں کے دورہ کے آخر میں ماسکو پہنچے۔ تیل کی قیمت کا بحران پیدا

ہو گیا۔

8 نومبر۔ عراق نے دھمکی دی کہ جنگ کی صورت میں وہ جزیرہ نما عرب کو جلا کر راکھ کر دے گا۔ صدام نے اپنے آرمی چیف کو برطرف کر دیا۔ بش نے ایک لاکھ سے زائد مزید فوج خلیج بھیجنے کا حکم دے دیا۔

9 نومبر۔ عراق نے دعویٰ کیا کہ وہ جنگ جیت لے گا۔

اقوام متحدہ ڈیڈ لائن مقرر کرتی ہے۔

29 نومبر۔ سلامتی کونسل نے قرارداد نمبر 678 کی منظوری دے دی جس کی رو سے اتحادی فوجوں کو اس امر کی اجازت مل گئی کہ اگر عراق 15 جنوری تک کویت خالی نہ کرے تو وہ عراق پر حملہ کر سکیں گی۔

30 نومبر۔ صدر بش نے عراقی وزیر خارجہ کو واشنگٹن کا دورہ کرنے کی دعوت دی اور تجویز پیش کی کہ مسٹر بیکر بھی بغداد جائیں گے اور صدام حسین کو بتا دیں گے کہ امریکہ اس معاملے میں پوری طرح سنجیدہ ہے۔ عراق نے جواب دیا۔ بش نے اپنی پالیسی تبدیل کر لی ہے تاہم فتح عراق کو حاصل ہو گی۔

یکم دسمبر۔ صدام نے مذاکرات کی دعوت اس شرط کے ساتھ منظور کر لی کہ مسئلہ فلسطین کو بھی ایجنڈا میں شامل کیا جائے۔

6 دسمبر۔ عراق نے تمام یرغمالیوں کی رہائی کا اعلان کر دیا ہے۔

11 دسمبر۔ بش نے ایک بیان میں کہا کہ عراق مسٹر بیکر کے دورہ بغداد کو 12 جنوری تک موخر کرنے کی جو کوشش کر رہا ہے اس کا مقصد ڈیڈ لائن سے پہلو تہی کرنا ہے۔

15 دسمبر۔ طارق عزیز نے بتایا کہ وہ واشنگٹن نہیں جائیں گے۔

17 دسمبر۔ بش نے اصرار کیا کہ عراق کے ساتھ امن کی بات چیت لازماً بروقت ختم ہو جانی چاہئے تاکہ 15 جنوری سے پہلے کویت سے اس کا انخلاء مکمل ہو سکے۔

18 دسمبر۔ یورپی برادری نے امریکہ عراق مذاکرات سے قبل کے ساتھ براہ راست مذاکرات

کرنے سے انکار کر دیا۔

مقررہ گھڑی سر پر آن پہنچی

22 دسمبر۔ عراق نے اپنے عزم کو دہرایا کہ وہ کویت سے ہرگز دستبردار نہیں ہو گا اور اگر اس پر حملہ کیا گیا تو کیمیائی ہتھیار استعمال کرنے سے گریز نہیں کرے گا۔

یکم جنوری۔ عراق نے مصر کے صدر حسنی مبارک کی امن تجاویز یہ کہہ کر مسترد کر دیں کہ وہ ہمیشہ دروغ گوئی سے کام لیتا ہے۔

3 جنوری۔ بش نے اعلان کیا کہ مسٹر بیکر اگلے چند دنوں کے اندر جنیوا میں عزیز کے ساتھ مذاکرات کے لئے تیار ہیں۔

4 جنوری۔ عراق نے بش کی دعوت سے اتفاق کرتے ہوئے اعلان کیا کہ اس کا وزیر خارجہ مسٹر بیکر سے ملنے کے لئے 9 جنوری کو جنیوا جائے گا۔ یورپی برادری نے مسٹر عزیز کو دعوت دی کہ وہ بیکر سے ملاقات کے اگلے روز اس کے سیکرٹری جنرل سے مذاکرات کرے، لیکن مسٹر عزیز نے وہ دعوت مسترد کر دی۔

6 جنوری۔ صدام نے اعلان کیا کہ عراق کویت پر اپنا قبضہ رکھنے بحال رکھنے اور فلسطین کو آزاد کرانے کے لئے ہر قسم کی قربانی دینے کو تیار رہے۔

7 جنوری۔ امریکہ اور برطانیہ نے دھمکی دی کہ ڈیڈ لائن میں ہرگز توسیع نہیں کی جائے گی۔

8 جنوری۔ بش نے عراق کے خلاف اتحاد میں شامل اقوام پر زور دیا کہ وہ مصالحت کے لئے کسی دباؤ کو خاطر میں نہ لائیں۔

9 جنوری۔ مسٹر بیکر اور طارق عزیز کی جنیوا میں ملاقات جو بے نتیجہ ثابت ہوئی۔

11 جنوری۔ صدام حسین نے مسلم لیڈروں کو آگاہ کیا کہ مسلمانوں اور کافروں کے مابین معرکہ بپا ہونے والا ہے۔ بیکر نے ایک بیان میں کہا کہ عراق 15 جنوری کی آدھی رات کو تباہی کے کنارے پہنچ جائے گا۔

13 جنوری۔ اقوام متحدہ کے سیکرٹری جنرل پیرز ڈی کوئیار نے صدام سے ملاقات کی اور بغداد

سے روانہ ہوتے وقت کہا۔ "خدا ہی بہتر جانتا ہے آیا جنگ ہو گی یا نہیں"۔

14 جنوری۔ صدام نے اپنی قوم سے اپیل کی کہ وہ کویت پر اپنا قبضہ بحال رکھنے کے لئے آخری دم تک جہاد کریں۔ عراق کی قومی اسمبلی نے اتفاق رائے سے کویت میں رعایت نہ دینے سے متعلق صدام کے موقف کی حمایت کر دی۔

ٹائمز۔لندن

16-1-91

جب لڑائی کے سوا کوئی چارہ نہیں رہا

روئے زمین پر اس سے زیادہ قابل نفرت اور گھناؤنا منظر کوئی نہیں ہو گا جیسا کہ خلیج میں فوجوں کی صف بندی سے پہلے دیکھنے میں آیا۔ وہ زمانہ بیت گیا جب قومیں جنگ و جدل کو باعث افتخار سمجھتی تھیں۔ اب اس سے بچنے کے لئے بے پناہ اخراجات برداشت کئے جاتے اور مسلسل کوششیں بروئے کار لائی جاتی ہیں۔ اس میں شک نہیں کہ وہ شاذ ہی ناکامی سے دوچار ہوتی ہیں۔ تاہم کویت پر عراق کی یورش کے معاملہ میں ایسی مساعی واقعتاً ناکام ہو گئیں۔ 1939 کے بعد کسی جارحیت نے ان لوگوں کے لئے جنگ کا ایسا واضح امکان پیدا نہیں کیا جو ہمیشہ انصاف پر مبنی بین الاقوامی نظام نافذ کرنے کے خواہاں رہتے ہیں۔ دو اگست کے بعد ڈپلومیسی کے ناکام ہونے کا الزام صحیح معنوں میں عراق پر عائد ہوتا ہے۔ امن پسند دنیا کو اب ان دو صورتوں میں سے کسی ایک کا انتخاب کرنا ہی یا وہ جارحیت سے چشم پوشی کر کے برائی کے آگے گردن جھکا دے یا اس کے خلاف لڑنے کے لئے شمشیر بکف ہو کر میدان میں آجائے۔

گذشتہ رات صدام حسین اور اتحادیوں کے مابین جنگ کی ابتداء میں صرف اتنی کسر رہ گئی کہ فرانس نے یک طرفہ طور پر اور کسی قدر نامعقول یہ تجویز پیش کر دی کہ اگر عراق کویت سے نکل جانے کے ارادہ کا محض ایک مبہم سا اعلان ہی کر دے تو اقوام متحدہ کی ساری قرار دادیں نظرانداز کر دی جائیں گی۔ بش نے صدام کے خلاف 27 اقوام پر مشتمل جو اتحاد بنایا

ہے اس میں مغربی و ایشیائی قوموں کے ساتھ ساتھ عرب قومیں بھی شامل ہیں اور یہ اتحاد اقوام متحدہ کی طرف سے دیئے گئے مینڈیٹ سے لیس ہے۔ ان فوجوں میں سے اکیلے برطانیہ نے 34،000 فوج بھیجی ہے۔ یہ فوجیوں کی سب سے بڑی تعداد ہے جو دوسری جنگ عظیم کے بعد سے اب تک سمندر پار روانہ کی گئی ہے۔ جلد فتح یابی کے زیادہ پر امید منصوبوں کا انحصار اس بات پر ہوتا ہے کہ جنگ کس شدت و تیزی کے ساتھ لڑی گئی یہ جنگ کا سب سے کریہہ منظر ہوتا ہے۔ اس لئے کسی قوم کو جو کم از کم جمہوری ہونے کا دعویٰ کرتی ہو، واضح طور پر علم ہونا چاہئے کہ وہ کس مقصد کے لئے مصروف پیکار ہے۔

ہابز کے بقول جنگ ایک ایسی حالت کا نام ہے جس میں خواہ ہنگامہ کارزار برپا نہ ہو، تاہم لوگوں کو مرعوب رکھنے والی مشترک قوت ناپید ہو، مشرق وسطیٰ میں نوآبادیاتی نظام کے خاتمہ کے بعد کوئی مشترک قوت نہیں رہی تھی۔ موجودہ محاذ آزادی کا 2 اگست کو کویت پر عراقی یلغار سے ہوا۔ بیرونی دنیا ایک ایسے موڑ پر پہنچ گئی جہاں اسے عراقی جارحیت کو ایک مقامی جھگڑا قرار دے کر 1945 کے بعد سے کی گئی دیگر جارحیتوں کی طرح نظرانداز کرنے یا ہابز کی مشترکہ قوت کا اس عالمی ادارہ کے ذریعہ مظاہرہ کرنے میں سے کسی ایک کا انتخاب کرنا تھا۔ صدام حسین نے ایک امن پسند چھوٹی سی آزاد ریاست پر دھاوا بول کر جس جارحیت کا ارتکاب کیا ہے اس کا جواب اقوام متحدہ ہی دے سکتی ہے، وہی کویت کی آزادی کو بحال کرانے اور آئندہ کے لئے ایسے اقدام کی روک تھام کرنے کی پوزیشن میں ہے۔

عراق کو کویت سے انخلاء پر مجبور کرنے کا فیصلہ سے عالم عرب اور اس سے ماورا تقریباً ہر جگہ اتفاق رائے کا اظہار کیا گیا۔ ان قوموں نے خود بھی جو مشرق وسطیٰ میں امریکہ مداخلت کی مخالف ہیں اور اسرائیل کے ساتھ ہر قسم کے اتحاد کو ناپسند کرتی ہیں یہی خواہش ظاہر کی کہ صدام کو کویت سے نکل جانا چاہئے۔ سلامتی کونسل نے بڑی باریک بینی کے ساتھ یکے بعد دیگرے 12 قراردادیں منظور کیں جن میں عراق کی واپسی اور کویت کی جائز قانونی حکومت کی بحالی کے علاوہ عراق پر اقتصادی پابندیاں لگانے اور اسے ریاستوں نیز افراد کو معاوضہ کی ادائیگی کا ذمہ دار ٹھہرانے کو کہا گیا۔ پھر نومبر میں 7 ہفتوں کی ڈیڈلائن مقرر کر دی گئی اور کثیر

القومی کولیشن کو اختیار دیا گیا کہ وہ 15 جنوری کے بعد مذکورہ قرارداد پر عمل درآمد کے لئے طاقت استعمال کر سکتی ہے۔

صدام حسین، اس قسم کے بیرونی دباؤ کو ہمیشہ پائے حقارت سے ٹھکراتے آئے ہیں۔ انہوں نے محض موجودہ معاملہ میں ایسا نہیں کیا۔ 1979 میں اقتدار پر مکمل قبضہ جمانے کے بعد سے ان کی یہی روش رہی ہے۔ کویت سے پہلے ایران ان کی جارحیت کا نشانہ بنا اور دونوں ہمسائے آٹھ سال تک برسرپیکار رہے۔ اس وقت عالمی امن کو جو خطرہ لاحق اور جنگ کا زبردست خطرہ پیدا ہوا ہے، اس سلسلہ براہ راست سلامتی کونسل کی اس ناکامی تک پہنچتا ہے کہ اس نے 1980ء میں عراق کی مذمت نہیں کی اور ایرانی افواج نیز عراقی کردوں کے خلاف صدام کے لڑاکا دستوں نے کیمیائی ہتھیار استعمال کر کے جو تباہی مچائی اس کی روک تھام کرنے اور عراق کو سزا دینے میں ناکام رہی۔ صدام نے لکھے ہوئے حروف کا ہمیشہ مذاق اڑایا ہے۔ مذاکرات اور گفت و شنید ان کی نگاہ میں بے وقعت ہیں۔ وہ معاملات کو بات چیت یا افہام و تفہیم کے ذریعے سلجھانے پر یقین نہیں رکھتے ان کے اس طرز عمل کی تازہ مثال اس سلوک میں ملتی ہے جو 13 جنوری کو اقوام متحدہ کے فاضل سیکرٹری جنرل مسٹر پیرز ڈی کوئیار کے ساتھ بغداد میں ملاقات کے دوران روا رکھا گیا۔

صدام نے ڈپلومیسی سے چشم پوشی کی ہے۔ انہیں قائل کرنے کی تمام کوششیں، یہاں تک کہ مفاہمت کی ایسی تجاویز جن میں انہیں جارحیت کا صلہ دینے کی پیش کش کی گئی تھی، ناکام ہو چکی ہیں۔ جنیوا میں امریکہ کے وزیر خارجہ جیمز بیکر کے ساتھ 6 گھنٹے کی ملاقات کے بعد عراق کے ایلچی نے اپنی فوجوں کی کویت سے واپسی کے امکان کو یکسر مسترد کر دیا۔ وہ کویت کا نام تک سننے پر تیار نہیں تھے۔ صدام نے اس آزاد ملک کو دنیا کے نقشہ سے مٹا دیا ہے اور ان کی فوج نیز خفیہ پولیس نے پوری ریاست کو خوف و ہراس کی بنجر سرزمین میں بدل دیا ہے۔

کہا جاتا ہے کہ پیرز ڈی کوئیار اپنے ساتھ ایسی تجاویز لائے تھے۔ اگر ان پر سمجھوتہ ہو جاتا تو نہ صرف صدام حسین کی لاج رہ جاتی بلکہ پوری انسانیت ایک ہولناک جنگ کے اثرات سے بچ جاتی۔ اقوام متحدہ کے سیکرٹری جنرل کی حیثیت میں وہ اس پوزیشن میں تھے کہ کویت

کے قبضہ کو فلسطینی مسئلہ سے منسلک کئے بغیر اس امر کی ضمانت دے سکتے کہ مشرق وسطیٰ کی بابت جو "امن کانفرنسیں" سالہا سال سے سلامتی کونسل کے ایجنڈے پر ہیں۔ وہ بیان اور اظہار مدعا کی بعض رکاوٹوں کے باعث معرض التوا میں پڑی ہوتی ہیں۔ تاہم عراق کے مکمل انخلاء کے بعد الفاظ میں مناسب ردوبدل کر کے ویسی کانفرنسوں کا انعقاد ہو سکتا ہے۔ علاقائی سلامتی کونسل کے طویل المیعار منصوبہ کے بارے میں اقوام متحدہ کے اپنے نظریات ہیں۔ صدام حسین یا ان کے ایلچیوں نے اس سے ہرگز دلچسپی ظاہر نہیں کی۔ انہوں نے واشگاف الفاظ میں اعلان کر دیا ہے کہ کویت ہرگز خالی نہیں کیا جائے گا"

عراق کی طرف سے اپنی قرار دادوں کے استرداد پر سلامتی کونسل کے پاس اس کے سوا کوئی چارہ نہیں رہ گیا تھا کہ یا تو وہ عراق کی ہٹ دھرمی کے آگے گردن جھکا دیتی یا اپنے حکم پر عمل درآمد کے لئے ذرائع تلاش کرتی، ان ذرائع میں اقتصادی پابندیاں اور فوجی ناکہ بندی شامل تھی۔ تاہم یہ اپروچ غلط ثابت ہوئی کہ اقتصادی پابندیوں سے صدام حسین کو ان کی سٹرٹیجی بدلنے پر مجبور کیا جا سکتا تھا۔ یہاں تک کہ ان پابندیوں کو تادیر جاری رکھنے کا مطالبہ حالیہ ہفتوں میں جنگ کے مخالفین کے لئے بھی بے چینی و بددلی کا سبب بن گیا۔ ان پابندیوں کا زیادہ سے زیادہ یہ نتیجہ نکلتا کہ عراق کی جنگی تیاریاں ماند پڑ جاتیں۔ چونکہ ان پابندیوں کو خود ان کے تجویز کنندگان نے جنگ کے متبادل صورت سمجھا، اس لئے یہ کوئی ٹھوس قدم ثابت نہیں ہوا۔ ویسے بھی اقتصادی پابندیوں سے سیاسی مقاصد حاصل نہیں کئے جا سکتے۔ کیوبا، رہوڈیشیا، جنوبی افریقہ اور پانامہ پر ایسی پابندیاں لگائی گئیں تو وہاں کی برسراقتدار حکومتوں کو ان سے تقویت پہنچی اور ان ملکوں کی معیشتوں میں استحکام پیدا ہو گیا۔ ممکن ہے عراق پر لگائی گئی پابندیاں سب سے سخت رہی ہوں تاہم جو قومیں پہلے ہی معاشی بدحالی کا شکار ہوں، وہ اپنے محبوب رہنماؤں کی پیروی کرنے میں ان کے قریب تر ہو جاتی ہیں۔ عراق میں یہی کچھ ہوا۔

ہمارے خیال میں یہ سوچنا سراسر غلط ہے کہ پابندیوں کے کامیاب نتائج مہینوں نہیں برسوں میں نکلتے ہیں۔ اس صورت میں صدام حسین کو اپنے ناقابل تسخیر ہونے کا یقین مزید پختہ ہو جاتا۔ نیز وہ اتحاد میں پھوٹ ڈالنے اور اقوام متحدہ کی قرار دادوں پر عمل درآمد کے عزم

پر شگاف ڈالنے کی جو کوششیں کر رہے ہیں وہ کامیاب ہو جاتیں۔ بعض مبصرین اس بات پر یقین رکھتے ہیں کہ پابندیاں واقعی بڑے پیمانہ پر اپنا اثر دکھا رہی تھیں جیسا کہ عراق سے ملنے والی شہادتوں سے ظاہر ہوا۔ ملک میں اشیائے صرف کی قلت پیدا ہو گئی تھی، وہ لوگ بھی جو درمیانے درجہ کی آسائشوں کے عادی ہیں یہ کہنے لگے تھے کہ اس طرح کی کمیابی صدام کی کویت سے رضاکارانہ واپسی کا سبب بن سکتی ہے۔ ان پابندیوں کو مزید جاری رکھنا، جنگ سے آنکھیں چرانے، صدام حسین کی جارحیت کے آگے ہتھیار ڈالنے اور بین الاقوامی انارکی کو، جس کا وہ ایک مجسم نشان ہیں بڑھاوا دینے کے مترادف ہوتا۔

جنگ کی وکالت کرنے والوں کی یہ دلیل بھی ایسے خوفناک فیصلہ کا جواز فراہم کرنے سے بری الذمہ نہیں ٹھہراتی کہ اقوام متحدہ نے محض اس امر کی اجازت دی تھی کہ آج گرین وچ مین ٹائم کے مطابق صبح کے 5 بجے کے بعد فوجی کارروائی کی جا سکتی ہے۔ تاہم یہ مینڈیٹ فوجی کارروائی کو ناگزیر نہیں ٹھہراتا، بشرطیکہ عراق اسرائیل پر حملہ میں پہل نہ کرے، صدام حسین کی طرف سے ایسے اقدام کی دھمکی دی جا چکی ہے، جوابی حملہ کا قطعی فیصلہ کرنا اتحادیوں کی مرضی پر منحصر ہو گا۔ ہر قوم کو خود سے یہ سوال کرنا چاہئے کہ آیا وہ جس مقصد کے لئے لڑنے جا رہی ہے وہ نصب العین واقعی اس کی فوجوں سے سروں کے نذرانہ کا متقاضی ہے۔ جواب دیتے وقت غیر متعلقہ چیزوں کو بالکل فراموش کر دینا چاہئے۔

برطانوی فوجیں اپنے علاقہ یا شہریوں کے دفاع کی خاطر لڑنے نہیں آئیں۔ کویت ایک چھوٹا سا ملک ہے جو برطانیہ سے دور دراز فاصلے پر واقع ہے۔ موجودہ بحران سے پہلے اکثر انگریزوں کو اس کے متعلق بہت کم معلومات حاصل کی تھیں۔ ایک دولت مند امیر کے زیر نگیں اس امن پسند امارت نے کبھی نمایاں ہونے کی خواہش نہیں کی۔ اس طرز عمل، اس کے بعض عرب ہمسایوں کے برعکس، ہرگز اتنا برا اور قابل ملامت نہیں تھا جو انہیں بلا بولنے پر اکساتا۔

یہ جنگ جمہوریت کے لئے بھی نہیں ہو گی۔ اتحادیوں کا منتہائے مقصود یہ ہے کہ کویت میں جہاں عرصہ دراز سے غیر آئینی بادشاہی نظام رائج ہے، وہاں کی جائز حکومت کو بحال کرایا

جائے۔ کویت میں پارلیمانی جمہوریت کا تجربہ کیا گیا۔ جس کے دوران ایک پارلیمنٹ منتخب کی گئی' تاہم رائے دہی کا حق صرف مردوں تک محدود تھا۔ عراق کی فوج کشی سے چند دن پہلے وہاں پارلیمنٹ کو توڑ دیا گیا اور پریس پر سخت سنسر لگا دیا تھا۔ مغرب کی شاید توقع ہے کہ اپنے تخت پر بحالی کے بعد امیر سیاسی اصلاحات پر توجہ دیں گے۔ ہمارے خیال میں ان پر ایسی اصلاحات ہرگز نہیں ٹھونسی جا سکیں گی۔

کویت میں اتحادیوں کے لئے ضمنی فتح مندی کی ایک یہ صورت ہو سکتی ہے کہ دنیا کے سب سے بڑے بددیانت اور خونخوار ر جابر فرمانرواؤں میں سے ایک فرمانروا (صدام حسین) کا تختہ الٹ دیا جائے۔ گویہ اقدام بہت کار آمد ثابت ہو سکتا ہے' تاہم اتحادیوں کے محدود مقاصد جنگ میں یہ مقصد شامل نہیں۔ اقوام متحدہ کی طرف سے دیئے گئے اختیار کے تحت وہ صرف عراق کی جارحیت کو ختم کر کے اور کویت کی یکجہتی بحال کرنے کے مجاز ہیں۔ اگرچہ جغرافیائی لحاظ سے جنگ کرنا اور اندرونی اہداف کو نشانہ بنانا خاصا مشکل ہو گا' تاہم فوجی نقطہ نظر سے یہ سب کچھ کرنا ناگزیر ہو گیا ہے۔ اگر عراق نے کیمیائی یا جراثیمی ہتھیاروں کا سہارا لیا تو صدام اپنے طرز عمل میں آخری حد سے گزر جائیں گے اور پھر انہیں ہر قیمت پر شکست دینا لازمی ہو جائے گا۔ اگر انہوں نے مفتوحہ کویت میں لوٹ مار' ظلم و تشدد اور شہریوں کے قتل و خونریزی کی اجازت دی ہے تو اس کا انتقام لینا سول آبادی کا کام ہو گا۔ اس کے جواب میں فوجی محاذ آرائی کا کوئی جواز نہیں۔

یہ جنگ یقیناً دولت' صرف اور صرف دولت نیز تیل سے جنم لینے والی طاقت کے حوالہ سے لڑی جا رہی ہے۔ کویت کی دولتمندی ہی عراق کے حملہ کا سبب بنی۔ یہ ایک ایسی کلید ہے جس سے صدام حسین کی عربوں پر غلبہ پانے کی دیرینہ خواہش پوری ہو سکتی ہے۔ تاہم خلیج میں جس چیز کو زیادہ خطرہ لاحق ہے وہ تیل نہیں' یہ چیز عراق کے لئے اس وقت تک کار آمد نہیں جب تک منڈی میں نہ پہنچ جائے۔ اصل میں وہ طریقہ کار اور لائحہ عمل معرض خطر میں پڑ گیا ہے جس کے مطابق ریاستوں کے باہمی مسائل اور جھگڑوں کا تصفیہ ڈپلومیسی کے ذریعے کیا جاتا ہے۔ لیکن عراق نے ایسی کسی چارہ جوئی کا امکان باقی نہیں چھوڑا۔

صدام حسین نے 2 اگست سے پیشتر ہی مشرق وسطیٰ میں طاقت کے توازن کے لئے خطرہ پیدا کر دیا اور ایسی خوفناک فوجی صلاحیت حاصل کر لی تھی کہ مغربی دنیا اسے اس قدر طاقتور سمجھنے لگی کہ اب اس کنٹرول کرنا ممکن نہیں رہا۔ اگر عراق کو نکیل نہ دی گئی تو کوئی بھی عرب مملکت اس کی توسیع پسندی کے آگے نہیں ٹھہر سکے گی اور اس کے کسی ہمسایہ میں عراقی فوج کے مقابلہ کی ہمت نہیں رہے گی' اگر مغرب ان کے دفاع میں ناکام ہو گیا تو صدام حسین کے سپاہیوں کو بیرک سے باہر نکلنے کی ضرورت بھی نہیں پڑے گی' خالی دھمکیوں اور گیدڑ بھبکیوں سے اپنا الو سیدھا کر لیا کریں گے۔ اتنی بھاری فوج کے بل پر بلیک میلنگ کر کے عراق مشرق وسطیٰ کی ایک اتنی عظیم الشان سلطنت بن جائے گا کہ اس سے علاقہ کے اچھے اور برے سبھی ملکوں کی سلامتی خطرہ میں پڑ جائے گی۔

صدام ڈپلومیسی سے کام لیتے تو بلیک میلنگ کے ذریعے اپنی جائز و نامعقول بہت سی باتیں مغربی طاقتوں سے منوا سکتے تھے۔ مثال کے طور پر وہ مغربی دنیا کو اسرائیل کا ساتھ چھوڑنے کا مطالبہ کرتے یا ان سے حساس ایٹمی ہتھیار اور ٹیکنالوجی مانگتے تو ان کی کوئی ایک مراد ضرور بر آتی۔ اگر آج انہیں چیلنج نہ کیا جاتا' چند سال بعدل لڑنا پڑتا ممکن ہے اس میں زیادہ جانیں ہلاک ہوتیں اور مغرب کو وہ مقاصد حاصل نہ ہوتے جن کے حصول کی اس وقت زیادہ امید ہے۔ ہتھیاروں کی فروخت کا سیاہ کاروبار کرنے والے کسی اخلاق اور ضابطہ کے پابند نہیں ہیں۔ وہ عراق کو ہتھیاروں کی کھیپ فراہم کرتے رہتے اور ایک دن ریاض و تل ابیب کے ساتھ ساتھ لندن اور واشنگٹن بھی اس کے روایتی کیمیائی ہتھیاروں اور ایٹمی میزائلوں کی زد میں ہوتے۔

پس اخلاق اور ذاتی مفاد دونوں کا تقاضا تھا۔ کہ عراق کے خلاف جلد جوابی کارروائی کی جاتی۔ جیسا کہ اقوام متحدہ کے چارٹر میں کہا گیا ہے کہ "یہ آئندہ نسلوں کو جنگ کی ہولناکیوں اور تباہ کاریوں سے بچانے کا عہد نامہ ہے۔" اقوام متحدہ کے سینئر ترین ممبران جو ٹھوس وسائل کے مالک ہیں اور دنیا میں قیام امن کے عزم میں آزاد و خود مختار ہیں' یہ فرض عائد ہوتا ہے کہ اس نمایاں خطرہ کے خلاف اجتماعی طور پر اقدام کریں اور عالمی ادارہ کے حکم پر

عمل در آمد کو یقینی بنائیں۔

مشرقی یورپ میں کمیونزم کی ناکامی اور روس کی قوت میں اضمحلال کے ساتھ ہی سرد جنگ کا خاتمہ ہو گیا۔ یہ چیز دنیا کو امن کی ضمانت دینے کے معاملہ میں خوش آئند نہیں۔ مشرقی یورپ میں ایک طرف روس کے عطا کردہ کیمونسٹ نظریات بے معنی ہو گئے ہیں دوسری طرف وہاں جمہوری اداروں کے مستحکم ہونے میں کچھ وقت لگے گا۔ ان کی سلامتی کے لئے خطرات پیدا ہو گئے ہیں۔ مزید براں سوپر طاقتوں کے مابین طاقتوں کا توازن تنازعات کو پھیلانے کی بجائے ان کا سدباب کرتا تھا۔ سوپر طاقتوں کی مداخلت کا خوف اور ان کی طرف سے عائد کردہ پابندیاں چھوٹے ملکوں کو غاصبانہ و جارحانہ کارروائیوں سے باز رکھتی ہیں۔ اس توازن کے ختم ہو جانے سے یہ خطرہ پیدا ہو گیا ہے کہ توسیع پسند حکومتیں اپنے پڑوسیوں پر حملہ آور ہونگی اور ان کی روک تھام کرنے والا کوئی نہیں ہو گا۔

عراق کے خلاف جو اتحاد بنایا گیا ہے وہ ایک بین الاقوامی مینڈیٹ کو اجتماعی طور پر نافذ کرنے کی ایک کوشش ہے۔ اس تجربہ کو خلیج میں لازماً کامیاب بنانا ہو گا۔ بصورت دیگر ریاستوں کو جنگل کے قانون کے خلاف اس قدر متحد اور مسلح ہونا پڑے گا جتنا ان کے بس میں ہو۔ اس جنگ کا مقصد صرف مشرق وسطیٰ میں امن قائم کرنا نہیں، صرف اس دور کے لئے امن کی کوششیں نہیں کی جا رہی ہیں، بلکہ ان کا منتہائے مقصود ساری دنیا کے لئے اور آنے والی نسلوں کے لئے امن کا سایہ فراہم کرنا ہے۔ برطانوی سپاہیوں سے اس عظیم مقصد کے لے اپنی جانیں خطرہ میں ڈالنے کی توقع بجا طور پر کی جا رہی ہے۔

ہیرالڈ ٹریبون۔ لندن

غلط فہمیوں کی دیوار چین جسے ڈپلومیسی بھی نہیں گرا سکی (ڈیوڈ ہوف مین۔ واشنگٹن)

خلیج میں جنگ کا ناقوس بج گیا اور انسانی سروں کی فصل کی کٹائی شروع ہو گئی کیونکہ دنیا کے دو بڑے آدمیوں کے درمیان ان کی تہذیب و ثقافت اور عالمی احساسات کے حوالے سے

جو اختلافات پائے جاتے ہیں ڈپلومیسی کا ناخن تدبیر انہیں دور نہیں کر سکا۔ جنگ کے دیوتا نے اپنا کھیل اس لئے شروع کر دیا کہ صدام حسین اور جارج بش دونوں ایک ایسی راہ پر چل پڑے جہاں سے واپسی ان کے بس میں نہ رہی۔

امریکہ کی تاریخ بتاتی ہے کہ ڈپلومیسی نے بہت سے مواقع پر جنگ کا راستہ روک کر اور تنازعات کو مصالحت کے ذریعے حل کرا کے انسانیت کو قتل و خونریزی سے بچا لیا۔ سوپر طاقتیں جنگ عظیم کے بعد 45 برس تک ڈپلومیسی کے بل پر ایک دوسرے کو تباہ کرنے سے باز رہیں۔ اس کی بدولت کیوبا میں میزائلوں کے بحران کو حل کیا گیا اور مصر و اسرائیل کو کیمپ ڈیوڈ میں سمجھوتہ کی میز پر لا بٹھایا گیا۔

بلاشبہ بہت سے تنازعے سنگینی کے اس درجہ پر پہنچ جاتے ہیں جہاں ڈپلومیسی کا ناخن تدبیر انہیں سلجھانے میں کامیاب نہیں ہو پاتا۔ البتہ زیر بحث معاملہ میں مسٹر صدام حسین اور مسٹر بش نے آمنے سامنے بیٹھ کر باہمی اختلافات ختم کرنے کی کوئی سنجیدہ کوشش کی ہی نہیں۔ اس کے برعکس امریکی انتظامیہ کے بہت سے اعلیٰ حکام اور عرب دنیا سے واقفیت رکھنے والے تجزیہ نگاروں کا کہنا ہے کہ یہ دونوں شخص ساڑھے پانچ ماہ تک ایک دوسرے کے گرد گھیرا ڈالنے کی کوششوں میں مصروف رہے۔ مسٹر بش نے کویت پر حملہ کے فوراً بعد صدام پر روز افزوں دباؤ ڈالنا شروع کر دیا۔ یہاں تک کہ اس کے لئے من مانی شرائط کے آگے گردن جھکانے یا میدانی جنگ میں قسمت آزمانے کے سوا کوئی چارہ نہیں رہا دوسری طرف عراقی لیڈر نے بھی جو کسی زمانہ میں نظریہ عملیت کے پیروکار (بن کے دوسروں کے کام آنے والا) سمجھے جاتے تھے اور خود کو حالات کے مطابق ڈھال سکتے تھے، اس مسئلہ میں کسی لچک کا مظاہرہ نہیں کیا اور کویت خالی کرنے سے صاف انکار کر کے بنیادی سوال کے حل کی راہ مسدود کر دی۔ چنانچہ ان تجزیہ نگاروں کی یہ بات دل کو لگتی ہے کہ دونوں طرف سے ڈپلومیسی سے کام نہیں لیا گیا۔

مسٹر بش اور ان کے وزیر خارجہ جیمز بیکر مسٹر صدام حسین کے گرد گھیرا ڈالنے کے لئے ایک بین الاقوامی اتحاد قائم کرنے میں بہت دور تک چلے گئے اور عراقی صدر نے اس اتحاد کو

توڑنے کے لئے غیر ملکیوں کو یرغمال بنا کر بطور ڈھال استعمال کرنے کی دھمکی دی اور سفارتکاروں کے لئے بغداد میں منتقل ہونے کا حکم صادر کر دیا۔ تاہم دونوں اقدامات بیکار ثابت ہوئے۔ آخر میں، جیسا کہ مسٹر بیکر نے گزشتہ ہفتے جنیوا میں عراقی وزیر خارجہ طارق عزیز کے ساتھ ملاقات کے دوران انکشاف کیا فریقین کے درمیان غلط فہمیوں کا ایک سمندر حائل تھا۔

صدام حسین اس بارے میں مسلسل غلط اندازے لگاتے رہے کہ امریکہ ان کے خلاف طاقت کے استعمال کا پختہ ارادہ کر چکا ہے۔ کویت کی فتح کے بعد امریکہ نے جس تیزی کے ساتھ بھاری تعداد میں اپنی فوجیں خلیج میں پہنچائیں، صدام حسین ان کے متعلق بھی صحیح رائے قائم نہیں کر سکے۔

مسٹر بش صدام حسین کے ان عزائم کا، حملہ سے پہلے تک اندازہ نہیں لگا سکے کہ وہ پورے کویت پر قبضہ کر لیں گے۔ امریکی لیڈر یہ بات سمجھنے میں بھی ناکام رہے کہ ان کے شدید ذاتی حملوں سے عراقی رہنما پر کیا اثرات مرتب ہوں گے۔ اور بعض تجزیہ نگاروں کے مطابق مسٹر بش اس امر کا ادراک نہ کر پائے کہ وہ خود کو اور عراق کے صدر کو ایسی انتہا کی طرف کھینچ رہے ہیں جہاں سے بچ نکلنا ممکن نہیں رہے گا۔

فواد عجمی جو کہ جانز ہاپکنز اسکول آف ایڈوانسڈ انٹرنیشنل سٹڈیز میں پروفیسر ہیں کے خیال میں دونوں طرف ان بھیانک غلط فہمیوں نے ڈپلومیسی اور تنازعہ کے حل کی بابت روایتی تصور کرنا ممکن بنا دیا تھا۔ انہوں نے صدام حسین کے متعلق رائے ظاہر کی کہ وہ ایک ایسا شخص ہے جو جنگ سے خوش ہوتا ہے۔ وہ جدال و قتال کی طرف دوڑ کر آتا ہے اور اس سے لطف اندوز ہوتا ہے۔ اس کے ساتھ مصالحت کے لئے ڈپلومیسی کی کونسی گنجائش تھی۔ میرے خیال میں کوئی گنجائش نہیں تھی۔

مشرق وسطیٰ میں متعین ایک مغربی سفارتکار نے کہا کہ اس بحران سے بہت سی چیزیں ظاہر ہوئیں۔ ایک یہ ہے کہ پارلیمانی ڈپلومیسی کی حدود کا پردہ فاش ہو گیا۔

جب ایک بار اقوام متحدہ نے صدام حسین کے لئے ڈیڈ لائن مقرر کر دی تھی تو آپ کوئی

پالیسی شروع یا اس پر عملدرآمد نہیں کر سکتے تھے۔ اب صرف اس کی توثیق کرنے اور سزا دینے کی پوزیشن میں رہ گئے تھے۔ اقوام متحدہ سے صرف اتنا بن پڑا کہ اس نے صدام حسین کے خلاف ایک فرد جرم عائد کر کے یہ تاکیدی حکم نامہ جاری کر دیا کہ وہ 15 جنوری سے پیشتر فلاں فلاں بجا لائے، ورنہ مقررہ وقت گزرنے کے بعد فوجی سپہ سالاروں کی ایک ٹیم اسے حراست میں لینے پہنچ جائے گی۔ کسی گتھی سلجھانے کا یہ طریقہ ہرگز ڈپلومیٹک نہیں کہلا سکتا۔ ایسی صورت میں نارمل ڈپلومیسی سے کام لینے کی کوئی گنجائش باقی نہیں رہی تھی۔

اصل بات یہ ہے کہ صدر نے اپنے سامنے محض یہ ایک مقصد رکھ لیا تھا کہ صدام حسین کو ان طاقتوں کا احساس دلا کر مرعوب کیا جائے جو ان کے خلاف متحدہ طور پر سرگرم عمل ہو چکی تھیں۔ صحیح نقطہ نظر سے دیکھا جائے تو ان کا مقصد صرف یہ ایک اعلان کرنا تھا کہ صدام کے ساتھ کوئی رعایت نہیں برتی جائے گی، کسی نرمی سے کام نہیں لیا جائے انہیں اپنی انا کو بچانے کا کوئی موقع نہیں دیا جائے گا۔ یعنی اس کے سوا کوئی بات نہیں کی جائے گی کہ وہ اپنے خلاف سرگرم عمل فوجی اور سیاسی قوت کا وزن محسوس کرتے ہوئے اقوام متحدہ کے آگے سر تسلیم خم کر دیں۔ ظاہر ہے ایسی صورت حال میں کسی بامقصد بات چیت کا کوئی امکان باقی نہیں رہا تھا۔

مسٹر عجمی نے کہا ڈپلومیٹک ناکامی کے اسباب یہاں تک پھیلے ہوئے ہیں کہ مسٹر صدام اور خود مسٹر بش بھی عراقی یلغار کے مضمرات کو سمجھنے میں ناکام رہے۔ شاید عراقیوں نے باور کر لیا تھا کہ کویت کی فتح ایک نئے نظام کا پیش خیمہ ثابت ہو گی۔ صدام حسین سمجھتا تھا کہ یہ فتح اس جدوجہد کا جائز صلہ ہے جو انہوں نے انقلاب ایران کی راہ روکنے کے لئے کی تھی۔ ان کے نزدیک یہ کوئی بھارتی قیمت نہیں جو اپنی محنت کے عوض انہوں نے وصول کی۔ دراصل دنیا نے انہیں چکر میں ڈال دیا تھا۔ بہت سے لوگ معاملہ کو اس پہلو سے دیکھتے ہیں کہ "وہ علاقے میں طاقت و قوت کا نیا ستون بننے کے خواہشمند ہیں"۔

گفتگو جاری رکھتے ہوئے انہوں نے مزید کہا "صدام نے سوچا ہو گا اس اقدام کو ایک نئے نظام کے طور پر پیش کیا جائے گا اور امریکی اس کے ساتھ سمجھوتہ کر لیں گے۔ عراقیوں

کے ذہن میں یہ خیال تک نہیں آیا کہ کویت پر حملہ ان کے خلاف امریکیوں کی اتنے وسیع پیمانہ پر مداخلت کا جائز بہانہ بن جائے گی۔ جمہوریت کیسے کام کرتی ہے ؟ اس بارے میں صدام حسین کی معلومات فروعی نوعیت کی ہیں۔ اس چیز نے ڈپلومیسی کی طرف جانے والی ہر راہ مسدود کر دی۔ مطلق العنان اور مستبد حکمرانوں نے جمہوریت کو ہمیشہ ایک بگڑا ہوا نامرد معاشرہ سمجھا ہے۔" اس نے مزید کہا۔

صدام حسین ایک مردانہ وار لڑنے والا سپاہی ہے جو امریکہ کو ایک "ناتواں" قوم سمجھتا ہے۔ ایک صدام حسین کا کیا ذکر ہے۔ دنیا کے تمام عظیم جابر اور مطلق العنان فرماں رواؤں نے جمہوریت کی ثابت قدمی اور ست رفتاری کو کبھی پسندیدگی واستحسان کی نظر سے نہیں دیکھا۔

بش انتظامیہ کی نگاہوں میں کویت پر عراقی یلغار ایسا واضح جرم ہے جس پر کوئی سمجھوتہ تو کجا، یہ بحث بھی نہیں کی جا سکتی کہ وہ محض دنیائے عرب کا داخلی مسئلہ ہے۔ مسٹر بش پہلے ہی اس نتیجہ پر پہنچ چکے تھے کہ صدام حسین صرف طاقت کی زبان سمجھتے ہیں۔ اس لئے انہوں نے عراقی لیڈروں کو مخاطب کرنے کے لئے وہی زبان استعمال کی۔

بش انتظامیہ کے ایک سینیئر افسر نے، جس کا بحران کی پالیسی مرتب کرنے میں بڑا دخل رہا، بتایا کہ ان کا سارا اندازہ باتوں پر مبنی تھا کہ وہ کون ہے ؟ کہاں سے آیا ہے ؟ یہ اندازہ اس شخص کے بارے میں لگایا جا رہا تھا جس نے طاقت کا مظاہرہ کر کے اپنے پڑوسی کو ہڑپ کر لیا تھا۔ آخر میں نتیجہ اخذ کیا گیا کہ طاقت کی زبان ہی وہ واحد زبان ہے جسے وہ شخص بخوبی سمجھتا ہے اس لئے اس کے ساتھ اسی زبان میں گفتگو کی جائے۔ اس نے مزید کہا کہ اگرچہ بغداد سے ہمیں متعدد اشارے دیئے گئے تاہم ایسا کوئی عندیہ نہیں ملا جو یہ ظاہر کرتا کہ صدام حسین کو اس حقیقت کا احساس ہو گیا ہے کہ وہ کویت پر اپنا تسلط برقرار نہیں رکھ سکیں گے۔ ہمیں ان کے رویہ میں ایک بار بھی لچک محسوس نہیں ہوئی۔

مسٹر عجمی کے خیال میں یہ جنگ اسی وقت ناگزیر ہو گئی تھی جب صدر بش نے کھل کر کہہ دیا تھا کہ ہم "یہ قبضہ باقی نہیں رہنے دیں گے "۔ اس نے مزید کہا۔ بش نے ذاتی حملے کر کے، جیسا کہ انہیں ہٹلر سے تشبیہ دی گئی، مفاہمت کے دروازے از خود بند کر دیئے گئے تھے۔

اگر بقول ان کے اس ننھے ہٹلر کے پاس ایک بار بھی چلے جاتے تو شاید معاملہ ٹھیک ہو جاتا۔ انہوں نے صدام کو دعوت مبارزت دے دی۔ کانگرس سے خطاب کرتے ہوئے جب انہوں نے یہ اعلان کیا کہ "یہ جارحیت قائم نہیں رہے گی"۔ تو کسی لاف زنی کا اظہار نہیں کیا جاتا تھا۔ ایسے موقعوں پر ایسی ہی زبان استعمال کی جاتی ہے۔"

گارڈین۔لندن

17-11-91

عظیم مغالطوں پر مبنی جنگ

از: رچرڈ فاک

پروفیسر انٹرنیشنل لاء پرنس یونیورسٹی، امریکہ

امن پسند دنیا بڑی طاقتوں کے مابین پوری سرد جنگ کے دوران کئی عشروں تک اقوام متحدہ پر طاری اس لقوہ پر کف پر افسوس ملتی رہی جس کے باعث عالمی تنازعات کے موقع پر اس نے ایک تماشائی کی حیثیت اختیار کئے رکھی۔ تاہم سرد جنگ کے خاتمہ سے اس کے فالج زدہ بدن میں نئی جان پڑ گئی ہے۔

خلیج کے بحران میں اقوام متحدہ کے کردار کو دیکھتے ہوئے ایسا محسوس ہوتا ہے کہ اسے اپنی نئی پوزیشن مستحکم کرنے کا پورا پورا موقع مل گیا ہے۔ اقوام متحدہ کی پوری تاریخ میں یہ پہلا موقع ہے کہ ایک جارح ملک اپنے پڑوس میں واقع ایک چھوٹی سی ریاست پر حملہ آور ہوا اور اقوام متحدہ کے رکن ملک کی آزادی و خود مختاری کو پامال کر کے اسے اپنے اندر ضم کر لیا۔ فاتح ملک کے مقبوضہ ریاست میں انسانیت کے خلاف پے در پے جرائم کا ارتکاب بھی کیا۔

اندریں حالات مشرق و مغرب کی تخفیف شدہ کشمکش میں یہ امر چنداں حیرت و استعجاب کے لائق نہیں کہ اقوام متحدہ نے ایک ٹھوس اور طاقت سے بھرپور قدم اٹھایا ہے کویت کے خلاف عراق کی جارحیت سے تیل کی عالمی مارکیٹ کا تحفظ اور قیمتوں کا نظام بھی خطرے میں پڑ گیا ہے۔ جس کے ساتھ بہت بڑے بڑے سیاسی مفادات وابستہ ہیں۔ تاہم اقوام متحدہ کی طرف سے سخت ردعمل کا یہ مطلب نہیں کہ اس نے امریکہ کو جنگ کرنے کا اختیار دے دیا

ہے یا امریکہ کو پوری طرح کھیل کھیلنے کی چھٹی دے دی گئی ہے۔ جیسا کہ اس کی طرف سے تاثر دیا جا رہا ہے۔ بہتر ہوتا کہ جنگ کی اجازت نہ دی جاتی۔ سلامتی کونسل کو اس بحران میں شروع سے آخر تک ایک نگران کا کردار ادا کرنا چاہئے تھا۔

یہ یقیناً درست ہے کہ اقوام متحدہ نے امریکہ کو اس بحران میں محدود مداخلت کا مینڈیٹ دیا ہے۔ صدر بش بجا طور پر کہہ سکتے ہیں کہ سلامتی کونسل نے ان بارہ قراردادوں کی توثیق کر دی ہے جن میں کویت پر چڑھائی کی مذمت کی گئی، عراق پر اقتصادی پابندیاں لگائی گئیں تاکہ اس کی درآمدی و برآمدی تجارت مکمل طور پر تباہ ہو جائے، نیز صدام حسین کو قرارداد پر عمل درآمد کے لئے مجبور کرنے کی خاطر طاقت کے استعمال کا اختیار دیا گیا ہے۔

تاہم اقوام متحدہ کی طرف سے دئے گئے اس مینڈیٹ کے متعلق کئی اہم سوال ذہنوں میں کلبلا رہے ہیں۔ کیا اقوام متحدہ اپنے چارٹر اور امن و انصاف کے ان مقاصد کی تکمیل میں واقعی مخلص ہے، جن کے لئے اس کی تشکیل عمل میں آئی تھی۔ اس تشویش کے علاوہ یہ پریشان کن تاثر بھی پایا جاتا ہے کہ اقوام متحدہ حقیقتاً امریکی خارجہ پالیسی کی آلہ کار بن کر رہ گئی ہے۔ اس امر سے قطع نظر کہ خلیجی بحران کا اونٹ کس کروٹ بیٹھتا ہے، اس قضیہ میں اقوام متحدہ نے اپنی ساکھ کو پہلے ہی مشکوک بنا لیا ہے۔

اس سے بڑھ کر اہم سوال لامحدود طاقت کے استعمال کی اجازت دینے کا ہے۔ عراق نے اب تک کویت خالی نہیں کیا، قرارداد نمبر 678 کی رو سے دئے گئے مینڈیٹ میں وقت کا تعین تو کیا گیا ہے، تباہ کن وسائل کس حد تک استعمال کئے جا سکتے ہیں؟ اس کا تعین نہیں کیا گیا۔ مزید برآں مینڈیٹ کو اقوام متحدہ کے متعلقہ شعبوں کی طرف سے جواب طلبی یا رہنمائی کے ساتھ مربوط بھی نہیں کیا گیا۔ چنانچہ اس قرارداد سے ہر جگہ یہ مراد لی جا رہی ہے کہ امریکہ کو ڈیڈ لائن گذرنے کے بعد من مانی کرنے کی اجازت دے دی گئی ہے۔ حقیقت میں جنگ چھیڑنے کا یہ اجازت نامہ اقوام متحدہ کے اس بنیادی مقصد سے سراسر متصادم ہے کہ وہ آئندہ نسلوں کو جنگ کی تباہ کاریوں سے بچائے گی۔

اس گمراہ کن مقصد اور کردار کی پوری وسعت کا اندازہ اس وقت ہوا جب 15 جنوری کی

تاریخ سر پر پہنچ گئی۔ ہر ایک کی توجہ اس بات پر مرکوز ہو گئی کہ واشنگٹن اور بغداد ایک دوسرے پر کس طرح اثر انداز ہوتے ہیں۔ اس کے ساتھ ساتھ یورپی برادری خصوصاً فرانس نے معاملہ کو خلط ملط کرنے والا ضمنی ڈراما شروع کر دیا۔ حقیقت یہ ہے کہ ایک عامل (FACTOR) کی حیثیت سے اس عالمی ادارے کا وجود عنقا ہو گیا ہے۔ اگر اقوام متحدہ کو صحیح معنوں میں احساس ذمہ داری ہوتا تو اس سے یہ توقع کرنا بے جا نہیں تھا کہ سلامتی کونسل مسلسل سیشن میں رہتی، صورت حال پر کڑی نظر رکھی جاتی اور معاملہ کے انتہا پر پہنچنے سے قبل سیکرٹری جنرل اس کا کوئی سفارتی حل تلاش کرتے۔ افسوس ہے وہاں ایسی کوئی سرگرمی دیکھنے میں نہیں آ رہی۔ بڑی طاقتوں کو ڈر ہے کہ سلامتی کونسل کا بار بار اجلاس بلانے اور مسئلہ پر بحث کرنے سے عمومی اتفاق رائے میں رخنے نہ پڑ جائیں۔ سیکرٹری جنرل منظر سے بالکل ہی غائب ہو گئے۔

کسی بحران سے نمٹنے کے سلسلہ میں اقوام متحدہ کی مشکلات بڑی عمیق ہیں۔ چارٹر کے آرٹیکل 33 کے تحت ممبر ریاستوں پر یہ فرض عائد ہوتا ہے کہ وہ ایسے بین الاقوامی تنازعہ کا حل جس میں خونی تصادم کا خطرہ ہو، مذاکرات کے ذریعے تلاش کریں۔ لفاظی کے زور پر گفت و شنید سے انکار کیا جا سکتا ہے۔ جیسا کہ برطانوی وزیر اعظم نے کہا ہے کہ نقب زن کے ساتھ کوئی مذاکرات نہیں کرتا۔ عقل و دانش کی میزان میں تولا جائے تو یہ استدلال انتہائی بودا لگتا ہے۔ اگر نقب زن پوری طرح مسلح ہو تو حالات سے قطع نظر اس کے ساتھ بات چیت سے انکار کرنا خود کو بے خبری کے عالم میں تباہ کرنے کے مترادف ہو گا۔ بہرحال ایک ایسے عالمی بحران کا موازنہ، جس سے بہت زیادہ پیچیدہ مسائل وابستہ اور کئی قوموں کے مفادات معرض خطر میں پڑے ہیں، کسی دیوانی جرم کے ساتھ نہیں کیا جا سکتا۔ اس سے زیادہ اہم بات یہ ہے کہ پرامن حل کی تلاش میں ناکامی سے پوری دنیا کا امن و سکون اور کروڑوں انسانوں کی فلاح و بہبود خطرے میں پڑ گئی ہے۔

چارٹر کے آرٹیکل 33 میں مذکورہ فرائض اور امن کی خاطر صدر بش کی تامل پر مبنی رضا مندی کے مابین پائے جانے والے فاصلہ کا پتہ اس امر سے چلتا ہے کہ ایک طرف انہوں نے عراق کو بات چیت کی پیش کش کی، دوسری طرف اپنے وزیر خارجہ جیمز بیکر کی جنیوا روانگی سے قبل ہی اعلان کر دیا یہ ملاقات اس فامولا کے تحت ہوں گے کہ:-

"نہ کوئی مذاکرات کئے جائیں گے نہ مصالحت ہوگی، نہ ہی کسی کو اپنی انانیت کے مجروح ہونے سے بچانے کی اجازت دی جائے گی۔ وہاں جارحیت کے عوض کوئی رعایت نہیں دی جائے گی۔"

اس فارمولا کو پرامن حل کی تلاش میں ایسا حکم نامہ قرار نہیں دیا جا سکتا۔ جیسا کہ آرٹیکل 33 کا تقاضا ہے پھر اقوام متحدہ کا یہ اقدام تو اور بھی زیادہ پریشانی کا موجب بنا کہ اس نے اقتصادی پابندیوں کے متبادل کو نظر انداز کرتے ہوئے طاقت کے استعمال کی اجازت بہت جلدی میں دے دی۔ علاوہ ازیں یہ بات یقین سے نہیں کہی جا سکتی کہ پابندیاں کامیابی سے ہمکنار ہو جاتیں، البتہ یہ کہنا قبل از وقت ہو گا کہ وہ ناکام ہو گئیں۔ کیونکہ شہادتوں سے ظاہر ہوا ہے کہ عراق ان پابندیوں سے بری طرح متاثر ہو رہا تھا۔ وہ ایک ایسا ملک ہے جس کی بقا کا انحصار ہی تیل کی برآمدات سے حاصل ہونے والے زرمبادلہ پر ہے۔

سی آئی اے کے ڈائریکٹر ولیم ویبسٹر نے جسے امریکی حکمت عملی کا نکتہ چین نہیں کہا جا سکتا، چند ہفتے پہلے کانگریس کے روبرو شہادت دیتے ہوئے اس امر کی توثیق کی کہ پابندیوں کے نتیجہ میں عراق کی برآمدات میں 97 فیصد اور درآمدات میں 90 فیصد کمی واقع ہوئی۔ حکومت کے سابق سربرآوردہ سول اور فوجی حکام نے اس عمومی رائے سے اتفاق کیا کہ پابندیاں حیرت انگیز طور پر موثر ثابت ہوئیں موقع پر موجود صحافیوں نے اس تاثر کی تائید کی عراق پر پابندیوں کا دباؤ روز بروز بڑھ رہا تھا۔ ان حقائق کی موجودگی میں اقوام متحدہ کے لئے یہ بات بڑی نازیبا لگتی ہے کہ اس نے مزید انتظار نہیں کیا۔ خواہ اسے کوئی ڈپلومیٹک چارہ کار نظر آ رہا تھا یا نہیں، اسے اتنی عجلت میں طاقت کے استعمال کا اختیار نہیں دینا چاہئے تھا۔

اس اہم قرارداد میں جس کی رو سے 15 جنوری کی ڈیڈ لائن مقرر کی گئی سنگین ٹیکنیکل غلطی سرزد ہو گئی کہ آرٹیکل 27 (3) کے مطابق اس نوع کے تنازعات کا فیصلہ کرنے کے لئے لازمی ہوتا ہے کہ سلامتی کونسل کے 15 میں سے نو ممبران مثبت ووٹ دیں اور سارے مستقل

ممبران اپنے ووٹوں سے فیصلہ کی توثیق کریں۔ زیر بحث قرارداد پر رائے شماری میں چین نے حصہ نہیں لیا تھا اس لئے ایک مستقل ممبر کی غیر حاضری میں کیا گیا فیصلہ قانون کی نظر میں درست نہیں۔

اس سلسلے میں جنگ کوریا کی ایک بودی سی نظیر پیش کی جاتی ہے۔ جب سلامتی کونسل نے ایک ایسے ہی معاملہ میں طاقت کے استعمال کی اجازت دی تو روس اس کے اجلاسوں سے مسلسل غیر حاضر رہا۔ اس وقت کم از کم ایک آئینی دلیل مل گئی تھی جس کی روشنی میں چارٹر میں ترمیم کردی گئی۔ اقوام متحدہ کے آئینی ڈھانچہ کی صریح خلاف ورزی کو عالمی ادارہ کے اندر پریس میں یقیناً چیلنج کیا جائے گا اور اس پر بحث ہوگی۔

اقوام متحدہ کی خاموشی کے عام طور پر یہ معنے لئے جا رہے ہیں کہ موجودہ صورتحال میں امریکہ کو اقوام متحدہ کی مشینری کے استعمال پر مکمل کنٹرول حاصل ہے جو اس ادارہ کی آزادانہ کارکردگی اور اس کے مستقبل کے لئے خوش آئند نہیں۔ کیونکہ اب امریکہ دنیا کی واحد سپر پاور اور اقوام متحدہ کی مالی مدد کرنے والا اہم ذریعہ رہ گیا ہے۔

پس واضح ہوا کہ زیر بحث معاملہ میں اقوام متحدہ کی طرف سے دی گئی اجازت مبنی بر انصاف نہیں۔ اس کے حق میں جو دلیل دی جاتی ہے وہ انتہائی کمزور ہے۔ جس سے اپنے چارٹر پر عملدرآمد کے بارے میں عالمی ادارہ کی بے بسی کا اظہار ہوتا ہے۔ دوسری طرف امریکہ کے اس دعویٰ کی قلعی بھی کھل گئی کہ خلیجی بحران کو حل کرنے کے لئے دھمکی اور طاقت کے استعمال کو منصفانہ طریقے پر جائز ٹھہرایا گیا تھا۔ بہرحال ہمیں درست پالیسی کے بارے میں سوچنا چاہئے۔ یہ قیاس کرنا درست نہیں کہ اقوام متحدہ نے جنگ کرنے کا جو مینڈیٹ دے دیا ہے لوگ اس کا احترام کریں گے۔

خلیجی بحران کے متعلق آخری فریب یہ دیا گیا کہ مشرق وسطیٰ کے مجموعی استحکام میں شراکت عراق کو رعایت دینے کے مترادف ہوگی۔

فلسطینیوں کے ساتھ انصاف کرنے کا تو کیا ذکر ہے' واشنگٹن نے ان کے مطالبات پر غور کے لئے امن کانفرنس کی تجویز کو صرف ایک لفظ "LINKAGE" (منسلک کرنا) کی بنا پر

مسترد کردیا۔ اس کا اصرار ہے کہ اس مسئلہ کو کویت کے قضیہ سے وابستہ نہیں کیا جا سکتا۔ ان کے خیال میں صدام حسین فلسطین کاز چیمپین بن گئے ہیں' اس لئے ان مطالبات کو تسلیم کرنا جارحیت کا صلہ دینے کے برابر ہوگا۔ یہ منطق عقل و فہم کے سراسر خلاف ہے۔ صدام کے ہاتھ میں فلسطینی کارڈ کے ہونے کی بڑی وجہ یہ ہے کہ مغرب نے اسرائیل فلسطین تنازعہ کی بابت سالہا سال سے غیر متوازن اپروچ کو سینے سے لگا رکھا ہے۔ درست ڈپلومیٹک انداز میں فلسطینی ریاست کی تخلیق کی طرف پیش قدمی ایک ایسے معاملہ کی جانب قدم اٹھانا ہوگا جو عرصہ دراز سے توجہ کا مستحق ہے۔

یہ استدلال ان عرب حکومتوں کے کام آسکتا ہے جو اس وقت عراق کے خلاف امریکی کولیشن میں شریک ہیں اور اس تنازعہ کے حل میں ممد ثابت ہو سکتا ہے جو گزشتہ چار عشروں سے اسرائیل سمیت علاقہ جملہ اقوام کے لئے ابتلاء مصائب اور خونریزی و غارت گری کا سبب بنا ہوا ہے۔

علاوہ ازیں کویت پر عراق کے غیر قانونی قبضہ کے بارے میں اقوام متحدہ کی کارروائی کو اس طرح متوازن بنایا جا سکتا ہے کہ اسرائیل نے 1967ء سے دریائے اردن کے مغربی کنارہ اور غزہ کی پٹی پر جو ناجائز تسلط جما رکھا ہے اسے ختم کرایا جائے نیز شام اور اسرائیل اپنے پڑوسی لبنان کے اقتدار اعلیٰ کو وقتاً فوقتاً جس بری طرح پامال کرتے رہتے ہیں اور وہاں کے عوام کا امن و سکون لوٹتے رہتے ہیں اس کا مستقل تدارک کیا جائے یہ علاقائی مسائل فوری بحث کا تقاضا کرتے ہیں۔ توقع کرنی چاہئے کہ اقوام متحدہ کویت کے مسئلہ کے ساتھ ساتھ معاملات پر بھی توجہ دے گی۔

اکانومسٹ۔لندن

19 تا 25 جنوری 1991ء

جب ہنگامہ کارزار برپا ہوا

کسی چیز کا ظہور پذیر ہو جانا ہی عجیب ترین واقعہ ہوتا ہے۔ جس زمانہ میں فوجی تیاریاں

رہی تھیں شروع سے آخر تک یہ محسوس ہوتا رہا کہ صدام حسین امریکہ کے خلاف ہرگز جنگ نہیں کریں گے۔ تاہم انہوں نے کمال بے نیازی سے میدان جنگ میں چھلانگ لگا دی۔ قیام امن کے لئے جو متعدد کوششیں کی گئیں وہ ناکامی پر منتج ہوئیں اور اس ہفتے اقوام متحدہ کی مقرر کردہ ڈیڈ لائن بھی گذر گئی۔ اب ایک طرف عراق پر بموں کی بارش ہو رہی ہے دوسری طرف ساری دنیا فتح حاصل کرنے کا پختہ عزم کر رہی ہے۔ لڑائی لڑنا فوجیوں کا کام ہے، تاہم سیاستدان محض تماشائی بن کر اس کے خاتمہ کا انتظار نہیں کر سکتے۔ وہ اس بات کو یقینی بنانا چاہتے ہیں کہ فوجی لحاظ سے حاصل ہونے والی فتح سیاسی لحاظ سے بھی کامرانی سمجھا جائے۔

ممکن ہے صدام حسین کو یقین ہو کہ جنگ میں کامیابی ان کے قدم چومے گی۔ شاید وہ یہ بات مانتے ہوں کہ انہیں ہار ہونے والی ہے۔ تاہم انہوں نے ایسی آگ میں کودنے کا ارادہ کر لیا ہے جس میں کودنا ان کے نزدیک باعث افتخار ہو گا۔ دونوں صورتوں میں نتیجہ یہ نکلے گا کہ یا تو ان کی موت واقع ہو جائے گی، جس کی زیادہ تر لوگ خواہش رکھتے ہیں یا وہ عالمی منظر سے ہٹ جائیں گے۔ ایک امکان یہ بھی ہے کہ شاید وہ کچھ عرصہ لڑنے کے بعد جنگ بند کر دیں اور اتحادیوں سے امن کی بھیک مانگنے لگیں۔ موجودہ حالات میں ان کی طرف سے ایسی حکمت عملی کا زیادہ خطرہ ہے۔

بہت سے عربوں کی طرح صدام حسین بھی جمال عبد الناصر کے بڑے مداح ہیں۔ وہی ناصر جس نے پے در پے فوجی شکستیں کھائیں اور زبردست شہرت پائی۔ ناصر کی فوج کو 1956ء کی معرکہ آرائی میں شکست فاش ہوئی تھی۔ لیکن فرانس اور برطانیہ کو ذلت و رسوائی کی کالک مل کر نہر سویز سے نکلنا پڑا۔ 1967 میں ایک بار پھر مصری سپاہ کو ہزیمت اٹھانا پڑی۔ اس دفعہ ناصر نے اپنے خلاف گہری صیہونی سازش کا پروپیگنڈہ کر کے اپنے اقتدار کو بچا لیا۔ صدام حسین نے بھی ایران کے خلاف لڑائی میں ایسی ہی جادوگری سے کام لیا۔ عراقی پروپیگنڈہ بازوں نے اس تعطل کو جو آٹھ سالہ جنگ کے خاتمہ کا سبب بنا شاندار فتح سے تعبیر کر کے صدام کی عظمت میں چار چاند لگا دئے۔

ممکن ہے صدام حسین کو ان مثالوں میں مشکلات کے باوجود اپنے زندہ بچ رہنے کا امکان

نظر آتا ہو۔ عالم عرب تو ان کی بس اس ایک ادا پر فریفتہ ہو گیا ہے کہ انہوں نے امریکہ جیسی سپرپاور کو للکارا ہے۔ بہت سے عرب اسے انتہائی حماقت سمجھتے ہیں جبکہ دوسروں کے نزدیک صدام کی جرات و پامردی قابل ستائش ہے۔ گویا صدام حسین کو اب اپنی بقاء کی یہ صورت نظر آئی ہے کہ بہت سے اسرائیلیوں اور امریکیوں کو تہہ تیغ کیا جائے۔ کویت سے لڑتے ہوئے مراجعت اختیار کی جائے اور پھر مذاکرات کا مطالبہ کیا جائے۔ ممکن ہے ان کے مخالف اتحادی زیادہ اموات کے خوف میں مبتلا ہو کر ایسی رعائتیں دینے پر آمادہ ہو جائیں جن کے بارے میں جنگ سے پہلے وہ سوچنے کے روادار بھی نہ تھے۔ اگر ایسا ہوا تو صدام حسین عراقیوں کو یقین دلا سکیں گے کہ وہ نہ صرف جرات مند ہیں بلکہ فن حرب کے زبردست ماہر بھی ہیں۔

اتحادیوں کے لئے اس جال میں پھنسنے کی واحد صورت یہ ہے کہ وہ اس وقت تک مذاکرات پر آمادہ نہ ہوں جب تک عراق کویت کو خالی نہ کر دے اور اگر مسٹر صدام بغداد میں برسر اقتدار رہتے ہوئے جنگ بندی کی درخواست کریں تو ان پر واضح کر دیا جائے کہ کویت خالی کرنے سے پہلے سیز فائر نہیں ہو گا۔ اقوام متحدہ نے کویت کو آزاد کرانے کی اجازت دی ہے۔ صدام حسین کی برطرفی کے بارے میں کچھ نہیں کہا۔ اگرچہ یہی وہ نصب العین ہے جس کی زبردست خواہش کی جاتی ہے۔ اگر انہیں فوجی انقلاب برپا کر کے اقتدار سے ہٹایا گیا تو یہ جنگ کوئی جائز مقصد نہیں سمجھا جائے گا۔ الٹا صدام کو اس سے اضافی فائدہ پہنچے گا۔

شاید جنگ کی گرمی کے دوران یہ بات پر کشش لگے کہ سرحدی لکیر کو نظر انداز کر کے کویت کے ماورا پیش قدمی کی جائے۔ جنگ کے دائرہ کو وسعت دی جائے۔ یہاں تک کہ بغداد قبضہ میں آ جائے۔ لیکن بش کے بقول اس صورت میں یہ جنگ کویت کو آزاد کرانے کی کارروائی نہیں رہے گی بلکہ عراق کو زیر نگیں لانے کی لڑائی میں بدل جائے گی۔ اس کے لئے بہت زیادہ جانوں کا نذرانہ دینا پڑے گا۔ دشمنی اور رقابت زیادہ پھیلے گی اور قانون کی نگاہ میں اتحادیوں کا موقف بے معنی ہو کر رہ جائے گا۔ کویت سے انخلاء کے بعد صدام حسین کو برسر اقتدار رہنے دیا گیا تو شاید وہ وبال جان بن جائیں تاہم وہ ایک کمتر برائی ہو۔

جنگ میں پھیلاؤ اتحادیوں کے مقاصد کے خلاف ہو گا۔ اس کے ساتھ ساتھ اتحادیوں کو چاہئے کہ وہ اپنے وسائل کے انتخاب میں زیادہ وسعت سے کام لیں۔ ایران کے خلاف لشکر کشی میں عراقی فوج نے انسانوں کا قیمہ بنانے والے فن حرب میں خوب مہارت حاصل کی۔ اتحادیوں کے پاس ایسے فوجی آلات موجود ہیں جن سے انقلابی ایران محروم تھا۔ کویت کو آزاد کرانے کا مختصر ترین اور کمتر ہولناک راستہ یہ ہو سکتا ہے کہ عراق کی غیر معمولی مرکزیت پسند حکومت کا تختہ الٹ دیا جائے۔ اس صورت میں مسٹر صدام کے بنکر پر بمباری یا گولہ باری کی ضرورت نہیں رہے گی۔ جنگ ختم کرنے کے لئے ان کی موت کافی ہو گی۔ گو ایسا کرنا ناگزیر نہیں۔ البتہ جنگ چھڑ جانے کے بعد عراق کے ایٹمی ہتھیاروں اور زہریلی گیس کی فیکٹریوں کو سب سے پہلے تباہ کرنا ہو گا۔

جنگ میں ہار جیت کا انحصار

اگر اتحادی اپنے عزائم کے مطابق جنگ میں جیت جاتے ہیں تو اگلا سوال یہ ہو گا کہ اب کیا کیا جائے؟ حالیہ ہفتوں میں جن لوگوں کی طرف سے میدان جنگ کی طرف کوچ کی مخالفت کی گئی ان کا استدلال یہ ہے کہ جنگ میں کامیابی کے باوجود امریکی کولیشن علاقہ میں قیام امن کی کوششوں میں سرخرو نہیں ہو گی۔ اس سلسلہ میں بڑی سخت پیش گوئیاں سننے میں آ رہی ہیں۔ جن میں کہا جا رہا ہے چونکہ افواج کا کثیر حصہ امریکیوں پر مشتمل ہے۔ اس لئے مشرق وسطیٰ کے عوام اسے مسلمانوں کے خلاف عیسائیوں کی آویزش قرار دے دیں گے اور یہ بات فراموش کر دی جائے گی کہ اس معرکہ آرائی میں مصر، شام، مراکش، سعودی عرب اور کویت برابر کے شریک ہیں۔ ممکن ہے جنگ میں شکست کھانے کے بعد عراق کی موجودہ فوجی و سیاسی اہمیت ختم ہو جائے، تاہم یہ خدشہ موجود ہے کہ اس جیسا دوسرا فسادی ملک شام یا ایران مشرق وسطیٰ کی پیٹھ پر سوار ہو جائے اور تیل کی دولت سے ہاتھ رنگنے لگے۔ اگر تیل کے کنوؤں میں آگ بھڑک اٹھی تو وہ برسوں نہیں بجھے گی۔ اس سے یورپ و امریکہ کی راتیں اندھیر ہو جائیں گی اور عالمی معیشت کا جنازہ نکل جائے گا۔

بالفرض محال یہ جنگ گھڑی کی چابی کے مطابق چلتی اور اتحادیوں کے حسب منشا، اختتام

کو پہنچتی ہے۔ اس صورت میں مشرق وسطیٰ کی مابعد جنگ حالت بڑی ہی ابتر ہو گی۔ اگرچہ وہاں کے حالات اب بھی خراب ہیں۔ اسرائیل سے قطع نظر کسی ملک میں جمہوری نظام نہیں۔ تمام ملکوں میں حکومت نے جابرانہ انداز میں اقتدار پر قبضہ کر رکھا ہے۔ اس لئے ان کی جڑیں کھوکھلی اور مستقبل مخدوش ہے۔ ریاستوں کے مابین تعلقات کشیدہ اور سرحدوں پر صورتحال سنگین ہے۔ شام نے لبنان کے علاقہ پر اور اسرائیل نے مغربی کنارہ نیز غزہ کی پٹی پر غاصبانہ قبضہ کر رکھا ہے۔ ایران اور عراق کے درمیان طویل خونریزی حال ہی میں ختم ہوئی ہے۔ مزے کی بات یہ ہے کہ سرحدی لکیر اب بھی وہیں ہے جہاں لڑائی سے پہلے تھی۔ مصر کے علاوہ کسی اور عرب ملک نے اسرائیل کو تسلیم نہیں کیا۔ دوسری طرف اسرائیل کسی فلسطینی قوم کے وجود کو ماننے پر آمادہ نہیں، ان حالات میں شاید جنگ، جیتنا ممکن ہو، تاہم علاقہ میں امن کے خواب کا شرمندہ تعبیر ہونا محال نظر آتا ہے۔

بلاشبہ جنگ کے نتیجہ میں وہاں پر کوئی پرامن نظام قائم نہیں ہو گا البتہ یہ ممکن ہے کی موجودہ نظام کا کلی انحطاط رک جائے۔ کویت پر حملہ سے پہلے عرب ریاستیں عالمی ضابطوں کی پابند تھیں اور ایک دوسرے کے آزادانہ وجود کا احترام کرتی تھیں۔ کویت کو ضم کرنے سے ایک بلند و اعلیٰ اصول کی دھجیاں بکھر گئیں۔ اگر دوسرے بھی اسی راہ پر چل پڑے تو سلطنت عثمانیہ کے کفن کے ٹکڑے جوڑ کر جو ریاستیں کھڑی کی گئی تھیں ایک ایک کر کے سب تباہی کی نذر ہو جائیں گی۔ عظیم تر عراق کے بارے میں صدام جو دلائل دیتے ہیں، وہ حافظ الاسد کے ان دعاوی کے مقابلہ میں خاصے ہیچ اور کمزور ہیں جو ان کی طرف سے عظیم تر شام، جس میں لبنان، اردن، اسرائیل اور ترکی کا کچھ حصہ ان کی قلمرو میں شامل ہونا چاہئے کی حمایت میں پیش کرتے رہتے ہیں۔

شکست و ریخت سے دو چار ہونے کے خوف اور عراق کی ضرورت سے زیادہ بڑھتی ہوئی طاقت کے اس ڈر کی بنا پر ہی عرب ریاستیں امریکی کمان کے نیچے متحد ہوئی ہیں اور علاقے میں امریکی اثر و رسوخ کا دائرہ وسیع ہو رہا ہے۔ اردن کی چھوٹی سی ریاست، جو اسرائیل کے سایہ میں واقع ہے، صدام حسین کو جو مالی امداد دیتی ہے اس کا بڑا چرچا کیا جاتا ہے۔ عرب دنیا

کے بڑے مشرقی ممالک، مصر، شام اور سعودی عرب اس نتیجہ پر پہنچ چکے ہیں کہ صدام حسین کو چیلنج نہ کرنا ان کی مخالفت کرنے سے زیادہ خطرناک ہوگا۔ وہ خود اپنی اور دوسروں کی بھی مدد اس شکل میں کر سکتے ہیں کہ اپنی افواج کو زمینی لڑائی میں بھرپور حصہ لینے کو کہیں جیسا کہ سعودی اور کویتی فضائیہ نے ابتدائی حملہ میں شریک ہو کر اپنے زندہ ہونے کا ثبوت دیا ہے۔ ایسے اقدامات سے اس تاثر کو زائل کرنے میں بھی مدد ملے گی کہ یہ اسلام کے خلاف عیسائیت کی جنگ ہے۔

مغرب کو جنگ کے بعد بھی مشرقِ وسطیٰ میں مسلسل کام کرنا پڑے گا۔ امریکہ کا یہ قدیم تصور کہ عراق، ایران اور سعودی عرب کے درمیان طاقت کا توازن قائم کرنے سے خلیج کی سلامتی کا بندوبست ہو سکتا ہے، قابل عمل نہیں رہا۔ سعودی معاشرتی لحاظ سے کوئی مضبوط دفاع قائم کرنے کے اہل نہیں۔ عراق اور ایران کے عوام بھی دم گھونٹنے والی آمریتوں کے نیچے جینے پر آمادہ نہیں ہوں گے۔ مصر جو کہ فوجی لحاظ سے ایک مضبوط ملک ہے اور اسے ایک مستحکم قیادت بھی میسر ہے شاید تیل کی دولت میں حصہ ملنے پر، جس کا وہ دیرینہ خواہش مند ہے، جزیرہ نما عرب کے دفاع کی ذمہ داری قبول کرنے پر کمربستہ ہو جائے۔ تاہم آزاد کرائے گئے کویت کی حفاظت کے لئے کسی نہ کسی شکل میں بین الاقوامی فوجوں کی تعیناتی لازمی ہو گی۔ ان افواج کے وہاں قیام کا انحصار اس بات پر ہو گا کہ عراق کے اندر کیا صورتحال ظہور پذیر ہوتی ہے۔ شکست یافتہ عراق پر صدام حسین کا اقتدار باقی رہا تو وہ اور بھی زیادہ خطرناک ثابت ہو گا۔ وہ عراق جس نے بعث پارٹی کی ڈکٹیٹرشپ کے زوال پر گہرے دکھ کا اظہار کیا تھا، بدلے ہوئے حالات میں ایک اچھا ہمسایہ بن سکتا ہے۔

عراقی کونسی راہ عمل اختیار کریں گے؟ فی الحال اتحادیوں کو اس بارے میں کچھ معلوم نہیں۔ سچی بات تو یہ ہے کہ اتحادی ان کی پسند و ناپسند پر زیادہ اثر انداز نہیں ہو سکتے۔ آزادی ملنے کے بعد مشرقی عرب دنیا کے عوام سے یہ غلطی ہوئی کہ انہوں نے دوسری قوموں کے تجویز کردہ نظام حکمرانی کو اپنا لیا۔ مغرب اپنی دوست حکومتوں کی درخواست پر اقوام متحدہ کی اجازت سے ان خرابیوں کی اصلاح میں مدد دے سکتا ہے۔ کویت کے بعد عربوں کے ساتھ

اسرائیل کی صلح کرانے کے لئے اسے ایسے ہی اقدامات لرنا ہوں گے۔ یہ بات قابل ذکر ہے کہ جنگ ختم ہونے پر مغرب یہاں خنجر کی نوک پر امن و امان اور جمہوریت قائم نہیں کر سکے گا۔ ایسے نو آبادیاتی ہتھکنڈوں کی کامیابی کا زمانہ لد گیا۔

خلیج ٹائمز۔ دوبئی

20-1-91

توجہ صرف کویت پر مرکوز رکھی جائے

عراق اس کثیر القومی اتحاد کو، جو کویت کی آزادی بحال کرانے کے لئے بنایا گیا ہے، زیادہ سے زیادہ نقصان پہنچانے کی نت نئی کوششیں کر رہا ہے اسرائیل پر میزائلوں سے جو حملے کئے جا رہے ہیں ان کا مقصد ایک طرف کویت سے توجہ ہٹانا ہے دوسری طرف گذشتہ پانچ مہینوں میں عراقیوں کو کویت سے نکالنے کے لئے جو صف بندی کی گئی اور سیاسی نتائج حاصل کئے گئے ان کی راہ میں پیچیدگیاں پیدا کرنا ہے۔ حکومت عراق شاید یہ اندازہ لگا رہی ہے کہ اسرائیل کو لڑائی میں گھسیٹنے سے، جو اس وقت تک براہ راست جنگ میں شریک نہیں، مختلف الاصل قوموں کے اتحاد پر دباؤ اس طرح بڑھایا جا سکتا ہے کہ ان کے مفادات میں پائی جانے والی عدم مطابقت کو بڑھا چڑھا کر بیان کیا جائے۔ اس اسکیم کو اس طرح ناکام بنایا جا سکتا ہے کہ اسرائیل کو میدان جنگ سے باہر رکھا جائے۔ امریکہ اور دوسری طاقتیں اس سلسلے میں پہلے ہی سرگرم عمل ہیں۔ بہرحال میزائلوں کے بار بار حملوں کی صورت میں اسرائیلی سیاستدانوں کے لئے زیادہ دیر تک لاتعلق رہنا ناممکن ہو جائے گا۔ گویا صدام حسین نے اسرائیل کارڈ کھیل کر اتحادیوں کو ہراساں کرنے کی ترکیب استعمال کی اس سے عرب عوام کے ذہنوں میں شکوک و شبہات بھی پیدا کئے جا سکیں گے۔ تاہم یہ کوئی زیادہ بڑی چال نہیں ہے خصوصاً اس ہے تاکہ اصل ہدف سے توجہ نہ ہٹے اور کویت کی آزادی کا مسئلہ پیچیدہ بن کر نہ رہ جائے۔ مغربی میڈیا اتحادیوں کو اس رنگ میں اس مقصد سے اجاگر کر رہا ہے تاکہ اسرائیل کو جنگ سے باہر رکھنے کے لئے تحفظ دیا جا سکے۔ حقیقت یہ ہے کہ سکڈ کی لعنت کا استیصال ہو گیا تو یہ

پورا خطہ صدام کی فوجی مشینری سے محفوظ ہو جائے گا اور کویت کی آزادی کے لئے لڑی جانے والی جنگ میں پیشرفت ہو سکے گی۔ یہ وہ پہلو ہے جس پر کویت کو آزاد کرانے کے مقصد پر توجہ مرکوز کرنے اور پیش منظر کو سیدھا رکھنے کے لئے زیادہ زور دینے کی ضرورت ہے۔ عراق کو یہ موقع نہ دیا جائے کہ وہ فلسطین کے مسئلہ کو کویت سے منسلک کرنے کی ڈپلومیسی میں ناکامی کے بعد کوئی دوسرا مسئلہ کھڑا کر کے اس مقصد میں رکاوٹ ڈال سکے۔

اس میں شک نہیں کہ بغداد یقیناً ایک پیچدار کھیل، کھیل رہا ہے، تاہم اس کی قیادت پر واضح ہو جانا چاہئے کہ جوں جوں وقت گزرتا جائے گا اور فوجی کارروائی آگے بڑھے گی اس کے لئے دن بدن واپسی مشکل ہوتی جائے گی اور اگر وہ اسرائیل کو جنگ میں ملوث کرنے میں کامیاب ہو جاتا ہے تو جنگ کا دائرہ وسیع ہو جائے گا اس صورت میں کویت سے واپسی اس کے کسی کام نہیں آئے گی۔ اتحادی حکومتوں کا اب بھی یہ خیال ہے کہ اگر صدام حسین اس مرحلہ پر اقوام متحدہ کی قرارداد منظور کر لیں اور کویت سے اپنی افواج کو نکالنا شروع کر دیں تو وہ جارحانہ کارروائی بند صورت میں جبکہ تمام حکومتوں، سیاستدانوں حتیٰ کہ عام آدمی پر اس کی سیاسی نوعیت ظاہر و آشکارا ہے۔ اسرائیل پر میزائل پھینک کر عراق ایک سیاسی فائدہ اٹھانا چاہتا ہے۔ اس پر حربی یا فوجی ضرب لگانا مقصود نہیں۔ چنانچہ ہم بخوبی قیاس کر سکتے ہیں کہ عراقی حملوں کے جواب میں اسرائیل کے جنگ میں کود پڑنے کے باوجود یہ اتحاد قائم رہے گا۔ اس سلسلے میں ان عرب دارالحکومتوں سے جو عراق کے خلاف اتحادیوں کے شانہ بشانہ لڑ رہے ہیں۔ اس طرح کے واضح اشارے ملے ہیں کہ خلیج میں امریکی کمان کے تحت صف بندی کا اصل اور قطعی مقصد کویت کو آزاد کرانا ہے۔ اقوام متحدہ کی طرف سے دی گئی اجازت میں بھی یہی کہا گیا ہے کہ اگر کسی نے اس مقصد میں اصل مشن سی توجہ ہٹانے کے لئے نئے عوامل شامل کرنے کی کوشش کی تو اس چال کو بڑی خاموشی کے ساتھ ناکام بنا دیا جائے گا متحدہ محاذ کو کسی بھی پہلو سے اپنے اندر کمزوری یا پھوٹ کا تاثر نہیں دینا چاہئے۔

سردست صدام کے باقی ماندہ سکڈ میزائلوں کو ناکارہ بنانے پر توجہ دینے کی بجائے اس کی پھوٹ ڈالنے والی حکمت عملی پر حد سے زیادہ زور دیا جا رہا تھا۔ جلد ہی ایک ایسا مرحلہ آ رہا

ہے جب عراق کی واپسی اتحادیوں کے آپریشن کو روکنے کے لئے کافی نہیں ہو گی۔ اس لئے یہ بات عراق اور اس کے رہنماؤں کے مفاد میں ہے کہ وہ اسرائیل کو میدان جنگ میں گھسیٹنے اور لڑائی کو بڑھانے کی بجائے کویت خالی کرنے پر غور کریں۔ کویت کا حامی اتحاد ایسی صورت حال سے نمٹنے کی پوری صلاحیت رکھتا ہے لیکن اس صورت میں عراق کو بھاری قیمت ادا کرنا پڑے گی۔

گارڈین--لندن

19-1-91

اسرائیل اور ناقابل اعتبار مشاورت

اسرائیل نے عراق پر جوابی حملہ کیا تو وہ براہ راست خلیجی جنگ کے پھیلاؤ کا سبب بن جائے گا۔ اس بارے میں دو رائیں نہیں ہو سکتیں۔ یہ چیز اسرائیل کی اس علاقائی پالیسی کے بھی خلاف ہو گی۔ جس کا اعلان واضح طور پر حالیہ ہفتوں بلکہ مہینوں کے دوران بار بار کیا گیا ہے۔ بلکہ یہ اقدام امریکہ کے مقاصد جنگ کے بھی خلاف ہو گا۔

گزشتہ روز اسرائیلی کابینہ میں جو بحث ہوئی۔ وہ حکیمانہ ذاتی مفاد اور انتقامی داعیہ کے مابین کھلا تصادم تھا۔ کل رات جنگ سے اجتناب کے حق میں جو جرح ہوئی اس سے امریکہ کے ساتھ ہونے والی سخت گفتگو کا بخوبی اندازہ کیا جا سکتا ہے۔ کل مسٹر بش نے اس بات پر وزیراعظم شمیر کا اعلانیہ شکریہ ادا کیا کہ وہ "امریکہ کے مفادات کو اچھی طرح سمجھتے ہیں"۔ وہ یہ کہنے میں حق بجانب تھے کہ صدام حسین کا اسرائیل پر سکڈ میزائلوں سے حملہ کوئی فوجی کارروائی نہیں بلکہ کھلی ہوئی دہشت گردی ہے۔ حقیقت میں یہ سیاسی مقصد کے تحت کی گئی ایک سیاسی کارروائی ہے۔ جس کی بابت کئی بار دھمکیاں دی جا چکی تھیں۔ ان میں وہ دھمکی بھی شامل ہے جو جنیوا مذاکرات کے بعد طارق عزیز نے ان الفاظ میں دی تھی۔ "اگر عراق پر حملہ کیا گیا تو وہ اسرائیل کو لازماً نشانہ بنائے گا"۔ اگرچہ اس دھمکی کا غالب مقصد مخالف فریق کو جنگ سے باز رکھنا تھا۔ پھر بھی سکڈ میزائل کا ویسے مفہوم با آسانی تل ابیب تک پہنچ جائے

گا۔ جو پچاس فیصد صحت کے ساتھ اپنے ہدف کو نشانہ بنا کر نقصان پہنچا سکتا ہے۔ گو کیمیکل وار ہیڈ کے استعمال کا امکان موجود ہے۔ تاہم ان کی ٹیکنالوجی بہت ہی محدود ہے عراق کا ابتدائی حملہ روایتی وار ہیڈز تک محدود تھا۔ غالباً ایسا اس قیاس کی بنیاد پر کیا گیا جس کی طرف ایک اسرائیلی فوجی مبصر نے یوں اشارہ کیا ہے: "اس کا اصل مدعا ہمیں احمقانہ حرکتوں کی ترغیب دئے بغیر جنگ میں گھسیٹنا ہے اگر اس نے تل ابیب پر کیمیائی ہتھیاروں سے حملہ کیا تو اسے جان لینا چاہئے کہ وہاں بھی کسی شخص پر جنون کا دورہ پڑ سکتا ہے"۔

بایں ہمہ یہ ٹھوس امکان موجود ہے کہ جنگ میں انتقام یا غیر انتقامی طریقہ سے وسعت پیدا ہو جائے گی۔ یہ بات یقیناً درست ہے کہ اسرائیل کے لڑاکا طیارے میزائلوں کو اس سے زیادہ موثر انداز میں پھینک سکیں گے جیسا کہ امریکی فضائیہ پہلے ہی پھینک رہی ہے۔ انہیں ایسا قدم زیادہ اشتعال انگیزی کے عالم میں اٹھانا پڑے گا، اس طرح عراق کی طرف سے دوسرے راونڈ کا خطرہ مزید بڑھ جائے گا۔ اس صورت میں جذباتیت حکیمانہ احتیاط پر غالب آجائے گی۔ اگر اسرائیل نے ایٹمی ہتھیار استعمال کئے تو فیصلہ کن دن کا سارا منظر افسانہ سے حقیقت میں بدل جائے گا تاہم ابتداء میں اسرائیل کے الگ رہنے سے عراق کی اس قدر حوصلہ افزائی ہو گی۔ کہ اسے جب بھی موقع ملا وہ مزید حملے کرے گا۔ جس کا مقصد یہ ہو گا کہ اگر پہلی بار جواب نہیں دیا جاتا تو دوسری یا تیسری بار ضرور دیا جائے گا۔ جب تک جنگ جاری رہے گی۔ ہمیں ایسے بحرانوں سے واسطہ پڑتا رہے گا۔

شام نے اپنی پوزیشن پہلے ہی واضح کر دی ہے۔ جیمز بیکر کے دورہ مشن کے موقع پر وہاں کے وزیر خارجہ نے دو ٹوک الفاظ میں بتایا تھا: "ہم اسرائیلی مداخلت برداشت نہیں کر سکتے۔ اگر اسرائیل نے عراق پر حملہ کیا تو جنگ کے موجودہ مقصد کو بدلنا اور علاقہ میں سیاسی قوتوں کو انقلابی انداز میں تبدیل کرنا ہو گا۔ بعض لوگوں کا خیال تھا کہ شام شاید اسرائیل کے معمولی حملہ کو خاموشی سے برداشت کر لے گا۔ لیکن یہ قیاس انتہائی بودا ہے۔ گو حافظ الاسد کو ایسی جنگ سے فائدہ پہنچ سکتا ہے۔ جس میں عراقی قوت کا جنازہ نکل جائے پھر بھی یہ خدشہ اپنی جگہ باقی ہے کہ اگر اسرائیل کو خواہ مخواہ جنگ میں گھسیٹ لیا گیا تو شام خاموش نہیں رہے گا۔

تل ابیب نے اسرائیلی حملہ کے سفارتی نتائج کو کسی حد تک پہلے ہی نظر انداز کر دیا ہے۔ گزشتہ ہفتے اسرائیلی وزیر خارجہ لیوی نے واشنگٹن کا دورہ کیا تو جیسا کہ "واشنگٹن پوسٹ" کی رپورٹ سے ظاہر ہے اس پر واضح کر دیا گیا تھا کہ اسرائیل کو عراق کی طرف سے میزائل کے حملہ کو امریکہ کے زیر قیادت کولیشن اور صدام حسین کے مابین سیاسی سمجھوتہ کے لئے پیش کئے گئے زیادہ تر فارمولوں میں اسرائیل کے زیر تسلط علاقوں میں بسنے والے فلسطینیوں کے حقوق پر بات چیت کرنے کا بین الاقوامی مطالبہ شامل ہے۔ گارڈین نے بحران کے پہلے مرحلہ میں اصرار کے ساتھ یہ دلیل پیش کی (جیسا کہ برطانیہ کے سوا ساری یورپی برادری سمجھتی ہے) کہ فلسطینیوں کے حقوق کا حل بڑے عرصہ سے معرض التواء میں پڑا ہوا ہے اور اب فطری طور پر یہ مسئلہ علاقائی سمجھوتہ کے ضمن میں آتا ہے۔ اگر وہ تصفیہ 15 جنوری سے قبل ہو جاتا تو کویت سے عراق کی واپسی ممکن تھی۔ اب ہم اس بحران کے دوسرے جنگی مرحلہ میں داخل ہو چکے ہیں۔ جس میں اس قسم کے سفارتی اقدامات کی گنجائش نہیں رہی۔ تاہم جیسا کہ مسٹر لیوی نے ہفتہ رفتہ کے آخر میں حقیقت پسندانہ انداز اختیار کرتے ہوئے کابینہ کے اجلاس کو بتایا: "یہ سمجھنا حماقت ہو گی کہ عراق کے ساتھ مذاکرات سے انکار کر کے کویت کے مسئلہ کو فلسطینی مسئلہ کے ساتھ منسلک کرنے کی بات ختم کر دی گئی ہے۔ نفسیاتی طور پر دونوں معاملوں کے مابین ربط و اشتراک پیدا کر دیا گیا ہے اور اسرائیل کو جنگ کے تیسرے مرحلہ میں اس بات کے لئے تیار رہنا چاہئے کہ علاقہ کے لئے "جامع امن منصوبہ" میں نئے بین الاقوامی مطالبات پیش کئے جا سکتے ہیں۔ "عراق کے میزائل اور اسرائیل کی طرف سے نوک خنجر پر اس کا جواب محض اس بات کی یاد دہانی کراتے ہیں کہ علاقہ کے اس جغرافیائی و سیاسی سوال کو خلیج کی جنگ کے ساتھ مضبوط رسوں سے باندھ دیا گیا ہے۔

ہفت روزہ نیوز ویک امریکہ

نوٹ۔ ٹام متھیوز کا یہ طویل مقالہ زیادہ تر ڈگلس والر کی رپورٹوں پر انحصار کر کے لکھا گیا ہے۔ نیز تھامس ایم ڈی فرانک، این میک ڈینیل اور مارگریٹ جیراڈی کی اضافی رپورٹوں

سے بھی استفادہ کیا گیا ہے۔

1- سگنل جنہیں مس کر دیا گیا

واشنگٹن نیوی یارڈ میں، جو کہ ڈسٹرکٹ کولمبیا میں ایک پر سکون جگہ ہے، جولائی اگست کی گرمی اپنے عروج پر تھی۔ اگست کے ایک حبس والے دن وائس ایڈمرل فرانس ڈونووان، چیف آف نیویز ملٹری سی لفٹ کمانڈ، اپنے سینیئر سٹاف کے ساتھ گزشتہ رات موصول ہونے والے تاروں کا جائزہ لے رہا تھا۔ ان کے سامنے میز پر محکمہ دفاع کی طرف سے موصول ہونے والی تازہ انٹیلی جنس رپورٹیں پڑی تھیں۔ ان میں کویت پر عراق کے حملہ کی بابت افواہیں تھیں۔ ان افواہوں --- محض افواہوں کی حقیقت میں کوئی اساس نہیں تھی۔ ایڈمرل انہیں نظرانداز کر کے دوسری طرف ٹیلی وژن کی سکرین پڑھنے لگا۔ سی این این خلیج فارس سے عراقی حملہ کی خبریں نشر کر رہا تھا۔ صدام حسین نے کویت پر پہلے ہی قبضہ کر لیا تھا۔ جونہی پردہ سکرین سے یہ منحوس خبر غائب ہوئی، ایڈمرل کے ایک نائب نے ایک انٹیلی جنس رپورٹ کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا "جس کسی نے یہ رپورٹ لکھی ہے اسے نوکری سے نکال دینا چاہئے" وہ سب بے چینی و پریشانی کے عالم میں ہنسنے لگے۔ صدام حسین نے ہر کسی کو غیر متوازن بنا دیا تھا۔ گزشتہ حالات کے پیش نظر یہ بات بڑی اہم تھی کہ حکومت امریکہ نے ابتدائی ناکامی کے بعد خود کو بڑی تیزی سے سنبھال لیا تھا۔ آئندہ پانچ مہینوں میں صدام حسین اور جارج بش کے مابین ایسی محاذ آرائی نے جنم پا لیا جو کسی طرح ختم نہ ہو سکی۔ اس کھیل کا پہلا راؤنڈ صدام کے حصہ میں آیا۔ جس نے ایسے موقع پر وار کیا جب صدر بش جرمنی کو دوبارہ متحد کرنے، مشرقی یورپ کو جمہوری سانچہ میں ڈھالنے اور گورباچوف کی طرف سے ممکنہ خطرات ختم کرنے میں مصروف تھا۔ اگرچہ امریکی انٹیلی جنس نے صدام کے ٹینکوں کی گڑگڑاہٹ کا صحیح سراغ لگا لیا تھا، لیکن کوئی بھی اس کے اصل عزائم کو بروقت نہیں سمجھ سکا۔ تاکہ اس کی روک تھام کر لی جاتی۔ دوسرا راؤنڈ بش کو ملا۔ اگست کے تین انتہائی گرم ہفتوں کے دوران موسمی حالات کا مردانہ وار مقابلہ کرتے ہوئے اس نے سعودی عرب میں

حیران کن تیز رفتاری کے ساتھ امریکی فورس کی صف بندی کرائی۔ صنعتی لحاظ سے ترقی یافتہ جمہوریتوں، عرب لیگ کی ممبر ریاستوں کی اکثریت اور اقوام متحدہ کو ایک بین الاقوامی اتحاد میں منظم کیا۔ ان سب نے اجتماعی تحفظ کیلئے پختہ قول قرار کئے۔ پھر اس نے حملہ آور فوج اکٹھی کی جو دوسری جنگ عظیم میں نارمنڈی کے مقام پر آئزن ہاور کی جمع کردہ فوج کے بعد سب سے بڑی تعداد ہے۔ صدام نے بحری قزاق کی طرح آسان انعام پر عیاشی کو کافی سمجھ لیا تھا۔ جبکہ بش نے اس کے برعکس اپنے لئے پورا سمندر خرید لیا۔

یہ موجودہ خلیجی جنگ کی طرف جانیوالی شاہراہ کی پس پردہ کہانی ہے۔ یہ داستان صدر بش کی ان مخلصانہ کوششوں کی تذلیل و توہین سے شروع ہوتی ہے جو اس نے خلیج میں قیام امن کی خاطر فوری طور پر اس لئے کیں تاکہ صدام حسین کی قوت محفوظ رہ جائے اور ترقی کر سکے، جب کہ وہ ڈکٹیٹر اپنے جارحانہ عزائم کی پرورش کر رہا تھا۔ یہ حکایت امریکہ کی انٹیلی جنس ڈھانچہ کی صدام کے کویت پر حملہ کی بابت پیشگی خبر دینے سے ناکامی سے ہوتی ہوئی آگے بڑھتی ہے، حالانکہ اس نے پورے جزیرہ نما عرب کے ٹکڑوں کو پاش پاش کر دینے کی بات اعلانیہ کی تھی۔ ان دنوں صدر بش گرمی کی تعطیلات گزارنے (Maine) گیا ہوا تھا۔ جہاں اس نے اپنے نائبین کو اعصابی لحاظ سے اس بارے میں مضطرب اور پریشان حال دیکھا کہ صدام سعودی عرب پر حملہ کرنے، اسی کے تیل کے کنوں میں آگ لگانے اور امریکہ کو ایک ایسی جنگ کیلئے، جو اپنی مثال نہیں رکھتی، دعوت مبارزت دینے کی تیاریاں کر رہا ہے۔

اس کے بعد بھاگ دوڑ کے زور نے رخ بدلا۔ پینٹاگون نے لڑائی کے ایک فرسودہ پلان کو بنیاد بنا کر زبردست لڑاکا فورس کی تیاری کا کام شروع کر دیا۔ تھکے ماندے افسروں نے اس کے ساتھ ایک پیچیدہ پلان جوڑ دیا تاکہ اسے آدھی دنیا میں بروئے کار لایا جا سکے۔ یہ ایک ایسی مشق تھی جو بعض خامیوں پر غالب آ جاتی ہے اور بعض تند و تیز فریب کاریوں سے پروان چڑھتی ہے۔ آخر کار صدر نے صدام کو کویت سے نکالنے کیلئے اپنی آخری کوشش کے طور پر بیک وقت فوجی سفارتی اور سیاسی تین محاذوں پر ایک انتہائی نازک مہم کا آغاز کر دیا۔

اس کی ابتداء سیاسی بصیرت کی اس کم نظری سے ہوئی تھی۔ ایران عراق جنگ کے

دوران جب رونالڈ ریگن نے صدام کے ساتھ سفارتی تعلقات کی بحالی کا فیصلہ کیا، تو وہ بغداد میں سی آئی اے کا اسٹیشن قائم کرنا بھول گیا۔ نتیجتہً صدام کے عزائم اور اس کی فوجی قوت و سیاسی مقبولیت کا اندازہ لگانا امریکیوں کے بس کی بات نہ رہی۔ ناچار یہ کام انجام دینے کیلئے صدام کی انٹیلی جنس کے ساتھ اشتراک عمل، اس کے معاملات میں مداخلت نہیں، کا فیصلہ کیا گیا۔ عربی دان افسران کی کمی نے ڈکٹیٹر کے ساتھ مسابقت مزید مشکل بنا دیا۔ گذشتہ اگست سے پہلے امریکی انٹیلی جنس حلقوں میں اس بات کو عموماً روایتی دانشمندی شمار کیا جاتا تھا کہ صدام کا اصل مقصد خلیج پر کنٹرل حاصل کرنا ہے، اسے اپنی پوزیشن بنانے میں کم از کم تین سال لگیں گے اور وہ اگلے دس برسوں میں لڑائی کا خطرہ مول نہیں لے سکے گا۔ سی آئی اے کے ڈائریکٹر ولیم ویبسٹر کا کہنا ہے کہ "ہمیں اس کے ارادوں کا ٹھیک دس گیارہ مہینے پہلے پتہ چل گیا تھا۔ البتہ اس کے ٹائم ٹیبل کو ٹھیک ٹھیک سمجھنے میں ہم سے چوک ہو گئی۔ جس کے تحت وہ اپنے طریقے سے اقدام کرنے کے قابل ہو سکتا تھا۔ اس کے برعکس صدام کے خفیہ ارادوں کے تجزیہ پر خوش فہمی کے دبیز پردے ڈال دیئے گئے۔ ایران کے ساتھ جنگ بندی کے بعد جوزف ولسن کو، جو کہ ایک سخت مزاج سفارتکار تھا۔ بغداد میں بطور سفیر متعین کیا گیا۔ مشن کی ڈپٹی چیف اپرل گلاسپی نے بعد میں بتایا۔ "علاقہ میں موجودہ ہمارے دوستوں نے ہمیں مشورہ دیا تھا کہ حکومت عراق مغرب کے ساتھ آغاز کار کی خواہاں ہے اور اپنے رویہ کو معتدل بنانا چاہتی ہے" انہی دوستوں نے واشنگٹن سے یہ بھی کہا کہ وہ اس مفروضہ پر عمل کرتے ہوئے صدام کی حوصلہ افزائی کرے۔ اس پر پابندیاں عائد کرنے کی بجائے مختلف ترغیبات سے کام لے۔ یہ وہی پالیسی تھی جس پر امریکہ نے دوسرے ملکوں میں عمل کیا تھا۔ کیا یہ پالیسی اپنے مقصد میں ناکام ہو گئی۔ ولسن تسلیم کرتا ہے کہ "واقعی ہمیں اپنے مشن میں ناکامی ہوئی۔"

مشرق وسطیٰ میں متعین سفارتکاروں کا خیال ہے کہ صدام حسین نے کویت پر حملہ کی تیاریاں قریباً ایک سال پیشتر شروع کر دی تھیں۔ اوائل ء میں عمان میں منعقد ہونے والے خلیج تعاون کونسل کے اجلاس اور بعد ازاں بغداد عرب سربراہی کانفرنس میں اس نے زور

دے کر یہ بات کہی کہ امریکہ آڑے وقت میں اسرائیل کی امداد اور عربوں کو ذلیل و خوار کرنے کے ساتھ ساتھ اپنا تابع کرے۔ مہمل بنانے کی غرض سے خلیج پر تسلط جمانا چاہتا ہے کیونکہ عرب اب ماسکو کی مدد پر زیادہ بھروسہ نہیں کر سکتے۔ اس نے کویت کے ساتھ تیل کی قیمتوں اور اوپیک کے مقرر کردہ پیداواری کوٹہ کے بارے میں اس بنا پر احتجاج کرتے ہوئے جھگڑا شروع کر دیا کہ کویت کے امیر جابر الاحمد الصباح نے تیل کی قیمتیں کم رکھ کر عراق کی معیشت کو ناقابل تلافی نقصان پہنچایا ہے۔ حالانکہ اسے بلین ڈالر کا جنگی قرضہ ادا کرنا ہے۔ کویت کی طرف سے تیل کی پیداوار گھٹانے اور اوپیک کی طرف سے ختم نہیں کیا۔ اس کے مشیروں میں سے بعض نے اسے سمجھایا کہ کویت و عراق کا کوٹہ اکٹھا کرنے اور تیل کی نئی قیمت 30 ڈالر فی بیرل مقرر کرنے سے اسے ہر سال بلین ڈالر کی اضافی آمدنی ہو گی۔ اس طرح نہ صرف وہ اپنے ترقیاتی بجٹ کو دگنا کر سکے گا بلکہ چار سال کے اندر اندر سارے قرضے بیباق ہو جائیں گے۔ علاوہ ازیں عراق کے ساحل میں جو اس وقت محض میل لمبا تھا، توسیع کر کے اسے میل تک بڑھا سکے گا۔ اور یوں اس کی رسائی گہرے پانیوں والی ایک بندرگاہ تک ہو جائے گی۔ ان جملہ اقدامات کی اصل غرض و غایت کویت کو ہڑپ کرنا تھا۔

ڈی آئی اے (ڈیفنس انٹیلی جنس ایجنسی) نے اپنی ایک خفیہ فائل میں صدام کو ایک نامعقول شخص (Irrational) قرار دیا تھا۔ اسرائیلی انٹیلی جنس موساد کا تجزیہ یہ تھا کہ "وہ ایک قسم کے مالیخولیا میں مبتلا ہے۔" اسے ایک "جنونی اور خبطی" کہہ کر نظرانداز کرنا درست نہیں، تاہم حملہ سے پیشتر سال بھر وہ عجیب و غریب حرکتیں کرتا رہا۔ مصر کے صدر حسنی مبارک نے ایک امریکی سینٹر کو بتایا کہ ایک ملاقات کے دوران صدام حسین اسے ایک طرف لے گیا اور مصر، شام اردن اور عراق کے فوجی اتحاد کی تجویز پیش کی، جس کا خلاصہ یہ تھا کہ چاروں ملک دھڑا دھڑ اسلحہ جمع کریں اور موقع پا کر کویت کے ساتھ ساتھ سعودی عرب (جس کے ساتھ عراق نے عدم مداخلت کا معاہدہ کر رکھا ہے) کے بھی ٹکڑے ٹکڑے کر دیں۔ کامیابی کی صورت میں مصر کو ملین ڈالر بطور مال غنیمت ملیں گے۔ حسنی مبارک نے وہ تجویز شکریہ کے ساتھ مسترد کر دی۔ ایک اور موقع پر اس نے مصر کو پیشکش کی کہ یمن اور سعودی

عرب کے جنوبی صوبوں پر قبضہ کرنے میں وہ اس کی مدد کو تیار ہے۔ اسی طرح اس نے اردن کے شاہ حسین کو جزیرہ نمائے عرب کے مغربی حصہ پر قبضہ کرنے کی ترغیب دی۔ بعد ازاں، سعودی ذرائع کے مطابق، اس نے پلٹا کھایا شاہ فہد کا قرب اور اعتماد حاصل کیا۔ ایک ملاقات میں ان سے کہا کہ خلیج کے چھوٹے چھوٹے ملکوں کا وجود بے معنی ہے۔ اس نے شاہ کے سامنے اپنے اس عزم کا اظہار کیا کہ عراق جلد ہی کویت پر قبضہ کر لے گا۔ سعودی فرمانروا اس کی یہ بات سن کر حیرت میں ڈوبنے لگے تو اس نے قطر سعودی عرب کو دینے کی پیشکش کی۔

اس کے عرب ساتھیوں نے ان باتوں کو کبھی سنجیدگی سے نہیں لیا۔ یہاں تک کہ پانی سر سے گزر گیا۔ البتہ اس کے عراقی ساتھیوں نے ان معاملات کو سنجیدہ سمجھا۔ وہ بخوبی سمجھتے ہیں کہ ان کی زندگیوں کا انحصار اس بات پر ہے کہ صدام کو من مانی کرنے دو۔ انہوں نے نہ کبھی اسے چیلنج کیا، نہ کوئی بری خبر سنائی۔

بغداد کی روایات کے مطابق ایران، عراق جنگ کے دوران ایک وزیر صحت سے یہ تجویز کرنے کی حماقت سرزد ہو گئی کہ صدام کو کچھ عرصہ کیلئے اپنے منصب سے الگ ہو جانا چاہیے۔ اس کی یہ جسارت صدام کے علم میں لائی گئی تو ڈکٹیٹر نے ذاتی طور پر اسے گولیوں سے چھلنی کر دیا۔ لاش کے ٹکڑے سیاہ کینوس کے بیگ میں ڈال کر اس کی بیوی کو بھجوا دی۔ خدا جانے یہ کہانی سچی ہے یا جھوٹی، بہر حال ایسی کہانیوں کا یہ نتیجہ ضرور نکلتا ہے کہ مشیروں اور وزیروں میں اسی قسم کی فریب کاری کی اصلاح تو کجا، اس پر انگشت نمائی کی ہمت نہیں ہو رہی تھی۔ ان مشیروں میں سے ایک جس کا نام محمد اعشاط ہے، امریکہ میں عراق کا سفیر تھا وہ اپنے تاریک سفارتخانہ میں نہ ٹوٹنے والی سگریٹ نوشی کرتا رہتا تھا۔ اس نے یکے بعد دیگرے کئی تاریں دے کر خبردار کیا کہ امریکہ اور اسرائیلی ابلاغ عامہ ہاتھ دھو کر صدام کے پیچھے پڑ گئے ہیں۔ اس نے بعد میں بتایا کہ "مجھے یہ شک پڑنے لگا تھا کہ عراق کو غیر مستحکم کرنے کے لئے کسی سازش کے تانے بانے بنے جا رہے ہیں۔ ورنہ چھوٹی سی ریاست کویت کو اس طرح گردن اکڑانے کی جرات نہیں ہو سکتی تھی"

کویت اور عراق کے مابین گذشتہ 30 برس سے بلی اور چوہے کا کھیل جاری ہے۔ عراق

وقفے وقفے سے پنجے مارتا رہا اور کویت انہیں سہتا رہا۔ دونوں کے درمیان تازہ جھڑپ میں عراق نے شکایت کی کویت نے اس کے الرمیلا آئیل فیلڈ سے، جو کہ عراق کویت سرحد پر واقع ہے، ایران، عراق جنگ کے زمانہ میں وہاں سے 2.4 بلین ڈالر مالیت کا تیل چوری کر لیا ہے۔ علاوہ ازیں وہ اوپیک کے مقرر کردہ کوٹہ سے زیادہ تیل نکال کر تیل کے عالمی نرخ نیچے لانے میں معاونت کرتا رہا ہے۔ عراق نے مطالبہ کیا کہ کویت اس کی تلافی کے لئے 13 تا 15 بلین ڈالر بطور ہرجانہ ادا کرے۔ صدام نے یہ الزام بھی لگایا کہ ایران عراق جنگ کے دوران شمال کی طرف اپنی سرحد میں 45 میل کی توسیع کر لی ہے اس سے الرمیلا آئیل فیلڈ اسی کے علاقہ میں چلا گیا۔ عراق نے پرانی سرحدیں بحال کرنے کا مطالبہ کیا تاکہ الرمیلا اسے واپس مل سکے۔ بعد ازاں اس نے کویت کے دو جزیروں (نوبیان اور داربہ جن کا مجموعی رقبہ نو مربع کلو میٹر ہے) کو لمبی مدت کے لئے پٹہ لینے کی خواہش ظاہر کی تاکہ کسی رکاوٹ کے بغیر اسے خلیج فارس تک بحری راستہ مل جائے۔ ان پر مستزاد اس کا یہ مطالبہ تھا کہ کویت 10 بلین کا وہ قرضہ معاف کر دے جو اس نے ایران کے ساتھ نبرد آزمائی کے دنوں میں لیا تھا۔ مصر کی کوششوں کے نتیجہ میں دنوں کے مابین نجی مذاکرات ہوئے، لیکن کویتیوں نے بڑا سخت موقف اختیار کر لیا۔ صدام کی احسان فراموشی پر وہ غیظ و غضب کا مظاہرہ کرنے لگے، کیونکہ وہ کویت ہی تھا جس نے ایران کے خلاف جنگ میں اسے کروڑہا ڈالر کی مالی امداد دی تھی۔ ان کا یہ خیال بھی تھا کہ عراق ابھی ابھی ایران کے ساتھ لڑائی سے فارغ ہوا ہے۔ اس میں نئی جنگ لڑنے کی سکت ہے نہ حوصلہ۔ پھر بھی امریکیوں کو توقع تھی کہ حسب معمول دونوں سے بعض مراعات کا تبادلہ کرنے سے معاملہ ختم ہو جائے گا۔ ان کی رائے تھی کہ صدام حسین دلائل سے قائل کیا جا سکتا ہے۔ لیکن بات نہ بنی اور مسئلہ دن بدن سنگین ہوتا گیا۔ واشنگٹن کا صدام کے ساتھ رویہ اب بھی عمدہ اور شریفانہ تھا۔ حالانکہ انسانی حقوق کی پامالی کے سلسلہ میں عراق کا خوفناک ریکارڈ، کیمیائی ہتھیاروں کی لڑائی کے تجربات، امریکہ کے شارک نامی جہاز پر ایگزوسیٹ میزائلوں سے حملہ جس میں 37 ملاح ہلاک ہو گئے تھے اور ایٹمی ہتھیاروں کے حصول کے لئے اس کی دوڑ دھوپ جیسے اقدامات کسی اور سلوک کا تقاضا کرتے تھے۔ بش

انتظامیہ ان باتوں سے صرف نظر کرتے ہوئے صدام حسن کے قدو قامت کو بڑھانے میں مدد دیتی رہی۔ گلاسپی اس رائے کی حامل تھی کہ "اس شخص کو یکہ و تنہا کرنے کے بجائے اس گفت و شنید کرنا اور افہام و تفہیم سے کام لینا بہتر ہوگا۔" بہت سوں نے اس خیال سے اتفاق کیا۔ گذشتہ اپریل میں جب امریکی سینیٹروں کے ایک گروپ سے خطاب کرتے ہوئے امریکہ کی سازشوں کو بے نقاب کیا تو سینیٹر رابرٹ ڈول نے کہا تھا "ان سازشوں میں بش شامل نہیں ہیں، انہوں نے ابھی کل ہی ہمیں یقین دلایا ہے کہ وہ ایسی کارروائیوں کے خلاف ہیں" سینیٹر ایلن سمپس کا کہنا ہے کہ صدام کا اصل مسئلہ "مغرب کی خودپسندی پر مبنی" رپورٹیں ہیں۔

ایسی کوششوں سے صدام کا غصہ ٹھنڈا نہیں ہوا۔ اس کے پس منظر میں اعشاط جیسے شاطر سفارتکار کی یہ قیاس آرائیاں کارفرما تھیں کہ جس طرح امریکہ نے قبرص پر ترکی کے حملہ کے وقت، تبت پر چین کی یلغار کے موقع پر اور افغانستان میں روسی ریچھ کی مداخلت کے دوران کوئی فوجی دخل اندازی نہیں کی تھی، اسی طرح عراق کو اس کی طرف سے کسی مداخلت کا خدشہ نہیں روک سکتا۔ صدام نے دیو قامت کے تناسب سے بہتر بڑا جھوٹ بول کر ہر ایک کو یہ باور کرانے کی کوشش کی کہ وہ اس سال کسی پر حملہ آور ہونے کا ارادہ نہیں رکھتا۔ اس کی یہ دروغ گوئی کامیاب رہی۔

25 جولائی کو صدام نے امریکی سفیر گلاسپی کو اپنے محل میں بلایا دو سال پیشتر تقرری سے لے کر اب تک وہ ایک بار بھی ڈکٹیٹر سے نہیں مل سکی تھی۔ گفتگو کے دوران اس نے وزارت خارجہ اور سی آئی اے پر الزام لگایا کہ انہوں نے اس کے خلاف اقتصادی جنگ شروع کر رکھی ہے اور یہ کہ وائٹ ہاؤس تیل کے نرخ کم کرانے میں کویت کے ساتھ سازش میں شریک ہے۔ اس نے بڑے جارحانہ انداز میں کہا "تمہارا معاشرہ ایسا ہے کہ ایک ہی معرکہ میں دس ہزار لاشیں قبول نہیں کر سکتا" اس نے خبردار کیا کہ امریکہ کو اپنے دوستوں اور دشمنوں کے انتخاب میں ہوشمندی سے کام لینا چاہیے۔

سفیرہ نے جو عام طور سے بڑی صاف گو، وفادار اور آداب سفارتکاری کی سختی سے پابند تھی، سفارتی ضوابط کو ملحوظ رکھا جو اب خوشامد اور چرب زبانی کا تقاضا کر رہے تھے، اس نے ڈکٹیٹر کو بتایا "صدر بش نے مجھے براہ راست ہدایات دی ہیں کہ عراق کے ساتھ بہتر تعلقات قائم کیے جائیں" جب اس نے کہا کہ امریکہ کو کویت کے بارڈر پر عراقی فوج کی نقل و حرکت پر تشویش ہے تو صدام نے یقین دلایا کہ وہ اپنے دیگر عرب ساتھیوں کے ساتھ صورتحال پر صلاح مشورہ کیے بغیر کوئی قدم نہیں اٹھائے گا اس نے اپنے سامنے پڑے ہوئے فون کا ریسور اٹھایا اور مصر کے حسنی مبارک کے ساتھ گفتگو میں اپنا وہی سفید جھوٹ دہرایا۔ گلاسپی نے عراقی لیڈر کو مطلع کیا کہ وہ اپنے پروگرام کے مطابق گرمیوں کی چھٹیاں گزارنے وطن جا رہی ہے۔

سیکرٹری آف سٹیٹ جیمز بیکر کے اعلیٰ معاونین نے دوسروں تک یہ بات پہنچائی کہ صدام کے ساتھ ملاقات میں ہونے والی گفتگو کی نقل کے مطالعہ سے انہیں زبردست دھچکا لگا تھا۔ گلاسپی کو دی گئی ہدایات قبل از وقت کیوں تبدیل نہیں کی گئیں۔ گلاسپی کے طرف داروں میں سے ایک نے وضاحت کی "یہ الزام بدل کر لائن کے نچلے حصہ پر آتا تھا، اس لئے بیکر اپنی ساکھ قائم رکھتے ہوئے تعاون جاری رکھ سکتا تھا۔ یہ نظام اسی طریقہ سے قائم ہے اور ہر شخص اسے بخوبی سمجھتا ہے۔ تاہم برطانیہ میں اس سے مختلف نظام رائج ہے۔ مثال کے طور پر ارجنٹائن نے مارگریٹ تھیچر کو چکمہ دے کر جزائر فاک لینڈ پر ہلہ بول دیا تو تھیچر کے وزیر خارجہ لارڈ کیرنگٹن نے ساری ذمہ داری اپنے سر لے لی اور اپنے قصور کا اعتراف کرتے ہوئے منصب سے علیحدہ ہو گیا۔ امریکہ کے قواعد و ضوابط کی رو سے ساری ملامت کی مستحق گلاسپی ٹھہری۔ صدام کے ساتھ اس کی بات چیت کے بعد محکمہ خارجہ نے بش کی طرف سے بغداد کو ایک تار بھیجا، جس میں یقین دلایا گیا تھا کہ امریکہ خلیج کے علاقہ میں اپنے دوستوں کا پورا پورا ساتھ دے گا۔ اور ان کے مفادات کا تحفظ کرے گا اس مراسلہ میں عراق کو کویت پر حملہ سے باز رہنے کے متعلق کوئی وارننگ نہیں دی گئی تھی۔

انتظامیہ نے صدام کو روکنے کا سنہری موقعہ ضائع کر دیا یہاں تک کہ اس کے ٹینک اور فوجی دستے کویت شہر کے قرب و جوار میں پہنچ گئے۔ حملہ سے دو دن پہلے محکمہ خارجہ اور وائٹ ہاؤس کے اعلیٰ حکام نے سودرڈ برمن کو چار مرتبہ فون کیا کہ وہ اس بل پر رائے شماری کو ملتوی

کرا دے جو اس نے ایوان میں عراق کے خلاف تجارتی پابندیوں کے بارے میں پیش کیا تھا اب وہ الزام لگاتا ہے کہ "انتظامیہ نے کانگریس کو پابندیاں عائد کرنے سے باز رکھنے پر جو وقت صرف کیا، اتنا وقت صدام کو کویت پر حملہ سے باز رکھنے میں صرف نہیں کیا تھا۔" برمن ایک کٹر ڈیموکریٹ ہے تاہم اس کا یہ الزام سوہان روح اور موجب شرم و خجالت ہے۔

حملہ سے کچھ دیر ہی پہلے امریکہ کے ایک جاسوسی سٹلائٹ نے کویت کی سرحد پر عراق ایک لاکھ افواج کی نقل و حرکت کی تصویریں لے لی تھیں۔ صدام نے افواج کی تعداد بڑھا سہ گنا کر دی تھی۔ ان تصویروں میں ایک "لاجسٹک ٹرین" بھی دکھائی گئی جس پر ہر وہ چیز موجود تھی جس کی حملہ کے وقت ضرورت پڑ سکتی تھی۔ اس نے اپنے اقدام کو پردہ اخفا میں رکھنے کے لئے کچھ نہیں کیا تھا۔ امریکہ انٹیلی جنس کے حلقوں نے فرض کر لیا تھا کہ کویت ا تیل کی پالیسی سے متعلق شکایت میں تنگ کرنے کی بات سرا سر جھوٹ ہے۔ یہ انٹیلی جنس ا پالیسی کے مطابق ڈھالنے کا ایک مثالی معاملہ تھا، لیکن اس کے برعکس پالیسی کو انٹیلی جنس کے مطابق بنا دیا گیا۔ سی آئی اے، ڈی آئی اے، نیز سٹیٹ ڈیپارٹمنٹ کے بیورو آف انٹیلی جنس و ریسرچ سب نے یہی نتیجہ اخذ کیا کہ کوئی فوری اور سنگین خطرہ درپیش نہیں ہے۔

حملہ سے پہلے کے چند دنوں میں انٹیلی جنس ایجنسیوں نے صدر بش کو پیشگوئیوں کی ایک فہرست پیش کی جو حملہ کے غالب امکانات کی ترتیب سے تیار کی گئی تھی انٹیلی جنس کے ایک اہلکار سے، جس کی نظر سے وہ رپورٹیں گزری تھیں، افسوس کے ساتھ بتایا، کسی نے بھی پہلے انتخاب کے طور پر یہ پیش گوئی نہیں کی تھی کہ صدام حملہ کر دے گا۔ پہلی پیشگوئی یہ تھی کہ صدام جھوٹ بول رہا ہے۔

نمبر2 یہ کہ شاید وہ الرمیلا آئیل فیلڈ پر قبضہ کر لے جو کویت عراق سرحد پر واقع ہے اس بات کا امکان بھی ہے کہ وہ واربہ اور بوبیان کے جزیروں پر بلہ بول دے یہ دلدلی علاقے اس کی خلیج فارس تک رسائی میں رکاوٹ بنے ہوئے تھے۔ یہ مفروضہ بھی قائم کر لیا گیا کہ عراق ان جزیروں مع قبضہ مستحکم کرنے کے بعد واپس چلا جائے گا۔ پینٹاگون کے ایک سینیئر افسر نے بعد میں بتایا "ہم یہاں فون پر یہی سنتے رہے کہ اس کی فوج کے اجتماع کا مقصد محض تیل کی

قیمتوں میں اضافہ کیلئے دباؤ ڈالنے سے ہے۔ اگرچہ لوگ یہ کہہ رہے تھے کہ وہ واقعتاً کچھ کرنا چاہتا ہے اور حملہ کرنے والا ہے، لیکن ہمیں ان باتوں سے آگاہ نہیں کیا گیا۔

متعدد ٹیلیفونوں پر سنی جانیوالی آوازوں پر واقعی حملہ کی پیش گوئی کی گئی تھی لیکن کسی نے ان پر کان نہیں دھرا۔ مشرق وسطیٰ میں سی آئی اے کے ایک درمیانے اہلکار نے اسے درست سمجھا تھا، مگر مخالفت کرنیوالے بہت زیادہ تھے اس۔ لئے اس کی وارننگ نقار خانہ میں طوطی کی آواز ثابت ہوئی۔ میرین کور کے افسران اور سٹلائٹ سے لی گئی تصاویر سے، جن میں عراق کی ایئر ڈیفنس یونٹوں، ٹینکوں اور توپخانہ کی کویتی سرحد پر صف بندی ظاہر ہوتی تھی۔ یہی اندازہ لگایا گیا کہ یہ سب اقدامات حملہ کی نشان دہی کرتے ہیں، تاہم وہ بیورو کریسی کے دباؤ میں آ کر چپ ہو گئے۔ مشرق وسطیٰ کیلئے دفاعی انٹیلی جنس کے اعلیٰ ترین تجزیہ کار کو بھی یقین ہو گیا تھا کہ صدام حملہ کرنیوالا ہے۔ اس نے سینٹ کی انٹیلی جنس کمیٹی کو بتایا بھی تھا کہ ڈکٹیٹر خالی دھمکیاں نہیں دے رہا، وہ کچھ کرنے والا ہے۔ مگر کسی نے اس کی بات پر توجہ نہیں دی۔ ڈی آئی اے بھی دوسروں کے پیچھے لگ گئی۔

جس وقت عراقی اور کویتی وفود تیل کی قیمتوں اور سرحدی تنازعہ کے متعلق جدہ میں آخری بار مذاکرات کر رہے تھے، ایوان کی امور خارجہ کمیٹی نے جان کیلے، اسسٹنٹ سیکرٹری آف سٹیٹ برائے مڈل ایسٹ، کو یہ دریافت کرنے کیلئے طلب کیا کہ وہاں کیا ہو رہا ہے۔ چیئر مین لی ہملٹن نے سوال کیا "فرض کرو عراق کسی بھی وجہ سے کویت پر حملہ کر دیتا ہے تو امریکی افواج کے استعمال کے بارے میں ہماری پوزیشن کیا ہوگی۔ کیلے نے جواب میں کہا "جناب چیئرمین! یہ ایک فرضی اتفاق پر مبنی سوال ہے اور میں اس قسم کے سوالوں کا جواب نہیں دے سکتا" دوسرا سوال پوچھا گیا "آیا کوئی ایسا معاہدہ موجود ہے جو امریکہ کو طاقت کے استعمال کا پابند بناتا ہو" کیلے نے نفی میں جواب دیا جو درست تھا۔ اگرچہ ایران عراق جنگ کے دوران امریکہ نے انتہائی خطرناک مرحلہ پر کویت کے آئیل ٹینکروں کی حفاظت کیلئے اپنے لڑاکا بحری جہاز بھیجے تھے، لیکن ء کے بعد سے جب ڈین ایچسن نے اعلان کر دیا تھا کہ جنوبی کوریا امریکہ کے ایشیائی سلامتی کے حلقہ میں شامل نہیں محکمہ خارجہ نے اپنی دوست اقوام کو بیرونی

جارحیت کیلئے کھلا چھوڑ رکھا ہے۔ پھر بھی صدام حسین کے ارادوں کے متعلق کیلئے کو جو معلومات موصول ہوئیں، ان کی روشنی میں اس کی کارکردگی حیران کن نہیں تھی۔ عرب زعماء اصرار کر رہے تھے کہ صدام حملہ نہیں کرے گا۔ یہاں تک کہ کویت کی فوج کو جو پہلے الرٹ تھی، نارمل حالت میں لے آیا گیا۔

اس کے دوران بعد جان کیلئے محکمہ خارجہ کی چھ منزلہ عمارت میں واقع اپنے کمرہ میں بیٹھ عراقی سفیر کو گھور کر دیکھ رہا تھا۔ اعشاط اس سے شکایت کرنے آیا تھا۔ "ہمارا قومی وجود معرض خطر میں پڑ گیا ہے۔ ہمیں فوجی کاروائی کرنے پر مجبور کیا جا رہا ہے۔" اس کے اس تجاہل عارفانہ پر کیلئے آپے سے باہر ہو گیا۔ اس نے عراقی سفارت کار کی بات کاٹتے ہوئے کویت سے عراقیوں کے انخلاء کا مطالبہ کیا۔ شکایت لے کر آنیوالا اپنا سا منہ لے کے رہ گیا۔ اس نے کیلئے کی طرف معنی خیز نظروں سے دیکھا تاہم منہ سے کچھ کہے بغیر اٹھ کر چلا گیا۔

عراق کو کویت پر قبضہ کرنے میں پورا ایک دن بھی نہ لگا امریکہ کی فوج قریب ترین وطن سے میل دور، بحر ہند کے جزیرہ ڈیگو گارشیا میں تھی۔ وہاں ایم پی ایس۔ پانچ کارگو جہازوں پر مشتمل جو سکواڈرن مقیم تھا وہ ، افراد کے بحری بریگیڈ کو دن کی لڑائی کیلئے بخوبی سازو سامان فراہم کر سکتا تھا۔ تاہم جون میں جب صدام کے عزائم کی بابت حوصلہ افزا رپورٹیں ملیں تو ان میں سے ایک جہاز کو سروس اور ضروری دیکھ بھال کیلئے واپس نارفوک بھیج دیا گیا۔ جولائی کے آخر میں جبکہ طوفان نقطۂ عروج پر تھا۔ ایک اور جہاز کو ایسے ہی مشن پر روانہ کر دیا گیا۔ جب صدام نے کویت شب خون مارا۔ آخر الذکر جہاز جنوبی افریقہ کے پانیوں میں گھوم رہا تھا اسے اپنی منزل پر پہنچنے کیلئے کئی مہینے کی مدت درکار تھی۔ امریکہ نے غلط سمت کو رخ کر لیا تھا۔

ریت میں لکیر کھینچ دی گئی

عراق افواج قاہرہ کا ہراول دستہ 2 اگست کو صبح دو بجے کویت کی سرحد میں داخل ہوا۔ بارڈر پر واقع کسٹمز کے ایک شیڈ کو گرانے اور ابدالی میں ایک گیس سٹیشن کو تہ و بالا کرنے کے بعد عراقیوں نے سوپر ہائی وے پر چھ قطاروں میں شہر کویت کی طرف مارچ کیا۔ جو وہاں سے

80 میل کی مسافت پر تھا۔ رات کی تاریکی اور خاموشی میں کو۔تیوں نے توپوں کی گڑگڑاہٹ اور مشین گنوں کی تڑتڑ سنی تو ہڑبڑا کر اٹھے۔ کھڑکیوں سے باہر جھانک کر دیکھا تو صدام حسین کے جیٹ اور ہیلی کاپٹر فضا میں اڑتے نظر آئے۔ ٹینکوں اور توپوں کی گولہ باری سے پورا شہر لرز رہا تھا۔ طیاروں کے شور نے فضا کو اور بھی خوفناک بنا دیا تھا۔ امیر کویت کے داسماں پیلس پر چند راکٹ پھینکے گئے تو وہ صدام کے موقع سے پہنچنے پر صرف چند منٹ پہلے دوڑ کر اپنے چاپر (Chopper) میں سوار ہوا اور سعودی عرب کو پرواز کر گیا۔ ٹینکوں نے چند لمحوں میں سنٹرل بنک سمیت شہر کی بڑی بڑی عمارتوں کو تباہ و برباد کر دیا۔ کویت کا زیادہ تر زر نقد اور سونے کی اینٹیں سنٹرل بنک کی تحویل میں تھا۔ وہ سب عراقیوں کے ہاتھ لگا۔ وزارت اطلاعات میں واقع ریڈیو اور ٹیلی ویژن بھی گولہ باری کا نشانہ بنے۔ فضا میں ایک دردناک آواز گونجی "ہماری مدد کو جلد پہنچو" اس کے بعد ٹرانسمیٹر بند ہو گیا۔

صدر بش اسی وقت سات ہزار میل کی مسافت اور مغرب میں وقت کے آٹھ زونوں کے فاصلے پر وائٹ ہاؤس کے فیملی کوارٹروں میں بیٹھا ہوا تھا۔ صبح آٹھ بجے کا عمل تھا جب اچانک اس کے فون کی گھنٹی بجی، دوسری طرف سے نیشنل سیکورٹی کا ایڈوائزر برنیٹ سکوکرافٹ بول رہا تھا۔ سی آئی اے کی رپورٹیں اب بھی یہی کہہ رہی تھیں کہ صدام کویت میں مداخلت کا ارادہ نہیں رکھتا۔ تاہم جلد ہی پتہ چل گیا کہ وہ کویت کو ہڑپ کرنے کے درپے ہے۔ بش کئی ہیجانی اجلاسوں میں شرکت کے بعد چند گھنٹوں کے لئے سو گیا۔ اگلے روز صبح 5 بجے کے قریب سکوکرافٹ اپنی خوابگاہ کے دروازہ پر کھڑا تھا۔ اس کے ہاتھ میں دو انتظامی حکم تھے۔ جن کے مطابق امریکہ میں عراق اور کویت کے جملہ اثاثے منجمد کر دیئے گئے تھے۔ آدھ گھنٹہ بعد صدر بش اوول آفس میں سکوکرافٹ کے ساتھ اس نوع کے فوری مسائل پر تبادلہ خیال کر رہا تھا کہ اتحادیوں کو اثاثے منجمد کرنے کے کام میں وسعت پیدا کرنے کی ترغیب کیسے دی جائے۔ اسرائیلیوں کو کیسے چپ کرایا جائے اور سوویت یونین کو اپنا ہم خیال کیسے بنایا جائے!

دونوں نے اس حملہ کے نتیجہ میں امریکی قیادت کو سرد جنگ کے بعد، زبردست چیلنج کا

خطرہ محسوس کیا۔ زیر بحث یہ سوال تھا کہ اس خطرہ سے کیسے نمٹا جائے؟ اسی صبح سیکورٹی کونسل کے اجلاس سے قبل بش اخبار نویسوں کے سامنے دوبارہ یہ اعلان کر چکا تھا کہ امریکی افواج کو استعمال کرنے کا کوئی منصوبہ زیر غور نہیں۔ پریس والے رخصت ہو گئے تو صدر نے اپنے اعلیٰ فوجی و سیاسی مشیروں کی طرف دیکھا اور ان سے پوچھا "اگر ہم کچھ نہ کریں تو کیا ہوگا؟ جبکہ صدام نے ایک پوری قوم کو ہائی جیک کر لیا ہے" اجلاس ملتوی کرتے ہوئے بش نے فیصلہ کن انداز میں کہا۔ "ہمیں اس کارروائی کو لازماً الٹنا ہوگا۔" اس موقع پر اس نے بعض قریبی نائبوں سے یہ بھی کہا کہ فی الحال میرا ذہن اس بارے میں صاف نہیں ہے کہ صدام کو نکالنے کے لئے کیا کرنا پڑے گا۔"

صدام کی یلغار نے انتظامیہ کو ایسے موقع پر اپنی طرف متوجہ کر لیا جب وہ جرمنی کے دوبارہ اتحاد اور گورباچوف کو درپیش مشکلات جیسی اہم سیاسی مصروفیات میں الجھی ہوئی تھی۔ بش سکوکرافٹ اور سیکرٹری آف سٹیٹ سب کچھ بھول بھلا کر کویت کے مسئلہ میں پھنس گئے۔ بش کا اس سے پہلا پورا ہفتہ سپریم کورٹ کے ولیم برنیان کے جانشین کی نامزدگی کے پیچیدہ کام میں گزرا تھا۔ اسے کسی فیصلہ پر پہنچنے کے لئے سوچنے کا وقت درکار تھا بعد ازاں اسی روز اسے آسپن کولو جانا پڑا جہاں ایک تقریب میں مشرق و مغرب کے تعلقات پر تقریر کرنی تھی۔ مغرب کی طرف پرواز کے دوران اس نے سعودی عرب کے شاہ فہد اور مصر کے صدر حسنی مبارک سے فون پر بات کی۔ صدام نے ان دونوں کو اندھیرے میں رکھا تھا۔ فہد کو جب ان کے خدام نے بستر استراحت سے جگا کر حملہ کی خبر سنائی تو انہوں نے بڑبڑاتے ہوئے کہا "کیا تمہیں پورا یقین ہے کہ حملہ ہو چکا ہے؟" حسنی مبارک کا فوری ردعمل یہ تھا کہ "مجھے اس خبر سے زبردست دھچکا لگا ہے" یہ دونوں عرب رہنما ابھی تک جارحیت کا کوئی عرب حل تلاش کرنے کے لئے ہاتھ پاؤں مار رہے تھے۔ کسی نے بھی امریکی افواج بلانے کے بارے میں نہیں سوچا تھا۔

حملہ کی خبر نشر ہونے کے بعد بش پہلی بار منظر عام پر آیا تو وہ قدرے سکتہ کی حالت میں تھا۔ مغرب کا دورہ کرنے کے بعد اس کے ارادہ میں پختگی و مضبوطی پیدا ہوئی۔ اتفاق سے

برطانوی وزیر اعظم مارگریٹ تھیچر بھی آسپن میں موجود تھیں۔ انہیں یہ خبر گذشتہ رات برطانیہ میں امریکہ کے سفیر ہنری کیسٹو کے پہاڑی مہمان خانہ میں دوران قیام مل چکی تھی۔ وہ صدام کے عزائم کو پوری طرح بھانپ گئی تھیں۔ انہوں نے بش سے کہا "اسے لازماً لگام دینی چاہئے" دونوں رہنماؤں کے مابین دو گھنٹے تک خفیہ مذاکرات ہوئے۔ تھیچر نے اس بات پر زور دیا کہ صدام کو یہ احساس دلانے کی کہ وہ جوابی کارروائی سے نہیں بچ سکتا۔ ایک ہی صورت ہے کہ کسی تاخیر کے بغیر فوجیں بھیج دی جائیں "فرانس کے بارے میں فکر نہ کریں" معاملہ نے سنگین صورت اختیار کر لی تو آپ اسے اپنے ساتھ پائیں گے۔" امریکہ و برطانیہ کے خصوصی تعلقات نے پہلے ہی مرحلہ میں ایسی بنیاد فراہم کر دی جس پر بش کے لئے بین الاقوامی کولیشن کی تعمیر آسان ہو گئی۔ برطانیہ کے سینیئر حکام میں سے ایک نے جو وہاں موجود تھا بعد میں بتایا "وہ کوئی منوں گری نہیں تھی اس روز صدر بش کو سکون بخش دوا دی گئی تھی۔" تاہم جو کچھ وقوع پذیر ہوا تھا، اس پر جو کمزور سا ردعمل سامنے آیا تھا، اس ملاقات نے اس کی تلافی کر دی۔ دو بڑوں کے مابین حائل ساری الجھنیں دور ہو گئیں۔ دونوں نے کشتی دریا میں ڈال دینے کا حتمی ارادہ کر لیا تھا۔

واشنگٹن واپس پہنچنے پر صدر نے اگلی صبح کابینہ کے کمرہ میں نیشنل سیکورٹی کونسل کا اجلاس طلب کیا انہوں نے سوال کیا "ہمارے مفادات کیا ہیں؟" مشیروں نے یکے بعد دیگرے تمام اہم مفادات کا ذکر کیا، تیل کی فراہمی رک جانے کا خطرہ، صدام کا ایٹمی ہتھیاروں کو فروغ دینے کا پروگرام، اسرائیل کا تحفظ، امریکی قیادت کے داؤ پر لگ جانے کا اندیشہ، حالانکہ اب وہ دنیا کی واحد سوپر طاقت رہ گئی ہے۔ وغیرہ سبھی مسائل زیر غور آئے۔ یہ خطرات حقیقی تھے۔ ذہانت و جرات کے ساتھ ان کا مقابلہ کرنے کی نسبت ان کا تعین کرنا زیادہ مشکل تھا۔

اس سلسلے میں پہلی مشکل اس امر کا یقین حاصل کرنا تھا آیا صدام کی نظر میں عرب خود اپنے دفاع پر کمربستہ ہیں یا نہیں؟ "عرب قومیت" جس کے ساتھ ان سب کی وفاداری اور لگاؤ بڑا پختہ ہے، ریاست کی حقیقت سے کہیں زیادہ ایک ذہنی کیفیت کا نام ہے۔ مشرق وسطیٰ

میں فوجوں کی صف آرائی کے روایتی فن سے دولتمند عربوں کے نزدیک محض ڈاکوؤں کو کچھ دے دلا کران سے گلوخلاصی کرانا مراد ہوتا ہے اس وقت وہ روایت کار آمد ثابت نہ ہوتی اسی روز دوپہر کے بعد پینٹاگون کے مشرقی ونگ کے اندرونی خفیہ حصہ میں امریکہ میں متعین سعودی سفیر شہزادہ بندر بن سلطان امریکہ کے وزیر دفاع ڈک چینی اور جنرل کولن پاول چیئرمین جائنٹ چیفس آف سٹاف، کے ساتھ ایک چھوٹی کانفرنس ٹیبل پر بیٹھا مذاکرات کر رہا تھا۔ معزز سفیر نے کہا کہ امریکہ صدام کو نکالنے سے جو کچھ مراد لیتا ہے سعودی خاندان کو اس پر شک ہے، اس نے یاد دلایا کہ اس سے پہلے مشرق وسطیٰ میں ایک خلفشار کے موقع پر صدر جمی کارٹر نے مملکت سعودیہ کے تحفظ کے لئے صرف ایک درجن غیر مسلح ایف-15 طیارے بھیجے تھے۔ اس دفعہ کوئی پاگل ہی ایسی برائے نام امداد قبول کرے گا۔ شاہی خاندان فوجی امداد قبول کرنے کی مقبولیت پر پہلے ہی ردوقدح جاری ہے۔ شاہ فہد کو ایسے کمزور مظاہرہ سے کوئی دلچسپی نہیں تھی جو صدام کو مہمیز لگانے کا سبب بنے۔ کیا امریکہ نے فی الواقع اسے لگام دینے کا فیصلہ کر لیا ہے؟

ڈک چینی اور پاول نے شہزادہ کو قومی تحفظ کے لئے مخفی فوجی پلان دکھائے جو پینٹاگون نے عراق کے متوقع حملہ کے خلاف سعودی عرب کے دفاع کی خاطر تیار کئے تھے، یہ بنڈل قدرے گرد آلود تھا کیونکہ وہ شیلف پر کئی برسوں سے رکھا ہوا تھا۔ ایک پلان میں تجویز کیا گیا تھا کہ بوقت ضرورت تین ڈویژن فوج، ایک ائیر ونگ اور ایک کیریئر ٹاسک فورس خلیج میں تعینات کی جائے گی۔ چینی نے سعودی سفیر کو بتایا کہ صدر نے ابھی تک صف بندی کی اجازت نہیں دی تاہم بتدریج اس طرف مائل ہو رہا ہے۔ اس انکشاف نے شہزادہ کو بڑا متاثر کیا۔ اس نے مسرت کا اظہار کرتے ہوئے کہا "اگر امریکہ واقعی کچھ کرنے کے موڈ میں ہے تو شاہی خاندان امریکی افواج کا خیر مقدم کرے گا۔"

شام کو پانچ بجے صدر نے قومی سلامتی کونسل کا دوسرا اجلاس بلایا۔ حملہ کی بابت پیشگوئیاں غلط ہو جانے کے باعث اب سی آئی اے کوئی قسمت آزمائی نہیں کر رہی تھی۔ ڈائریکٹر ولیم ویبسٹر بڑی شد و مد سے دعویٰ کر رہا تھا کہ صدام دوسرا حملہ کرنے والا ہے۔ محکمہ

دفاع کے تجزیہ کار کے ساتھ ساتھ ایجنسی نے بھی اطلاع دی کہ عراق کی منتخب فوج جنوب میں سعودی سرحد کی طرف پیش قدمی کر رہی ہے سی آئی اے کا اندازہ یہ تھا کہ صدام مشرقی سعودی عرب میں واقع تیل کے کنوؤں پر قبضہ کرنا چاہتا ہے اور یہ کہ سعودیوں میں لڑ کر اسے پیچھے دھکیلنے کی ہمت و طاقت نہیں۔

بعض سینئر سیاسی اور فوجی مشیروں نے اس تجزیہ سے اتفاق نہیں کیا۔ تاہم یہ بات صدر کے دل کو لگی، اس نے سی آئی اے کی ہاں میں ہاں ملاتے ہوئے کہا۔ میں اس نتیجہ پر پہنچ چکا ہوں کہ "صدام کا اگلا قدم سعودی عرب پر قبضہ کرنا ہوگا۔ تیل کی سپلائی میں رکاوٹ پڑنے کا خطرہ صاف نظر آرہا ہے۔ عراق اور کویت میں موجود جملہ امریکی خطرہ میں ہیں۔ امریکہ ایسی مہم جوئی سے چشم پوشی نہیں کر سکتا جس سے مڈل ایسٹ کا نقشہ بدل جائے گا اور عالمی معیشت کو زبردست دھچکا لگے گا" یہ محسوس کرتے ہوئے کمانڈر انچیف طاقت کے استعمال پر آمادہ و کمربستہ ہے۔ پاول نے مشورہ دیا کہ "ریت میں ایک لکیر کھینچ دی جائے" اس نے مزید کہا۔ "امریکہ کو زیادہ فوجیں بھیجنے کی ضرورت نہیں پڑے گی، تاہم ہمیں اس قدر افواج ضرور بھیجنی ہوں گی، جنہیں دیکھ کر وہ جان لے کہ اگر اس نے سعودی عرب پر حملہ کیا تو اسے امریکہ کے خلاف تصور کیا جائے گا۔ بعض دوسرے مشیروں نے صدر سے دریافت کیا آیا وہ یہ فیصلہ کرنے کو تیار ہیں کہ "کونسی فوجیں بھیجی جائیں گی؟" بش نے جواب دیا "مجھے یقین نہیں کہ ایسے فیصلے کرنے کے لئے میرے پاس کافی معلومات موجود ہیں۔" اس نے جائنٹ چیفس کو حکم دیا کہ اگلی صبح وہ کیمپ ڈیوڈ میں اس سے ملے تاکہ متبادل صورتوں پر سوچ بچار کر سکیں۔ ملاقات کے اختتام پر اس نے کہا۔ میں نے فیصلہ کیا ہے کہ ہمیں خلیج میں جانا چاہئے۔"

کیسٹاک ٹینز کے لئے میرین کور کے ہیلی کاپٹر میں سوار ہونے سے پہلے بش نے ایک عرب ملاقاتی کو بتایا۔ "اگر سعودی عرب نے امداد مانگی تو میں اسے امداد دونگا اور یہ امداد اسے وسیع پیمانہ پر دی جائے گی کہ صدام کی آنکھیں کھل جائیں گی۔" اگلی صبح کیمپ ڈیوڈ کے آسپن لاج میں صدر اور اس کے آدمیوں نے وہ لائحہ عمل طے کیا جو بالآخر انہیں جنگ کی طرف لے گیا۔ بیکر نے سفارت کاری کی مشین کو پہلے ہی چالو کر دیا تھا۔ حملہ نے اسے منگولیا میں شکار

کے دورہ پر جانے کا موقع فراہم کیا۔ ڈپلومیسی کی تیز دوڑ میں دنیا ہ چکر لگاتے ہوئے ماسکو پہنچا جہاں اس نے روسی قیادت کو صدام کی مذمت اور ہتھیاروں کی فراہمی بند کرنے پر آمادہ کر لیا۔ اگر برطانیہ کے ساتھ امریکہ کی شراکت فائدہ مند تھی تو سوویت یونین کے ساتھ انتظامیہ کی اچھی ورکنگ ریلیشن شپ فیصلہ کن حیثیت کی حامل تھی جس نے عراق کو یکہ و تنہا کر دیا۔ دس سال پہلے ایسا سوچنا بھی محال تھا۔ اس چیز نے بحران کو سوپر طاقتوں کے مابین محاذ آرائی میں بدلنے سے بچالیا۔ اگلا قدم یہ تھا کہ اقوام متحدہ کو جارحیت کی مذمت کے پس منظر میں کسی عملی اقدام یعنی عراق کے خلاف اقتصادی پابندیوں اور بحری ناکہ بندی پر ابھارا جائے۔ بیکر کیمپ ڈیوڈ سے جلد ہی اگلے مشن پر روانہ ہوگیا تاکہ اپنی کاوشوں کی کامیابی کو یقینی بنا سکے۔

بیکر کی روانگی سے پہلے جنرل نارمن شوارزکوف آرمی کمانڈر برائے مڈل ایسٹ اور جان کیلے نے صدر بش اور اس کے آدمیوں کے آگے وہ فوجی امکانات پیش کئے کہ کتنی افواج دستیاب ہیں۔ وہ کتنی تیزی سے خلیج میں پہنچ سکتی ہیں۔ اس سلسلے میں سے اغلب کونسی رکاوٹ اور تاخیر پیش آسکتی ہے۔ انہوں نے صدر کو خبردار کیا کہ محض بحری و فضائی جہازوں کے بھیجنے سے کام نہیں چلے گا۔ زمینی افواج بھی لازماً بھیجنی پڑیں گی۔ کچھ دیر اس امکان کا جائزہ بھی لیا گیا کہ اس کام کی ذمہ داری حسنی مبارک کو سونپ دی جائے۔ لیکن اس بنا پر اس خیال کو ترک کر دیا گیا کہ مصری فوجیں صدام کو مرعوب نہیں کر سکتیں۔ خلیج کے ریت پر امریکہ بوٹوں کا اہتمام کرنا ناگزیر ہوگیا تھا۔

اجلاس کے دوران وار کونسل کو، ایک دوست سربراہ مملکت کے اس انتہائی خفیہ پیغام نے چونکا دیا کہ سعودی عرب نے امریکی فوجیں قبول نہ کرنے کا فیصلہ کیا ہے۔ اس رپورٹ نے ان سگنلوں کی تردید کر دی جو ایک دن پہلے شہزادہ بندر کی طرف سے موصول ہوئے تھے۔ صدر الٹا کمرے سے نکلا اور اسی وقت شاہ فہد کو فون کیا۔ مذکورہ بالا خفیہ پیغام سے قطع نظر کرتے ہوئے انہیں بتایا کہ وہ سعودی عرب کے دفاع کا سختی سے پابند ہے۔ یہ کہ امریکہ کو وہاں مستقل اڈے کا سختی سے پابند ہے۔ یہ کہ امریکہ کو وہاں مستقل اڈے درکار نہیں، جب

بھی شاہ کہیں گے ساری افواج کو واپس بلالیا جائے گا۔ بندر کے دلائل کا ذکر کرتے ہوئے بش نے سعودی فرمانروا کو مشورہ دیا کہ محض علامتی فورس منگانے سے تو بہتر ہوگا کہ کوئی فوج بالکل نہ منگائی جائے۔ "لگتا ہے ٹیلیفون کی یہ گفتگو نتیجہ خیز ثابت ہوئی۔ اگرچہ فہد کسی فوری فیصلہ پر نہ پہنچ سکے۔ تاہم بش کے دلائل نے انہیں متاثر ضرور کیا۔ بش نے واپس آکر شرکائے اجلاس کو بتایا کہ سعودی اب بھی فوج قبول کرنے پر آمادہ ہیں۔

خلیج میں بھیجی جانے والی فوج کس معیار کی ہو؟ یہ ایک نازک مسئلہ تھا۔ فوجی مشیروں نے خبردار کیا کہ امریکہ کو صدام کے ساتھ ایسی زمینی جنگ لڑنے کے لئے، جس میں سے کم سے کم جانی نقصان ہو، کئی مہینے کی تیاری درکار ہوگی۔ ڈکٹیٹر کو کویت سے نکالنے کے لئے کئی نظریات زیر بحث آئے، ساتھ ہی اس امکان کی نشان دہی بھی کی کہ ایسی صورتوں میں بھاری جانی، مالی نقصان اٹھانا پڑے گا۔ پاول نے کہا "یہ ایک سوپر گیم ہے۔ اس میں آسان ترکیبوں پر انحصار نہیں کیا جا سکتا" ڈکٹیٹر کو راستہ سے ہٹانے کے لئے صرف اتنا کافی نہیں تھا کہ خلیج میں ایک گن بوٹ بھیج کر چند فائر کرنے کا حکم دے دیا جائے بلکہ اس سے کہیں زیادہ کاروائی کی ضرورت تھی۔ پاول نے صدر سے کہا "اگر آپ واقعی فوج کو استعمال کرنا چاہتے ہیں تو اتنی زیادہ فوج بھیجنی ہوگی جتنی کہ آپ جمع کر سکیں" صدر نے اس پلان کو فوراً قطعی قرار دے دیا۔ جس کی حمایت پاول اور شوارزکوف کر رہے تھے۔ یعنی سعودی عرب کے دفاع کے لئے فضائیہ، بحریہ اور پیدل فوج کی صف بندی فوراً شروع کر دی جائے۔

بش نے نتیجہ کے طور پر سمجھ لیا ممکن ہے بالا خران فوجوں کو صدام سے دو دو ہاتھ کرنا پڑ جائیں۔ تاہم اس نے پہلے سفارتی کوششوں کو آزمانے اور اقتصادی پابندیوں کے نتائج دیکھنے کا فیصلہ کیا۔ اس کا خیال تھا سفارتی کوششیں رنگ لائیں گی۔ ناچار صف بندی کرنی پڑی تو دفاعی نوعیت کی حکمت عملی سے کام لیا جائے گا۔ یہ طے پایا کہ 82 ویں ائیر بورن بریگیڈ کے 2300 افراد روانہ کر دئے جائیں، جنہیں بحریہ کے کیریئر جہازوں اور ایف-15 طیاروں کا تحفظ حاصل ہو۔ 16،500 نفری پر مشتمل میرین بریگیڈ، جس کے ساتھ بھاری بکتر بند گاڑیاں ہوں گی، بعد میں روانہ کیا جائے گا۔ اس کے پیچھے 101 ائیر موبائیل ڈویژن کے 19،000 اور 24

ویں ہیوی آرمڈ ڈویژن کے 12'000 جوان جنہیں صحرائی جنگ کی تربیت حاصل ہے روانہ ہوں گے۔ کویت کو آزاد کرانے کے لئے کسی نے بھی حملہ میں پہل کی سفارش نہیں کی۔ نہ ہی صدر نے ایسا کوئی حکم جاری کیا۔ بنیادی منصوبہ میں واحد قابل ذکر جارحانہ کاروائی یہ تھی کہ اگر صدام سعودی عرب کے آئیل فیلڈز پر حملہ آور ہو تو وہاں اس کی کاروائی کو غیر موثر بنا دیا جائے۔

سعودی اگلے روز بھی خوف سے کانپ رہے تھے۔ صدر نے شاہ فہد سے درخواست کی کہ ڈک چینی کو سعودی عرب کا دورہ کرنے کی اجازت دی جائے۔ شاہ نے یہ کہہ کر ٹال دیا کہ نچلی سطح کے کسی ایلچی کو بھیج دیا جائے۔ اس صورت میں کوئی غلطی سرزد ہو گئی تو زیادہ محسوس نہیں ہو گی۔ دریں اثنا صدام نے سفید جھوٹ بولنے کے لئے ایک اور فصیح طرز بیان اختیار کیا۔ وہ اپنے اس قول سے پھر گیا جو اس نے عرب بھائیوں کے ساتھ کویت سے فوراً نکل جانے کے بارے میں کیا تھا۔ (دراصل وہ وہاں ایک پٹھو حکومت قائم کرنا چاہتا تھا جو اس کا کھیل کھیلتی رہے) اس بات نے شاہ فہد کو ہیجان میں مبتلا کر دیا۔ چودہ گھنٹے کی تاخیر کے بعد انہوں نے ڈک چینی کو دعوت دی کہ آ کر معاملہ کو آگے بڑھائے۔

سیماب صفت عرب بش کے صبرو تحمل کا امتحان لے رہے تھے اسی صبح صدر نے اردن کے شاہ حسین کے ساتھ 60 منٹ دورانیہ کے انٹرویو کی ایڈوانس ٹیپ دیکھی، اس کے نشر کئے جانے سے پہلے بش نے شاہ اردن سے امداد و تعاون کی درخواست کی تھی۔ انہوں نے دست تعاون بڑھانے کی بجائے امریکی عزائم پر حملے شروع کر دئے۔ اب بش کا پیمانہ صبر لبریز ہو گیا۔ کیمپ ڈیوڈ سے واپسی پر ہیلی کاپٹر سے اترا تو غصہ سے اس کا چہرہ لال سرخ ہو رہا تھا۔ اخبار نویسوں کے سامنے وہ عربوں پر خوب گرجا برسا۔ "یہ قبضہ کسی قیمت پر برقرار نہیں رہے گا، یہ کویت کے خلاف ننگی جارحیت ہے" اس کے قریبی مشیروں میں سے ایک نے، جو موقع پر موجود تھا، رائے ظاہر کی کہ اس کی آواز کا یہ لہجہ میں نے پہلے کبھی نہیں سنا تھا۔ اس کے خیال میں یہ ایک ایسی جنگ ہے جس کی تیاری جارج بش زندگی بھر کرتا رہا تھا۔ صدام حسین کے وہم و گمان میں بھی نہ ہو گا کہ اس کے خلاف کیسی تیاریاں کی جا رہی تھیں۔

عراق نے ایک اور قدم اٹھایا۔ اس ہفتہ کے آخر میں صدام نے اپنے مزید دو ڈویژن کویت شہر کے گرد سعودی سرحد پر بھیج دئے۔ عراقی فضائیہ نے اپنے ریکوں میں بم لوڈ کر کے آگے بڑھنا شروع کر دیا۔ جس وقت چینی مشرق کی طرف روانہ ہوا۔ آل سعود کے شاہی محل میں ایک ہلچل مچی ہوئی تھی۔ امریکی فوج کو بلانے یا نہ بلانے کے بارے میں پرجوش بحث جاری تھی۔ چینی نے ریاض میں فہد کے ساتھ دو گھنٹے کی طویل ملاقات کی۔ سی آئی اے کے اہلکاروں نے یہ ثابت کرنے کے لئے کہ صدام نے اپنی فوجوں کے اجتماع کے بابت کسی قدر غلط بیانی سے کام لیا تھا، نقشے اور سٹیلائٹ سے لی گئی تصویریں پیش کیں۔ ولی عہد شہزادہ عبد اللہ نے کہا سعودی فوج خود عراقیوں سے نمٹ لے گی۔ اور یہ کہ جب تک کویت ایک آزاد ملک کی حیثیت سے موجود ہے اس کا عرب حل ممکن ہے۔ شاہ نے اس رائے سے اتفاق نہیں کیا۔ انہوں نے کہا "کویت ایک ایسا ملک ہے جس کا رقبہ صرف سعودی عرب میں واقع ہوٹلوں کے کمروں تک محدود ہے"

یہ سیشن جنگ کی طرف کوچ کا فیصلہ کن مرحلہ تھا امریکی انتظامیہ نے سعودی عرب سے کہا کہ وہ اپنے علاقہ سے گزرنے والی عراق کی پائپ لائن کاٹ دے۔ یہ ایک کھلی جنگی کاروائی تھی جس سے صدام کا مشتعل ہونا یقینی تھا سعودی گورنمنٹ لڑائی سے زیادہ ایسی تدابیر پر زور دے رہی تھی جن کو بروئے کار لا کر اس امر کو یقینی بنایا جا سکے کہ امریکہ صدام کو اس کی حدود میں رکھنے کے لئے کافی فوجیں لگا دے۔ مشرق وسطیٰ اور واشنگٹن کے ذرائع میں ان یقین دہانیوں کے اصل الفاظ کے متعلق اختلاف پایا جاتا ہے۔ جو فہد حاصل کرنا چاہتے تھے۔ تاہم ذرائع اس بات پر متفق ہیں کہ جلالتہ الملک ایسی کاروائی کو یقینی بنانا چاہتے تھے کہ لڑائی کی نوبت آئے تو صدام حسین کو ایسا سبق سکھا دیا جائے کہ وہ دوبارہ سر اٹھانے کے قابل نہ رہے اسے بھرپور جنگ کا پیشگی وعدہ تصور کیا جا سکتا ہے۔ چینی نے سابقہ یقین دہانیوں کو پھر دہرایا۔ اور ٹیلیفون پر گفتگو میں بش نے بھی ایسی ہی باتیں کی تھیں۔ آخر میں شاہ نے چینی کو مخاطب کرتے ہوئے کہا "ہم منظور کرتے ہیں" انہوں نے مزید کہا کہ انہیں امریکہ پر اعتماد ہے کیونکہ وہ صدر بش پر بھروسہ کرتے ہیں۔ ملاقات میں اس کے علاوہ بھی بہت سی باتیں

ہوئیں۔ ایک سینیئر امریکی سفیر افسر نے بعد میں ذکر کیا سعودی اب اپنے ملک کے بارے میں خاصے خوفزدہ لگ رہے تھے۔

چینی نے شاہ فہد کے تازہ ترین فیصلہ کی اطلاع دینے کیلئے وائٹ ہاؤس فون کیا تو اس کا رابطہ اوول آفس میں سپیکر فون سے ملا دیا گیا جہاں بش، سکو کرافٹ اور پاول وزیر اعظم مارگریٹ تھیچر سے ملاقات کر رہے تھے۔ آسپن سے لندن واپس آتے ہوئے سفارتی دوا کی ایک اور خوراک دینے کیلئے خصوصی طور پر مختصر قیام کا اہتمام کیا گیا اس کے دوران تھیچر نے ایک بار پھر بش کے پختہ عزم کو تقویت پہنچائی۔ جس وقت وہ باتوں میں مصروف تھے، بیکر، وائٹ ہاؤس کے چیف آف سٹاف جان سنونو اور نائب صدر کوائیل بھی آگئے۔ موقع پر موجود ایک شخص کے بقول "یہ حقیقتاً امریکہ کی منی کابینہ کا اجلاس تھا جس میں مسز تھیچر بھی شریک ہوئیں" تھیچر کے بعض سول ملازمین یہاں تک کہ بعض سیاسی مشیروں نے بھی ان پر زور دیا کہ صدام کے خلاف الزام لگانے میں اقوام متحدہ کو قائدانہ رول ادا کرنے دیا جائے۔ تاہم تھیچر نے یہ مشورہ قبول نہیں کیا۔ ایک اور محافظ کا کہنا ہے وہ بہت زیادہ تعاون کا مظاہرہ کر رہی تھیں۔ اس سے اگلے روز ٹیلیویژن پر خطاب کرتے ہوئے بش نے اپنے ملک کے ساتھ ساتھ دنیا کو اس فیصلہ سے آگاہ کیا کہ امریکہ مشرق وسطیٰ میں فوجیں بھیج رہا ہے۔ انہوں نے یہ وضاحت بھی کی کہ "ہمارا اقدام سرا سر دفاعی ہوگا۔" صرف دو اتحادیوں برطانیہ اور کینیڈا کا ذکر کرتے ہوئے بش نے کہا:

"دنیا بھر میں تھیچر سے بڑھ کر آزادی و خود مختاری کا دوست کوئی نہیں" فرانس، جرمنی اور جاپان سے مکمل سیاسی و معاشی امداد اور تعاون حاصل کرنے کا مشکل کام ابھی باقی تھا۔

بش نے محض ایک لاکھ پچیس ہزار فوج خلیج میں بھیجنے کا حکم دیا تھا۔ وہ اسے معمول کی ایک کارروائی کا درجہ دینا چاہتا تھا۔ اس قسم کے تاثر سے بچنے کیلئے جس سے ایران میں یرغمالیوں کے بحران کے موقع پر جمی کارٹر کو سابقہ پڑا کہ وہ وائٹ ہاؤس کے جال میں پھنس کے رہ گئے تھے، بش تین ہفتے کے رخصت پر کینی بنکپورٹ میں واقع اپنی گرمائی قیام گاہ پر چلا گیا۔ ان کے پیش نظر یہ بات بھی تھی کہ لبنان میں بنائے جانے والے امریکی یرغمالیوں کے

واقعہ نے رونالڈ ریگن کو ایران کے خلاف بھگدڑ میں شامل کر دیا تھا۔ عراق اور کویت میں تین ہزار امریکیوں اور پندرہ لاکھ دیگر شہریوں کے محصور ہو جانے کے باعث اسے یرغمالیوں کے سنگین بحران کا سامنا تھا۔ اپنی پبلک تقریروں میں اس نے کئی ہفتے تک یرغمالی کا لفظ استعمال نہیں کیا۔ اسی کے احساسات ماپنے کا ایک اور پیمانہ تھا۔ ایسے موقوں پر وہ کھیلوں میں پہلے سے زیادہ حصہ لیتا تھا۔ ان تعطیلات کے دوران اس نے بلاناغہ گاف کھیل کر، گھوڑوں سے دل بہلا کر مرد آہن کی سی جاگنگ، ٹینس اور تیز رفتار کشتی پر سوار ہو کر مچھلی کا شکار کر کے تفکرات کو اپنے اعصاب پر سوار نہیں ہونے دیا۔ اس نے ایک بار کہا تھا۔ "جب میں صدر ہوتا ہوں تو واقعی صدر ہوتا ہوں اور جب تفریح کرتا ہوں تو صرف تفریح کرتا ہوں"

کینی بنکپورٹ میں ظاہری خاموشی انتہائی دھوکہ دینے والی تھی۔ صدر کے مشیروں کو تین ہفتے تک شدید خوف و سراسیمگی کا مقابلہ کرنا پڑا۔ وہ صدام کے اگلے اقدام کا انتظار کر رہے تھے اس دوران عراق کے لڑاکا طیاروں نے مورچوں کا جائزہ لینے کے لئے سعودی عرب کی فضائی حدود کی بارہا خلاف ورزی کی سٹلائٹ تصویروں سے ظاہر ہو کہ صدام اپنی افواج کو کمک پہنچا رہا ہے اور اس کا ہراول دستہ سعودی سرحد تک پہنچ چکا ہے۔ اب بش نے اقوام متحدہ کی طرف سے لگائی گئی پابندیوں کو موثر بنانے کیلئے بحری ناکہ بندی کا کارگر حربہ استعمال کیا۔ یہ جاننے کا کوئی ذریعہ نہیں تھا کہ آیا ناکہ بندی کو توڑنے کیلئے کوئی مزاحمت کی جائے گی یا اسے خاموشی سے برداشت کر لیا جائے گا۔ اضطراب و بے چینی اس وقت نقطۂ عروج پر پہنچ گئی جب امریکی بحریہ نے پہلی بار ایک عراقی ٹینکر کو گولہ باری کا نشانہ بنایا۔ صدر کے آدمیوں میں سے ایک نے ذکر کیا "وہ لمحہ بحران کے خطرناک ترین لمحات میں سے ایک تھا۔ میں دریائے کینی بنک کے کنارے ایک مکان کی کھڑکی سے نیچے دیکھ رہا تھا۔ مجھے تصور میں تباہ کن جہاز صاف نظر آ رہے تھے میرے دل نے گواہی دی ہمیں کسی وقت بھی جنگ سے واسطہ پڑ سکتا ہے۔"

ان تین بحرانی ہفتوں کے دوران صدام چاہتا تو گلف کے ساحل کی نچلی سمت میں اردن کے راستے اسرائیل کی طرف متحدہ عرب امارات تک ایڈوانس کر سکتا تھا۔ انتظامیہ کے ایک

سینئیر افسر نے اعتراف کیا "ہمارے پاس وہاں نام لینے کو بھی کوئی چیز نہ تھی ہم موت میں گھرا گئے تھے۔ اس نے سوچ لیا تاکہ مجھے سعودی عرب کے آئیل فیلڈ پر قبضہ نہیں کرنا، محض آگ لگانی ہے، اسے روکنے کا کوئی دوسرا طریقہ نہیں تھا۔" بش آہستہ آہستہ ٹہل رہا تھا اور اپنے جنگی تجربات کے بارے میں باتیں کر رہا تھا۔ ایک تباہ ہونے والے فائٹر کا ملبہ اس کی نظروں میں گھوم گیا۔ جس میں ایک شخص ہلاک اور دوسرے کی ٹانگ کٹ گئی تھی۔ اس موقع پر اس نے اپنے بچوں اور پوتے پوتیوں کے متعلق باتیں کیں، بعض نائب حیران ہو رہے تھے کہ آیا اب اس کی سوچ یہ ہو گئی ہے کہ فوجی کاروائی سے کوئی مقصد حاصل نہیں ہو گا۔ پھر ایک صبح کو کین بنک پورٹ میں کچن میں کھڑے ہوئے اس نے کہا۔ "تم جانتے ہو کہ ایک نہ ایک دن اشتعال انگیزی جنم لینے والی ہے اور ہمیں اس کے سدباب کیلئے میدان میں نکلنا پڑے گا"

اس وقت تک لڑائی کا صرف ایک منصوبہ پیش نظر تھا ابتدائی صف بندی کے انتہائی خفیہ آپریشن کے لئے اس نے پچاس 52-بی طیارے ڈیگو گارشیا بھیجنے کا حکم دے دیا ایک اعلیٰ فوجی مشیر نے کہا "اگر صدام سعودی عرب میں داخل ہوا تو ہم عراق کو بے جان کر دیں گے۔ مکمل طور پر اسلحہ سے لیس تین 52-بی طیاروں سے ہدف پر 76500 پاونڈ بارود گرایا جا سکتا ہے۔ پینٹاگون نے فوجی اہداف کا تعین کیا۔ بمباری شہروں کی بجائے ایسے فوجی ٹھکانوں پر کرنے کا پروگرام بنایا گیا جن کی تباہی سے حریف کی طاقت ختم ہو جائے اور کویت کی آزادی میں کوئی دقت پیش نہ آئے عام خیال تھا کہ ایسی کارروائی کے نتیجہ میں صدام کا تختہ الٹ جائے گا"

اُدھر بش اپنے دفاعی منصوبہ میں منہمک تھا۔ ادھر عراقی ڈکٹیٹر تذبذب کا شکار رہا۔ سکو کرافٹ اور بیکر دونوں نے صدر کو مشورہ دیا کہ ڈپلومیسی کی چالوں اور اقتصادی پابندیوں کو رنگ لانے کا موقع دیا جائے۔ اگست کے آخر کی بات ہے ایک صبح بش نے سکو کرافٹ کو مچھلی کے شکار پر چلنے کی دعوت دی۔ سپیدہ صبح کا نظارہ کرنا، گلاف کھیلنا اور مچھلیوں کے شکار پر جانا سکو کرافٹ کے پسندیدہ مشاغل نہیں، تاہم وہ ساتھ چلنے پر تیار ہو گیا، شکار کے دوران انہوں نے چار گھنٹے تک باتیں کیں۔ جن میں اس قسم کے امور زیر بحث آئے۔ اگر پابندیاں

کار آمد نہ ہوئیں؟ ہم کب تک ان پر انحصار کریں گے؟ عالمی لیڈروں کی حمایت کتنی دیر ساتھ دے گی؟ یرغمالیوں کے متعلق کیا کیا جائے؟ اس طویل گفتگو میں انہوں نے جذبات کو سوچ پر غالب نہیں آنے دیا۔ خود کو صدام کی پوزیشن میں رکھ کر صورت حال کا جائزہ لیا۔ اس کے آئندہ اقدامات کا اندازہ لگایا بش نے دو نیلی مچھلیاں شکار کیں۔ جبکہ سکو کرافٹ کے کانٹے میں صرف ایک مچھلی پھنسی نیشنل سیکورٹی کونسل کے مشیر نے ڈپلومیسی اور نئے عالمی نظام کے بارے میں خوش بیانی سے اظہار خیال کیا۔ پھر وہ واپس گودی پر آ گئے۔ اب اس نے جنگ سے اجتناب کرنے کا مصمم ارادہ کر لیا تھا۔ صدر نے سوچا کہ اس کی کامیابی کے امکانات پچاس فیصد سے زیادہ نہیں۔

دفاع کی بجائے حملہ کرنے کا فیصلہ

کولن پاول 4 اگست کو بڑی پھرتی کے ساتھ پینٹاگون پہنچا۔ جہاں اس نے اپنے جرنیلوں اور ایڈمرلوں کو صدام سے ٹکر لینے کے فیصلہ کی بابت بریف کیا۔ "انڈی پینڈنیس" اور "آئزن ہاور" سمیت 50 جنگی جہازوں کو خلیج کی طرف کوچ کا حکم دے دیا گیا تاکہ وہ ناکہ بندی کو موثر بنا سکیں۔ ٹامپ (فلوریڈا) میں شوارزکوف کے ہیڈ کوارٹرز کو ایک انتہائی اہم خفیہ پیغام بھیجا گیا جس میں اسے ہدایت کی گئی تھی کہ افواج کی صف بندی کے تفصیلی منصوبوں کو مزید بہتر بنائے اگلے دن پاول نے جنرل ہنس فورڈ جانسن، چیف آف ٹرانسپورٹ کمانڈ کو فون پر بتایا۔ "ہم جس چیز کے متعلق سوچ رہے ہیں وہ ملکی تاریخ کی سب سے بڑی تیز ترین اور سب سے زیادہ دور فاصلے پر افواج کی صف بندی ہے" اس کے 24 گھنٹے بعد کرنل رک فیلڈز نے جو واشنگٹن نیوی یارڈ میں ملٹری سی لفٹ کے مرکز پیغامات میں بیٹھا تھا احکامات کا ایک حیران کن سلسلہ دیکھا۔ وہ بڑی جلدی میں اپنے دفتر پہنچا۔ سیف سے مشرق وسطیٰ میں صف بندی کا خفیہ منصوبہ نکالا۔ وہ منصوبہ مایوس کن حد تک پرانا ہو چکا تھا۔ اس نے اپنے دل میں کہا۔ "یا خدا! ہم یہ مہم کیسے سر کریں گے۔ جبکہ ہمارے پاس کوئی منصوبہ بندی نہیں ہے"

وہ مشن جو عراق کے ساتھ جنگ کا موجب بنا، بڑی افراتفری کے عالم میں شروع کیا گیا۔ پینٹاگون کے پاس یقیناً 1988ء کا ایک منصوبہ (88-1002) تھا جس میں یہ بتایا گیا تھا کہ

امریکہ خلیج فارس میں لڑائی کس طرح لڑ سکتا ہے۔ تاہم اس کے بنیادی مفروضات بالکل ناکارہ ہو چکے تھے۔ وہ منصوبہ اس مفروضے کے تحت بنایا گیا تھا کہ امریکہ روس کے بائیں محاذوں۔ یورپ اور جنوب مغربی ایشیاء میں لڑائی چھڑ جانے کی صورت میں امریکہ کی حکمت عملی کیا ہو گی اس میں خلیج کی لڑائی کو محض ایک ضمنی ڈرامہ حیثیت دی گئی تھی منصوبہ میں یہ بھی فرض کر لیا گیا تھا کہ خطرہ کی صورت میں صدر 30 یوم میں پینٹاگون کو مطلع کرے گا کہ فلاں فلاں تین ڈویژن تیار ہو کر نقل و حرکت شروع کر دیں۔ جبکہ صدام نے تیاری کرنے کی کوئی مہلت نہیں دی تھی۔ بہرحال پیش آمدہ صورت حال سے نمٹنا لازمی تھا۔ 1989ء کے موسم گرما میں جائنٹ چیفس کے اس نتیجہ پر پہنچنے کے بعد کہ سوپر طاقتوں کے مابین تصادم کا کوئی خطرہ نہیں، شوارزکوف نے پلان 88-1002 کو حسب حال یعنی پلان نمبر 90-1002 بنانے کا کام شروع کر دیا تھا۔ خوش قسمتی سے مسلح افواج جون / جولائی میں ایک مفصل جنگی مشق "کمانڈ لوسٹ ایکسرسائز" (کوڈ نام سی پی ایکس) کر چکی تھیں اتفاق سے اس میں حریف کا کردار عراق کو دیا گیا تھا۔ اس مشق سے اس نے اندازہ لگا لیا تھا کہ صدام کے ساتھ محاذ آرائی کی صورت میں اسے کون سے ڈویژن کی ضرورت پڑے گی۔

تاہم یہ کام اس قدر آسان نہیں تھا جتنا کہ سویلین حکام سمجھ رہے تھے مسلح افواج تو کوچ کا حکم ملتے ہی سیلوٹ کر کے اپنے فرض کی بجا آوری کے لئے شہرت و عظمت کی راہ پر گامزن ہو جاتی ہیں۔ لیکن حقیقت میں قدم اٹھانے سے پہلے لاکھوں تفصیلات طے کرنی ہوتی ہیں۔ صف بندی کے روز مرہ پلان کے لئے پینٹاگون میں جادوگر کمپیوٹر ایک جداگانہ پروگرام ترتیب دیتے ہیں۔ جسے "ٹائم فیزڈ فورس ڈی پلائنٹ لسٹ کا نام دیا گیا ہے۔ اور عرف عام میں اسے "ٹپ فڈل" کہتے ہیں۔ ٹپ فڈل بتاتا ہے کہ ہر شخص اور ہر چیز کو اس کے ٹھکانہ سے میدان جنگ تک کیسے پہنچایا جاتا ہے ابھی تک کسی نے بھی منصوبہ 90-1002 کے ڈرافٹ کو ایک نئے ٹپ فڈل کی طرح نئے سرے سے ترتیب نہیں کیا تھا۔ پینٹاگون کو ابھی یہ فیصلہ کرنا تھا کہ نقل و حمل کے نقطہ نظر سے شوارزکوف کے نظریات قابل عمل ہیں یا نہیں پہلی یونٹ کی روانگی کے لئے پرانا ٹپ فڈل 88-1002 استعمال کرنا تھا۔ ٹپ فڈل کی معلومات تازہ ترین

بنانے کے لئے کمپیوٹر سے نکالی گئیں۔ ایک کرنل نے ذکر کیا کہ "کمپیوٹر بنک" میں ایک بھی ماخذ موجود نہیں تھا حد یہ کہ اعداد و شمار کا مرکزی حصہ بھی، جس پر سارے مقابلہ کا دارومدار ہوتا ہے۔ وہاں نہیں ملا" کمپیوٹر والے اس کی تلاش میں سرگرداں تھے، ٹرانسپورٹ افسران کو وقت کے وقت اس کا بندوبست کرنا پڑا۔ وہ انتہائی پیچیدہ منصوبہ جسے انہوں نے ریکارڈ وقت میں درست کیا۔ ایک فوجی معجزہ لگتا تھا۔ بعد میں ایک افسر نے اسے "ڈنکرک کا ملکوس" قرار دیا۔

لنگلے کے ایربیس (ہیمپٹن) پر حملہ کے بعد "آگے بڑھیں اور کاروائی کے لئے مستعد ہو جائیں" کا سگنل دے دیا گیا تھا۔ 6 اگست کو ایف-15 کے دو سکوارڈن ریاض اور ظہران کے نزدیک خفیہ اڈوں پر تعینات کرنے کا حکم صادر ہوا۔ مقصد یہ تھا کہ صدام کے جیٹ اور بمبار طیاروں پر بالادستی حاصل کی جائے۔ 82 ویں ایر بورن بریگیڈ کو فضائی تحفظ کے بغیر نہیں چھوڑا جا سکتا تھا۔ اگلے روز سینکڑوں کاریں لنگلے کے مغربی دروازہ پر جمع ہو گئیں۔ لوگوں کے کان میں فوجوں کے کوچ کی بھنک پڑ گئی تھی۔ لوگ بڑی تعداد میں ہیمپٹن بیچ سے فرسٹ ٹیکنیکل ائرونگ کی روانگی کا منظر دیکھنے کے لئے موجود تھے۔ جونہی ایف-15 فضا میں بلند ہوا۔ بھیڑ چھٹنے لگی۔ ائیر فورس کے ایک میجر نے جو موقع پر موجود تھا بتایا کہ "وہ ایک عجیب نظارہ تھا۔ ہر کوئی کہہ رہا تھا۔ یا خدا! ہم کیا کر رہے ہیں۔؟

ایف-15 قسم کے 48 طیاروں کی پہلی کھیپ سعودی عرب میں اس وقت اتری جب ائیر فورس کو خدشہ تھا کہ شاید مشرق وسطیٰ میں منزل مقصود پر پہنچنے سے قبل ہی دشمن سے مڈھ بھیڑ ہو جائے۔ چنانچہ اس مشن کے اترنے کے لئے شام کا وقت مقرر کیا گیا۔ عراقی پائلٹ عام طور پر رات کو پرواز کرنا پسند نہیں کرتے۔ ایک ائیرمین نے پائلٹوں کے اولین دستہ میں سے ایک سے کہا۔ "سعودی عرب میں آنے پر میں آپ کو خوش آمدید کہتا ہوں۔ آپ تین گھنٹے کے اندر ریغمالی بننے والے ہیں" پائلٹ کو اس کے اس ریمارک پر ہنسی نہیں آئی۔"

عراق کے پاس فرسٹ ٹیکنیکل ائرونگ پر ہلہ بولنے کے لئے بہت زیادہ فضائی قوت تھی۔ تاہم وہ دوسری الجھنوں میں پھنسے ہوئے تھے۔ امریکیوں کو روس کے مگ طیاروں کا اتنا خوف

نہیں تھا۔ "مشرقی یورپ سے نکلتے وقت روسیوں نے جو راہنما کتابچے چھوڑے' ان سے اعلیٰ درجہ کے مگ-29 سمیت عراق کے پاس موجود دیگر ہتھیاروں کے متعلق بھی بڑی کارآمد معلومات حاصل ہوئیں" وہ بعض دوسری باتوں سے پریشان تھے۔ صدام نے فرانس سے جو 30 میراج خریدے تھے' امریکیوں کو پہلا خطرہ ان سے محسوس ہوا کیونکہ ان میں سے کسی نے ان مقابلہ کرنے کی تربیت نہیں پائی تھی۔ پیرس سے یہ معلومات حاصل کرنے کے لئے بہت فون کئے گئے' کہ میراج طیاروں سے کون کون سے کام لئے جاسکتے ہیں اور فرانس میں تربیت یافتہ پائلٹ کیا کیا کارنامے انجام دے سکتے ہیں۔ سب سے زیادہ دہشت زدہ کرنے والے قوی ہیکل 150 انٹی ایئر کرافٹ ہاک میزائل تھے جو صدام کو کویت سے ہاتھ لگے تھے۔ اگر عراقیوں کو ان سے کام لینا آتا ہے تو وہ ایف-15 طیاروں کے لئے سب سے بڑا خطرہ ثابت ہوسکتے ہیں۔

فرسٹ ٹیکنیکل ایئرونگ کے ساتھ آنے والے 82 ویں ایئربورن بریگیڈ کے پیراٹروپس نے ایسی جگہ کیمپ لگایا جسے چاروں طرف سے آدمیوں اور توپوں نے گھیر رکھا تھا۔ یہ بریگیڈ ہلکے اینٹی ٹینک ہتھیاروں اور ایم-55 شہری ڈان آرمڈ ریکانس گاڑیوں سے لیس تھا یہ اپنے ساتھ کوئی ٹینک نہیں لایا تھا۔ آئندہ سات دنوں تک وہاں کوئی ٹینک نہیں پہنچا۔ آپریشن کے پہلے 100 گھنٹوں کے دوران چیف آف آرمی سٹاف جنرل کارل ایف ووونو' اس بات پر بار بار برہمی کا اظہار کرتا رہا کہ 82 ویں بریگیڈ نے ضروری سازوسامان کے بغیر کوچ پر آمادگی کیوں ظاہر کی تھی اسے یہ فکر تھی کہ اگر صدام کی فوجیں سعودی عرب سرحد پار کرکے حملہ آور ہوجائیں اور دہران میں قیام پذیر پیراٹروپس ان کا راستہ نہ روک سکیں۔ تو کیا ہوگا؟
پینٹاگون والے بھی یقین رکھتے تھے کہ اس صورت میں اس بریگیڈ کو دور دھکیلا جاسکتا تھا اور اسے ذلت آمیز ہزیمت اٹھانی پڑتی۔ لیکن اس وقت متبادل چارہ کار نہیں تھا۔ فوج کے ایک باخبر افسر نے بتایا "ان کی قربانی رائیگاں جانے والی نہیں تھی اگر وہ مارے جاتے تو ہیرو بن جاتے۔ تاہم مردہ ہیرو ہوتے۔"

ڈیزرٹ شیلڈ کے پہلے مہینہ میں شوارزکوف کی پھرتی و مستعدی اور اس کے اعصاب

اوسان کی مضبوطی نیز صدر کی گیدڑ بھبکیاں دینے کی استعداد و صلاحیت کا امتحان ہوا۔ ایک نائب افسر نے بعد میں ذکر کیا۔ "ہمارے دشمن کی زد میں ہونے کے متعلق شوارزکوف بے حد خوفزدہ تھا۔ کویت پر حملہ کے بعد ڈی آئی اے نے صدام کو 10 لاکھ آرمی سمیت جسے ایران کے خلاف لڑنے کا آٹھ سالہ تجربہ حاصل تھا۔ اس کے اہم آلات حرب و ضرب کی فہرست کو پیش نظر رکھتے ہوئے لڑائی کے لئے تازہ ترین صف بندی کا پلان بنایا تھا۔ تاہم یہ بات قابل ذکر ہے کہ عراق نے ڈی آئی اے (ڈیفنس انٹیلی جنس ایجنسی) کے ممکنہ اندازوں کے برعکس تین گنا پھرتی سے کویت کو پامال کیا تھا۔ اس کے بعد سی آئی اے نے تصویر کے دوسرے رخ کو سامنے رکھتے ہوئے بتایا کہ عراق کی فوجی صلاحیت کے متعلق جو اندازے لگائے گئے ہیں' اصل میں ان کے پاس ان تخمینوں سے 1000 ٹینک' 2000 بکتربند کیریئر اور 250 لڑاکا طیارے زائد ہیں اور یہ کہ عراقی افواج اس سارے سازوسامان کے ساتھ سعودی سرحد کی طرف تیزی سے بڑھ رہی ہیں۔

شوارزکوف کو اپنے پاس موجود سازوسامان کے ساتھ وقت بے وقت قابل اعتماد دفاعی حصار قائم کرنا تھا۔ ایک موقع پر اس نے نیوی والوں کو فون کرکے دریافت کیا کہ بحری جہاز وسکونسن سے فائر کئے گئے کروز میزائل عراق کے کون کون سے ہدف کو نشانہ بنا سکتے ہیں۔ جواب دیا گیا زیرو۔ ان میزائلوں کو ان کے ہدف پر کامیابی سے گرانے کے لئے ضروری ہے کہ ان کے ساتھ علاقہ کے الیکٹرانک نقشے کمپیوٹر کے ذریعے لگائے جائیں۔ سی آئی اے اور ڈی آئی اے نے مشرقی یورپ سے روسی افواج کے انخلاء کی نگرانی میں مصروف ہونے کے سبب یہ کام نہیں کیا تھا۔ مطلوبہ نقشے اگست کے آخر تک تیار نہیں کئے جاسکے۔

شوارزکوف کو صدام کا مقابلہ کرنے کے لئے اور کس کس چیز کی ضرورت تھی' اسے مختصراً "حل من مزید" کے لفظ سے ظاہر کیا جاسکتا ہے۔ سب سے اہم مسئلہ یہ تھا کہ 24 ویں مکینائزڈ انفنٹری ڈویژن کو اس کے 216 ایم آئی اے آئی ٹینکوں سمیت میدانی کارزار میں کیسے لایا جائے؟ ڈیزرٹ شیلڈ کے اصل پلان میں تمام سامان کو 120 دنوں میں مقررہ جگہ پر پہنچانے کا پروگرام بنایا گیا تھا۔ بعد میں نیوی نے یہ میعاد گھٹا کر 95 یوم کردی۔ انتظار کے دنوں

میں اس نے کمپیوٹر کے چھوٹے نقشے واپس لے کر تمام ٹینک ڈرائیوروں کو نئے نقشے [illegible] کیئے۔ ائیر فورس سے مزید لڑاکا طیارہ مانگے نیز اے - 10 کلوز اپ طیاروں کے علاوہ [illegible] میزائل بھی طلب کئے۔ اپنی اضافہ پذیر افواج اور اس کے وسعت پذیر ٹھکانوں کو صدا[illegible] فضائیہ اور سکڈ میزائلوں سے بچانے کے لئے انٹی ائیر کرافٹ پیٹریاٹ میزائل حاصل کئے

اس کے پاس یہ خطرہ مول لینے کے سوا کوئی چارہ نہیں تھا کہ صدام دہران تک آجا[illegible] خود کنی کترا کے نکل جائے۔ گولہ بارود کی فوری فراہمی کے باعث طبی یونٹوں کی روانگی [illegible] کرنی پڑی۔ صف بند کے پہلے مہینہ میں اس کے اس صرف 80 ڈاکٹر' 500 بستر اور [illegible] تھوڑی دوائیں تھیں۔ اسے سراسر دھوکہ دہی سے کام لینا تھا۔ پینٹاگون خلیج میں بھیجی [illegible] یونٹوں کے بارے میں اعلانات کا تانتا باندھ دیا جبکہ حقیقت یہ تھی کہ ان یونٹوں کے [illegible] ابتدائی حصے روانہ کئے گئے تھے۔ امریکی افواج کے بھاری اجتماع کی جاسوسی کرنے کے [illegible] صدام کے پاس ڈس سٹلائٹ یا جاسوسی طیارے نہیں تھے۔ اس کی حاصل کردہ زیادہ [illegible] معلومات کا ذریعہ سی این این تھا۔ اس لئے شوارزکوف نے اس چیز کا بطور خاص اہتمام کر[illegible] کہ ٹی وی کا عملہ ہر چند منٹ بعد اترنے والی ٹرانسپورٹ کی تصویریں باقاعدگی سے دکھائے۔

شوارزکوف کا تعلق آرڈر کور سے تھا' اس لئے پردیس میں اس کا دل وطن کی یاد میں [illegible] بے چین نہیں ہوا۔ جس قدر "گرین بیرٹس" (پیادہ دستے) والے بے قرار ہوئے۔ پانام[illegible] چڑھائی کرنے والے ہیروز یعنی سپیشل آپریشنز آفیسرز نے اس وقت بڑی پریشانی محسوس کی جب [illegible] انہیں انفینٹری کے نو وارد یونٹوں کے لئے جگہ بنانے کی غرض سے پہلے سے خیمہ زن کمانڈ[illegible] کو آگے دھکیلنا پڑا۔ اسے کردوں اور شیعہ مسلمانوں کو مزاحمت پر ابھارنے کا ایک منصوبہ [illegible] دیا گیا تھا۔ جو غیر موثر سمجھتے ہوئے نظر انداز کر دیا گیا۔ تاہم اس نے سپیشل آپریشنز آفیسرز [illegible] مدد سے ایسے پائلٹوں کے تحفظ کے لئے جن کے طیاروں کے فائرنگ کا نشانہ بننے سے گرنے [illegible] امکان تھا۔ دور دور تک جال لگوا دئے جاسوسی کرنے والی ٹیموں کو مدد دی گئی ان ٹیموں کو [illegible] کام سونپا گیا تھا کہ لڑائی چھڑ جانے کی صورت میں خاموشی سے سرحدوں کے اندر گھس کر سمارٹ بموں اور میزائلوں کو لیسرز (خصوصی آلات) کی مدد سے عراق کے کمانڈ بنکرز تک

پہنچانے میں رہنمائی کریں۔ امریکی قانون نے صدام کے قتل کی کسی بھی کوشش کو ناجائز ٹھہرایا۔ حالانکہ ڈیزرٹ شیلڈ کے ابتدائی دنوں میں ایک منحرف عراقی نے سی آئی اے کو بتایا تھا کہ صدام نے اپنے اہل خاندان اور دوستوں کے لئے غیر ملکی ٹھیکیداروں سے کئی زیر زمین بنکر تعمیر کرا رکھے ہیں ایجنسی نے اسی کی دہائی کے دوران سٹلائٹ کے ذریعے بغداد کے اوپر سے لی گئی تصاویر کے بنڈلوں کو اچھی طرح کھنگالا اور بہت سے اہم مقامات کا سراغ لگایا۔

پینٹاگون میں ٹرانسپورٹ کے عملہ کو شوارزکوف کی ضروریات پوری کرنے کے لئے تھکاوٹ اور پژمردگی کا شکار ہونا پڑا۔ لاکھوں فوجیوں' ان کے ہتھیاروں اور دیگر اسباب کی بہت تھوڑے وقت میں نقل و حمل اس کام سے بھی مشکل ثابت ہوئی جو نارمنڈی میں کرنا پڑا تھا۔ فاصلے بڑے طول طویل اور سامان بے حد وزنی۔ اس پر مستزاد یہ کہ تیاری کے لئے کوئی مہلت نہیں دی گئی تھی۔ کمپیوٹروں کے ذریعے دنیا بھر میں بکھرے ہوئے 450 سی - 5' سی - 130 اور سی - 141 طیاروں کا سراغ لگایا گیا۔ کمپیوٹر ایک بار حرکت میں آئے۔ افسروں نے پرنٹروں پر سے پروگرام بند کر کے ایک گھنٹہ بعد ہی طیارے' ٹرک اور بحری جہاز مقررہ مقامات کی طرف روانہ کرنے شروع کر دئے۔ آرمی اور نیوی کے افسروں نے ٹریفک کے سپاہیوں کی طرح ریلوے بوگیوں اور بندرگاہوں کی گودیوں میں کھڑے ہو کر کام کرایا۔ بعض اوقات کام میں گڑبڑ بھی ہوئی کارگو طیارے غلط جگہ پہنچ گئے۔ توپیں کہیں اور ان کا ایمونیشن کہیں اتار دیا گیا۔ سوانا میں 24 میکا نئرڈ ڈویژن کے جوانوں نے کیپلا نامی ٹرانسپورٹ جہاز میں سوار ہونا شروع کیا تو وہ ہچکولے کھا کر ڈوبنے لگا کیونکہ اس سے پہلے اسے ڈویژن کو اکے مکمل ساز و سامان کے ساتھ سوار کرانے کا تجربہ نہیں کیا گیا تھا۔ اس ڈویژن کے پاس زائدہ سامان میں ایندھن بھی شامل تھا۔ زمانہ امن میں بھی ہتھیاروں اور سپلائی کی نقل و حمل کے دوران ایسی طغیانیاں آتی رہی سامان لادنے والوں کو بدلنا پڑ جاتا تھا' تاہم اگست کے آخر تک کارگو طیاروں نے روزانہ 300 تک پروازیں کر کے 72000 فوجی اور ایک لاکھ ٹن سامان خلیج میں پہنچا دیا۔

ساحل سمندر میں جو کچھ پیش آیا' وہ بھی خلاف توقع اور غیر معمولی تھا۔ انفینٹری کی

بھاری نفری کو صرف بحری جہازوں سے خلیج میں پہنچایا جا سکتا تھا۔ نیوی کو بہت بھاری سا
سامان کی نقل و حمل کے لئے دوسری جنگ عظیم میں استعمال شدہ 96 وکٹری جہازوں سے کا
لینا پڑا۔ پینٹاگون کے ایک شخص نے بتایا۔ "کوئی یقین نہیں کر سکتا کہ ہم نے پہلے دستوں
ان جہازوں میں کیسے سوار کیا؟ ایک حوالدار نے وکٹری جہاز میں سوار ہوتے وقت احتجا
کرتے ہوئے کہا۔ "آپ مجھے بحراوقیانوس جانے کے لئے اس بوسیدہ جہاز میں سوار کر
چاہتے ہیں؟" پریشانی میں مبتلا منصوبہ سازوں کو ایسا عملہ تلاش کرنے کیلئے جو پرانے بوائلرو
کو جلانا جانتے تھے، یونین ہال کا رخ کرنا پڑا۔ شب روز کی بھاگ دوڑ اور مرمت کے بعد آٹھ
تیز رفتار سی لفٹ جہازوں کو قابل استعمال بنا لیا گیا نیوی والوں نے بہت سے کام محض اپنی
خوش تدبیری، ذہانت، لوہے کے رسوں اور پتھروں سے مکمل کئے۔ اوائل ستمبر میں 24 واں
ڈویژن خلیج میں پہنچ گیا تو شوارزکاف کا دم میں دم آیا۔

ستمبر کے شروع میں بھی امریکہ صدام کے مقابلہ میں دفاعی پوزیشن میں تھا۔ بش بیکر اور سکوکرافٹ اب بھی توقع کر رہے تھے کہ اقتصادی پابندیوں سے ڈکٹیٹر کے ہوش ٹھکانے آجائیں گے۔ سی آئی اے بغداد میں پکنے والی روٹی کے سائز سے لے کر غیر ملکی ہوائی اڈوں پر عراقیوں کے تیل کی کھپت تک پر معاملے پر نظر رکھے ہوئے تھی۔ پابندیوں اور بحری ناکہ بندی کے باعث عراق کی درآمدات و برآمدات میں 90 فیصد کمی واقع ہو چکی تھی۔ تاہم ایران کے ساتھ طویل جنگ میں لوگوں نے مصائب جھیلنا سیکھ لیا تھا۔ صدام کی خواہش بھی یہی تھی کہ عوام اپنے فوجیوں کو خوراک بہم پہنچانے کے لئے خود فاقوں مرتے رہیں۔ اور آخر ستمبر میں سی آئی اے نے وائٹ ہاؤس کو یہ جائزہ رپورٹ بھیجی کہ "مختصر یا درمیانی عرصہ کی پابندیوں سے صدام کو کویت سے نہیں نکالا جا سکتا۔"

تاہم اس رپورٹ میں یہ نہیں کہا گیا تھا کہ ان پابندیوں کو ختم کر دیا جائے۔ اس رپورٹ نے الٹا پاول اور چینی کے موقف کو تقویت پہنچائی جو روز اول سے ایسی پابندیوں کے خلاف تھے۔ بہر حال صدر پر واضح ہو گیا کہ عراق پر دباؤ بڑھانے کے لئے دوسری تدابیر اختیار کرنی پڑیں گی۔ متبادل صورت یہ تھی کہ سعودی عرب کے دفاع سے آگے بڑھ کر جارحانہ کارروائی

کی تیاری کی جائے۔ ڈیزرٹ شیلڈ مرتب کرتے وقت پینٹاگون کا خیال تھا کہ اگر صدر نے حملہ میں پہل کا فیصلہ کیا تو شوارزکوف کو مزید دو ڈویژن یعنی ایک لاکھ فوج کی ضرورت ہو گی۔ ابتداء میں سوچا گیا کہ بحری دستے اور اتحادی افواج ملکر صدام کو کویت کی سرحد پر روکیں گے۔ جبکہ شوارزکوف کی 18 ویں کور کویت کے اطراف میں پھیل کر ایڈوانس کرے گی اور عراقیوں کو گھیرے میں لے کر کچل ڈالے گی۔ لیکن بعد کے دو مہینوں کے دوران ٹیکنیکل زمینی صورت حال بدل گئی۔ صدام نے ایرانی سرحد پر اپنی مورچہ بندیاں ختم کر دیں۔ اس اقدام نے پینٹاگون کو حیرت میں ڈال دیا۔ دوسری طرف ہزاروں بلکہ لاکھوں کی تعداد میں کمک فراہم کر کے اس نے اپنی پوزیشن بہت مستحکم کر لی۔ درمیانی عرصہ میں عراقیوں نے سڑکیں تعمیر کیں۔ پلوں کی مرمت کی۔ سپلائی لائنوں کو بہتر بنایا۔ ٹینکوں کے لئے حفاظتی خندقیں کھودیں۔ مناسب فاصلوں پر انٹی ایئر کرافٹ گنیں نصب کیں اور بارودی سرنگوں کے علاقہ کو دور تک پھیلایا انہوں نے کویت کے آئل فیلڈز اور ریفائنریوں کو پلاسٹک بموں سے لیس کر دیا۔

صدام کے پاس شوارزکوف کو حیرت و سراسیمگی میں ڈالنے کے لئے ابھی بہت کچھ تھا۔ جنوری میں اس نے اپنی مضبوط اور مایہ ناز "ری پبلکن گارڈز" کو جنوبی عراق سے واپس بلا لیا۔ ان کی تعداد میں ڈیڑھ لاکھ کا اضافہ کیا سعودی سرحد پر تعینات سپاہیوں نے توپ چلانے کی تربیت مکمل نہیں کی تھی۔ تاہم ان پر یہ بھروسہ کیا جا سکتا تھا کہ اپنے مورچوں میں ڈٹے رہیں گے اور اپی اے کے۔47 توپوں سے فائر کرتے ہوئے پیش قدمی جاری رکھیں گے۔ ان کے پیچھے مضبوط میکنائزڈ اور آرمرڈ یونٹس اور آخر میں ری پبلکن گارڈز تعینات کئے گئے۔ اس طرح ایک انتہائی جدید صف بندی عمل میں آ گئی۔ پینٹاگون کے ایک افسر نے رائے ظاہر کی۔ "دشمن نے یہ صف بندی ہمیں گھیرے میں لینے کے لئے کی تھی۔ عراقیوں سے کہا گیا تھا تم جس امریکی کو مارو گے، اس کے خاندان سے جنگ کے خلاف احتجاج کی نئی لہر اٹھے گی۔ اگر امریکیوں نے ہماری خاصی تعداد کو ہلاک کر دیا تو بش کو از خود جنگ بند کرنی پڑے گی۔" صدام نے سمجھا کہ اس کے ہاتھ شوارزکوف کی دفاعی کمزوری آ گئی ہے یعنی امریکی

رائے عامہ ہوشیاری پر مبنی اگلے قدم کے طور پر صدام نے کویتی ساحل کے ساتھ انفنٹری یونٹوں کی جگہ آرمڈ دستے لگا دیئے عراق اور سعودی عرب کے مابین "غیر جانبدار علاقہ" میں بھی بکتربند دستے متعین کر دئیے گئے۔ وہ لائن جس پر شوارزکوف چاروں طرف سے حاوی ہونا چاہتا تھا، اب خطرناک طور پر طویل ہو گئی صاف نظر آنے لگا کہ اگر کور نمبر13 سامنے سے گزرنے میں کامیاب ہو جائے تب بھی وہ "ری پبلکن گارڈز" کو گھیرے میں نہیں لے سکے گی۔ وہ اسی پوزیشن میں ہوں گے کہ کویت سے ماریکیوں پر جوابی حملہ کر کے بھاری نقصان پہنچا سکیں۔ اور سیاسی عمل میں خلل ڈال سکیں۔ اس خطرہ سے نمٹنے کے لئے شوارزکوف کو پلان کی ضرورت تھی، جس میں مزید فوجوں کا مطالبہ شامل تھا۔ دشمن کو دائیں اور بائیں سے بے بس کرنے کے لئے وسیع پھیلاؤ کے ساتھ ایڈوانس کرنا تھا، تاکہ ری پبلکن گارڈز کو باقی فوج سے کاٹ کر گھیرے میں لیا جا سکے۔ اس غرض کے لئے اس نے جرمنی میں مقیم ساتویں کور منگانے کا فیصلہ کر لیا۔

چیئرمین جائنٹ چیفس کے دفتر میں فیلڈ کمانڈر کا ایک خیر خواہ موجود تھا۔ آئندہ ہفتوں کے دوران شوارزکوف نے اپنے نظریات کا ابتدائی خاکہ پاول کو بھیجا 21 اکتوبر کو پاول سے بات چیت کرنے کے لئے سعودی عرب پہنچا۔ ان کی یہ ملاقات بڑی اہم تھی۔ شوارزکوف کا دعوی تھا کہ اگر امریکہ دوسرے ویت نام سے بچنا چاہتا ہے تو اسے بلند تخیل اور جرات سے کام لینا ہو گا۔ اس نے کور نمبر7 اور دوسرے ضروری ساز و سامان کی فوری ترسیل کا مطالبہ کیا۔ پاول نے وطن پہنچتے ہی چینی کو ایک ایسے منصوبہ میں لگا دیا۔ جسے انہوں نے "انتخابات کا اضافہ شدہ حق" قرار دیا۔ پینٹاگون کے ایک باخبر ذرائع کے مطابق "جو شخص اس حکمت عملی پر غالب رہا وہ پاول تھا۔ وہ یہ نکتہ لے کر وطن لوٹا کہ ہمیں چھوٹے پیمانے پر نہیں سوچنا چاہئے۔ پاول نے اس نئے منصوبہ کے بارے باتوں میں صرف 25 چیدہ چیدہ سینیئر افسران کو اعتماد میں لیا۔ پلاننگ ٹیم نے شوارزکوف کی درخواست کو مزید تقویت پہنچائی۔ انہوں نے تین ایئر کرافٹ کیریئر سٹیل گروپس ایک سٹیل شپ، سیکنڈ میرین ایکسپی ڈیشنری فورس اور پانچواں یکسی ڈیشنری بریگیڈ محاذ پر روانہ کر دیئے ممکنہ کارروائی کے لئے تین آرمی سپیشل گارڈ کمیٹ بریگیڈز کو الرٹ کر دیا گیا۔ اس طرح یہ تعداد بتدریج بڑھ کر دو لاکھ تک پہنچ جائے گی۔ ان کا خیال تھا اگر صدر نے نئے منصوبہ کو منظور کر لیا تو شوارزکوف اپنی جنگی تیاریوں کو صدام سے دوگنا کرنے میں کامیاب ہو جائے گا۔

اس کے بعد جو کچھ ہوا، خاصا معلومات افزا ہے کہ پاول اور شوارزکوف نے پلان کے آخری حصہ کو انتظامیہ کے سویلین کے مقابلہ میں کہیں بہتر طور پر نمٹایا۔ 24 اکتوبر کو چینی کانگریس کے اجلاس گھر کے قریب ایک ساؤنڈ پروف کمرہ میں سینٹ کی آرمڈ سروسز کمیٹی کے روبرو بیان دینے گیا۔ اس نے فوجی اجتماع کے متعلق کچھ نہیں بتایا۔ اگلی صبح ٹی وی پر گفتگو کے دوران اس جانب اشارہ کیا کہ امریکہ شاید ایک لاکھ مزید فوج خلیج میں بھیجے گا۔ بعد ازاں یہ راز فاش ہو گیا کہ پینٹاگون وار زون میں فوجوں کے باری باری بھیجنے پر غور کر رہا ہے۔ آرمڈ سروسز کمیٹی کے ارکان بڑے برہم ہوئے۔ انہوں نے یہ جاننے کے لئے کہ اندر اندر کیا کھچڑی پک رہی ہے۔ ادھر ادھر فون کئے تو بتایا گیا کہ کوئی نیا قدم نہیں اٹھایا جا رہا ہے۔ یہ کہ فوجوں کی تعداد میں اضافہ کی کوئی تجویز زیر غور نہیں آئی۔ 30 اکتوبر کو پاول اور چینی نے ایک بریف میں صدر پر مزید واضح کر دیا اور بتایا کہ ڈیزرٹ شیلڈ کا دوسرا مرحلہ یعنی نیا فوجی احتجاج 15 جنوری تک مکمل ہو جائے گا۔ بش نے ان کی باتیں بڑی توجہ سے سنیں۔

اگلے روز بش بیکر، ہالووین، چینی پاول، سکوکرافٹ اور سنونو وائٹ ہاؤس میں اکٹھے ہوئے۔ بہت سے لوگوں نے صدر کو بتایا تھا۔ صدام کو اب بھی یقین نہیں کہ امریکہ اس کے خلاف طاقت استعمال کرنے والا ہے۔ قابل اعتماد فوجی دھمکی کی کامیابی کے لئے اسے اس کا یقین دلانا لازمی ہے۔ میز پر اضافہ شدہ منصوبہ پڑا تھا۔ بش نے اس کی منظوری دے دی۔ اس فیصلہ کی بدولت انتظامیہ دفاع سے نکل کر جارحانہ پوزیشن میں آ گئی اگرچہ کسی نے اس کو محسوس نہیں کیا۔

خود صدر کے ذہن میں بھی یہ بات نہیں آئی کہ یہ بتدریج اضافہ جنگ کا لازمی پیش خیمہ بن جائے گا۔ اس نے سوچا تھا کہ فوج کی اتنی بھاری تعداد سے مرعوب ہو کر صدام واپس چلا جائے گا۔

اجلاس میں شریک سب نے اس سے اتفاق کیا کہ بین الاقوامی کولیشن کے ممبران کو سٹریٹجی میں کی گئی تبدیلی سے لازماً مطلع کیا جائے۔ یہ سوال اپنی جگہ غور طلب تھا کہ اس تبدیلی پر اندرون ملک کسی ردعمل کا اظہار کیا جائے گا۔ وہ ایک بڑے حساس اور نازک موڑ پر کھڑے تھے۔ آخر میں طے پایا کہ یہ بات نومبر کے انتخابات سے پہلے عوام کو نہ بتائی جائے۔

طوفان آنے سے پہلے

اس روز سیکرٹری خارجہ نے خاکی یونیفارم اور کاؤ بوائے بوٹ پہن رکھے تھے اس کے ہیلی کاپٹر نے سعودی عرب میں ڈیڑھ گھنٹہ تک ریت کے لامتناہی سیف ٹیلوں سے لے کر فرسٹ کیولری ڈویژن کی آؤٹ پوسٹ تک پرواز کی۔ بیکر نیچے اترا تو ہوا کے ایک تیز جھونکے نے اس کا استقبال کیا۔ ریت کے ذروں نے اڑ کر اس کی پلکوں پر پاؤڈر لگا دیا اور گلے میں بھی گھس گئے۔ کھلے آسمان تلے 4200 ہم وطن فوجی اس کے منتظر تھے، اس کے ایک نائب نے دل میں سوچا "یہ وہ گاؤ دی ہیں جنہیں ہڑپ کر لیا جائے گا۔" سیکرٹری نے ایک مختصری جوشیلی تقریر کی "یہ جگہ گھر سے بہت دور ہے لیکن میرے خیال میں ہر وہ جگہ جہاں کچھ اصول ہوں، امریکیوں کا گھر ہوتی ہے" پھر وہ کیولری کے مردوں اور عورتوں میں گھل مل گئے۔ ان سے ہاتھ ملایا اور ان کا حوصلہ بڑھایا ان میں سے ہر ایک کا یہی کہنا تھا کہ "ہم اس قصہ کو پاک کر کے ہی اپنے وطن جائیں گے"۔

3 نومبر کو بیکر پھر ایک نازک مشن پر تھا۔ انتظامیہ اس مشکل مسئلہ سے دوچار تھی کہ صدام کو ایک سخت ترپیغام کیسے پہنچایا جائے تاکہ ملک میں اس اقدام کو اس مخالفانہ نقطہ نظر سے دیکھا جائے کہ صدر جنگ کا بھوکا ہے بش اور اس کے آدمی، ایسے وقت بھی جبکہ افواج کی تعداد میں بتدریج اضافہ کیا جا رہا تھا۔ ڈپلومیسی کو کام کرنے کا پورا پورا موقع دینا چاہتے تھے۔ اب امریکہ اقوام متحدہ سے ایک ایسی قرارداد پر مہر تصدیق ثبت کرانا چاہتا تھا جس میں اس امر کی اجازت ہو کہ اگر صدام کویت سے واپسی کے متعلق قراردادوں پر غیر مشروط انداز میں عمل نہ کرے تو اس کے خلاف طاقت استعمال کی جا سکتی ہے نیشنل سیکورٹی کونسل اور محکمہ دفاع کو اس تدبیر کے بارے میں یہ تشویش لاحق تھی کہ ممکن ہے اقوام متحدہ کچھ عرصہ بعد

نکل جانے کی منظوری دے۔ تاہم بیکر نے واضح کیا کہ اگر اقوام متحدہ نے جنگ کا اختیار دے دیا تو کانگریس کے لئے ویسا نہ کرنا مشکل ہو جائے گا۔

گویا بیکر کا یہ دورہ دو مقاصد کے لئے تھا۔ اتحاد کے لیڈروں کو توسیع شدہ منصوبہ کے دوسرے مرحلہ میں رکھے گئے مقاصد سے ہم آہنگ بنانا اور روس کو اقوام متحدہ کی طرف سے دئے گئے طاقت کے اختیار کی حمایت پر آمادہ کرنا۔ اس نے پہلا قیام جدہ میں کیا۔ جہاں اسے ایک اہم کامیابی حاصل ہوئی شہزادہ بندر نے شاہ فہد کے ساتھ ملاقات میں توسیع شدہ منصوبہ پر مکمل حمایت کی۔ "جناب سیکرٹری، آپ کا ساتھی لنڈن جانسن کہا کرتا تھا۔ کسی ساتھی کو ہر گز دوزخ میں جانے کو مت کہو جب تک آپ اسے وہاں بھیجنے کا پورا بندوبست نہ کر لیں"

دو روز بعد بیکر نے ماسکو کا رخ کیا۔ وہاں کا معاملہ اور بھی ٹیڑھا تھا۔ گورباچوف نے اپنا ذاتی ایلچی پریماکوف جو اسکول کے زمانہ سے پرانا عربی دان اور عراق کے ساتھ ماسکو کے خصوصی تعلقات کو ختم کرنے کا زبردست مخالف ہے، بغداد بھیجا۔ دوسری طرف وزیر خارجہ شیورڈنازے تھا جو معاملات کو بیکر کے انداز میں لے رہا تھا۔ آیا گورباچوف دونوں میں سے کس کا ساتھ دے گا؟ یہ گتھی حل طلب تھی۔ گورباچوف نے بیکر کو ماسکو سے باہر اپنی قیام گاہ پر بلایا۔ وہ اب بھی امن کے امکانات کی بابت پر امید تھا بشرطیکہ مخالف کو زیادہ اشتعال نہ دلایا جائے۔ اس نے کوئی وعدہ تو نہیں کیا۔ البتہ دو انگلیاں جوڑ کر کہا "ہم اس طرح اکٹھے رہیں گے" بعد میں شورڈ ناڈزے نے کہا "بعض مواقع ایسے آ سکتے ہیں۔ جب طاقت کے استعمال کی واقعی ضرورت پڑ جائے"۔

ادھر بیکر اتحادیوں میں کام کر رہا تھا۔ ادھر صدر سرما کے انتخاب میں مگن تھا۔ صدر نے یرغمالیوں کے مسئلہ کو اٹھا کر اور صدام کے خلاف گدھے کو ٹھوکر مارنے والا سخت لہجہ اختیار کر کے ملک بھر سے داد تو حاصل کر لی تاہم انتخابات میں سے 20 سے کم بھی پوائنٹس ملے۔ اس کی ایک وجہ تو خلیجی جنگ کے متعلق اعصاب دباؤ تھا۔ دوسرے بجٹ کی تیاری نے پریشان کر رکھا تھا۔ انتخاب کے دو روز بعد، اکتوبر کے اواخر میں بش نے اپنے فیصلہ کا اعلان کر دیا کہ خلیج میں فوجوں کی تعداد دگنی کی جا رہی ہے۔

فوجی اجتماع پر جو شور و غل مچا، بش کو اس پر حیرت ہوئی صدر کے ایک نائب نے بتایا " لوگوں نے اس فیصلہ سے یہ سمجھا کہ اب جنگ ناگزیر ہو گئی ہے۔ ہم نے اسے گیدڑ بھبکی کا ایک حصہ قرار دیا صدر کا خیال تھا کہ انتخاب گزرنے کے بعد وہ ڈیزرٹ شیلڈ کو اگلے مرحلے پر کام کرنے کے لئے فارغ ہو جائے گا۔ تاہم اس کے ساتھ ساتھ کانگرس والوں کو بھی مخالفت کے لئے فراغت مل گئی۔ انتخابات نے ظاہر کیا کہ زیادہ تر امریکی جنوری فروری تک پابندیاں جاری رکھنے کے حق میں ہیں۔ خواہ ناکام ہی کیوں نہ ہو جائیں۔ 10 نومبر کو بش نے اپنے متعدد قریبی دوستوں اور تعلقات عام کے مشیروں کو وائٹ ہاوس کے ایسٹ ونگ میں پہنچ کر مدعو کیا۔ بعض ملکی مسائل کے بعد گفتگو خلیج کی طرف مڑ گئی۔ صدر نے ان سے پوچھا "کیا میں غلط کر رہا ہوں؟" دوستوں کا جواب تھا " آپ کی حمایت کم ہو رہی ہے، یہ کہ ایک نہ ایک دن خلیج سے نکلنا ہو گا اور یہ جواب دینا پڑے گا کہ وہاں کیوں گئے تھے؟" اس مشورہ نے محض اس کی مایوسی میں اضافہ کیا۔ اس نے کہا۔ "میں اپنا کیس کئی بار قوم کے سامنے پیش کر چکا ہوں"

سینٹ کی آرمڈ سروسز کمیٹی کا چیئرمین سینیٹر سام نن (جارجیا) سب سے زیادہ برہم تھا۔ اگست ۱۹۹۰ء جب پاول نے نن اور دیگر سینیٹروں کو ابتدائی صف بندی کے بارے میں بریف کیا تو بتایا تھا کہ منصوبہ یہ ہے کہ فضائی قوت زمینی امداد کے ساتھ کام میں لائی جائے گی۔ اس نے زمینی افواج کی تعداد کے متعلق ایک لفظ بھی نہیں کہا تھا۔ صدر بھی ڈیزرٹ شیلڈ کے مرحلہ دوم کی بابت نن کو اعتماد میں لینے میں ناکام ہو گیا۔ چینی نے افواج کے بھاری احتجاج کے بارے میں اسے صدر کے اعلان سے صرف ایک گھنٹہ پیشتر جارجیا میں فون کر کے مطلع کیا تھا۔ نن نے بعد میں شکایت کرتے ہوئے کہا "مجھ سے کوئی صلاح مشورہ نہیں کیا گیا، صرف فون پر اطلاع دی گئی تھی" اس نے "سی بی ایس" کے پروگرام THE NATIONAL FACE میں انٹرویو دیتے ہوئے کھل کر کہا "بش موقع پر غلط سٹریٹیجی سے کام لے رہے ہیں۔ یہ کہ کویت خالی کرنے کے لئے عراق کو پابندیوں کے ذریعے مجبور کرنا ایک بات ہے جبکہ توپوں [illegible] ایسا کرنا بالکل دوسری بات ہو گی۔ اور یہ کہ بش صدام کے ہاتھوں میں کھیل رہے

ہیں

نن نے لوگوں کو دعوت دی کہ آکر اس کی کمیٹی کے سامنے بیان دیں۔ اس اقدام سے بحرانی کی بابت وسیع پیمانہ پر قومی بحث چھڑ گئی۔ ابتدائی گواہوں میں جائنٹ چیفس آف سٹاف کے سابقہ چیئرمین اور سابقہ سیکرٹری دفاع شامل تھے۔ انہوں نے اس بات پر بڑا زور دیا کہ پابندیوں کا آزمانے کا مناسب موقع ملنا چاہئے۔ اس چیز نے مسئلہ کے سیاسی لحاظ سے مخالفین مثلاً ایوان کے سپیکر تھامس فولے۔ سینٹ کے اکثریتی لیڈر جان مچل اور دوسری ڈیموکریٹس کو، جو فوج کے استعمال کے بارے میں ٹھوس شبہات رکھتے تھے، نکتہ چینی میں اور بھی دلیر کر دیا۔ اپوزیشن کیمپ بھی اتفاق سے کوسوں دور تھا بعض ڈیموکریٹس نے بش کی سیاسی کمزوری صاف محسوس کر لی اور اس سے سیاسی فائدہ اٹھانے کی تدبیریں سوچنے لگے۔ بعض کسی بھی قیمت پر جنگ نہیں چاہتے تھے۔ بعض کے خیال میں اصل مسئلہ تیل کا تھا اور اس کے لئے جنگ کرنے کی کوئی ضرورت نہیں تھی۔ بعض ایسے بھی تھے جو نن، ایوان نمائندگان کی آرمڈ سروسز کمیٹی کے چیئرمین لیس آسپن (ری پبلکن) کی طرح اس یقین کے حامل تھے کہ اگر لڑائی ناگزیر ہو جائے تو بری حد تک فضائیہ سے کام چلایا جائے۔

اس سے پہلے کہ سیاسی توازن دوبارہ حاصل ہو، صدر اور اس کے مشیر ایک بار پھر غلطی کر گئے۔ ان کی ایک آنکھ انتخابات پر تھی اسی عالم میں انہوں نے فجائیہ قسم کے ایسے الفاظ سوچنے شروع کر دئے جو بش کی انتخابی مہم کے دوران وضع کئے تھے جب انتخابات لڑنے والوں نے کہا کہ امریکی صدام کی ان مساعی سے بہت پریشان ہیں جو وہ نیوکلیئر ہتھیار حاصل کرنے کے سلسلہ میں کر رہا ہے تو انتظامیہ کی طرف سے جواب دیا گیا کہ صدام کو بم کے حصول میں کم از کم ایک سال ضرور لگے گا۔ پانچ سال نہیں لگیں گے۔ جیسا کہ سی آئی اے والوں کا دعویٰ ہے ایک اور موقع پر بیکر نے کہا خلیج میں افراتفری کے ساتھ جو کچھ کیا جا رہا ہے۔ اسے مختصر الفاظ میں "بہت سے کام" کہا جا سکتا ہے اس کی بات سو فیصد درست تھی۔ صدام نے خلیج کے تیل پر کنٹرول کرنے کی جو کوشش کی۔ اس سے امریکہ کی معیشت کے لئے براہ راست خطرہ پیدا ہو گیا تاہم انتظامیہ کی صف بندی مہم بہت سریع الحرکت تھی۔ فجائیہ الفاظ کی

مہم بھی ناکام ہو گئی۔ صدر کے سابق مشیروں میں سے ایک نے بتایا "وہ ایک پریشان کن مظاہرہ تھا۔ تاہم بہت تھوڑے لوگ بیوقوفی کا شکار ہوئے"۔

بش گلف میں شکریہ ادا کرنے کے دورہ سے لوٹا تو خاصا افسردہ تھا۔ اس نے وہاں ان مرد و زن کی آنکھوں میں جھانک کر صورت حال کا اندازہ لگایا لیا تھا جو آئندہ جنگ میں لقمہ اجل بننے کے خوف سے سہمے ہوئے تھے۔ مشیرون نے بش کے رویہ میں تبدیل محسوس کی اس کی زندہ دلی اور چھوٹوں پر لطف و کرم یکسر غائب ہو گیا۔ وہ اپنے سٹاف کے ساتھ بھی روکھے پن کا سلوک کرنے لگا۔ ایمنسٹی انٹرنیشنل کی طرف سے کویت میں ڈھائے گئے عراقی مظالم کی تفصیل دیکھی تو بش لرز گیا۔ ائیر فورس ون میں دوران سفر مارٹن گلبرٹ کی کتاب <War The Second World" کا مطالعہ کیا۔ اس نے اپنے نائیسن کو بتایا۔ 1939ء، ہٹلر کے "Death Head" دستہ نے پولینڈ پر حملہ کے دوران جو کام کئے تھے۔ کویت پر لشکر کشی کے موقع پر عراقیوں نے بھی ویسے ہی جرائم کا ارتکاب کیا۔ وہ اس بات کا قائل ہو چکا تھا کہ صدام اتنا ظالم شخص ہے اگر کوئی اسے محروم اقتدار کر دے تو اخلاقی لحاظ سے بالکل حق بجانب ہو گا۔ جب اسکوپلی چرچ کے پریذائڈنگ بشپ ایڈمنڈ براؤننگ بش کو صبر و تحمل سے کام لینے کی تلقین کرنے آیا تو اس کا جواب تھا "آپ پہلے ایمنسٹی انٹرنیشنل کی رپورٹ کا مطالعہ کریں۔ اس کے بعد مجھے بتائیں کہ میں کیا کروں؟

دریں اثناء بیکر اقوام متحدہ کے سیکرٹری جنرل کی توجہ اس طرف مبذول کرا رہا تھا کہ صدام کے خلاف طاقت کے استعمال کی اجازت کے بارے میں قرارداد کی توثیق کر دے۔ اس کی راہ میں ایک رکاوٹ حائل تھی۔ سوویت یونین نے ڈیڈ لائن پر اصرار کیا۔ اس کا خیال تھا کہ وہ مددگار ثابت ہو گی۔ بیکر اس کے خلاف تھا۔ تاہم روسیوں کا اصرار بڑھتا گیا۔ پھر اس نے یکم جنوری کی تاریخ تجویز کی۔ روس نے 15 جنوری پر زور دیا تو اس کی بات مان لی گئی۔ 30 جنوری کو سلامتی کونسل نے بھی مذکورہ قرارداد کی منظوری دے دی۔

اگرچہ بیکر نے میدان مار لیا تھا۔ تاہم انتظامیہ ایک بار پھر متضاد سٹریٹیجی پر عمل درآمد کی کوشش میں مصروف نظر آئی اسے ایسے موقع پر جبکہ معاشرہ صدام کی بے تابیوں پر تیل

چھڑکنے میں کوشاں تھا۔ اندرونی شورش بند کرانے پر خاص توجہ دینی پڑی۔ اقوام متحدہ کی قرارداد نے امریکہ میں مزید ہیجان برپا کر دیا۔ اسے ٹھنڈا کرنے کی غرض سے بش نے ایک نئی سفارتی چال چلی۔ ٹیلی ویژن پر قوم سے خطاب کے دوران اس نے عراق کے وزیر خارجہ کو واشنگٹن آنے کی دعوت دی اور بیکر کو بغداد بھیجنے کی پیش کش کی۔ صدام نے دعوت قبول کر لی۔ تمام یرغمالیوں کو رہا کر کے اس نے بش کے جذبہ خیر سگالی کو مات دے دی۔ اس نے بش اور بیکر نے یہ امید وابستہ کر لی کہ اب صدام اقوام متحدہ کی باقی تمام قراردادیں بھی مان لے گا۔ حالانکہ وہ خود ان قراردادوں کی غیر مشروط تعمیل کے مطالبہ سے ایک انچ پیچھے نہیں ہٹے۔ وہ کئی مہینوں سے اصرار کر رہے تھے کہ کویت خالی کرنے کے بعد اس کے بعد مطالبات مثلاً مشرق وسطیٰ پر امن کانفرنس کے ایجنڈہ میں فلسطینیوں کے مسئلہ اور کویت کے ساتھ سرحدوں کے تعین کا سوال شامل ہو گا۔ مختلف معاملات کو "باہم منسلک کرنے" کے سوال پر وہ اس حد سے آگے نہیں جا سکے۔ صدام نے کسی مرحلہ پر بھی اس غیر محدود سودا بازی میں دلچسپی کا اظہار نہیں کیا اس نے پیغام بھیجا کہ اقوام متحدہ کی ڈیڈ لائن سے پہلے بیکر کو بغداد میں خوش آمدید نہیں کہہ سکے گا۔ اب یہ بات عیاں ہو گئی کہ وہ افہام و تفہیم پر یقین نہیں رکھتا۔ محض معاملہ کو ٹالنے کی کوشش کر رہا ہے۔

مصیبت یہ تھی کہ انتظامیہ کو بیک وقت دو بالکل متضاد قسم کے لوگوں سے نمٹنا پڑ رہا تھا۔ ایک طرف خوفزدہ امریکی عوام تھے دوسری طرف صدام جیسا لاپرواہ اور نڈر ڈکٹیٹر۔ وہ ایک طرف سے کامیاب ہوتے تو دوسری طرف سے ناکامی اٹھانی پڑتی۔ بش نے واشنگٹن اور بغداد ملاقاتوں کی جو تجویز پیش کی۔ اس نے امن کیمپ کو قدرے مطمئن کر دیا۔ ممکن ہے اس نے صدام کی اس سوچ کو تقویت ملی ہو کہ امریکیوں میں لڑنے کا حوصلہ نہیں۔ دلیل کے طور پر کہا گیا کہ سیکورٹی کونسل کی کارروائی سے بالاخر اس کی توجہ اپنی طرف کھینچ لی ہے اسے آنے والی خوفناک گھڑی کا احساس ہو گیا ہے اب وہ محض جان چھڑانے کی کوشش کر رہا ہے۔ یرغمالیوں کی از خود رہائی اسی تدبیر کا حصہ ہے۔ دوسری طرف یہ کہا جا رہا تھا کہ وہ اقوام متحدہ کی قراردادوں پر عمل کرنے کا کوئی ارادہ نہیں رکھتا۔ اس نے امریکی ڈپلومیسی اور کانگریس کی تنقید کو

کمزوری کی دلیل سمجھا ہے یہ کہ اسے قطعاً یقین نہیں کہ امریکہ واقعی ہاتھ دھو کر اس کے پیچھے پڑ گیا ہے۔ انتظامیہ کے ایک مایوس اور افسردہ افسر نے کہا "آپ ہی بتائیے ان دونوں میں سے کون سی بات قابل یقین ہے"۔

ادھر بش صدام کے ساتھ عزیز اور بیکر کے دورہ کے بارے میں تاریخوں کے تعین کی بحث میں الجھ گیا۔ ادھر کانگریس نے اس مسئلہ پر اعتراضات کی بوچھاڑ کر دی کہ وہ اقتصادی پابندیوں کے کام کرنے کی معقول مہلت نہیں دے رہا ہے۔ جوں جوں قومی بحث میں شدت پیدا ہوتی۔ دفتر کی سطح پر بھی ان کی ذات تنقید کا نشانہ بننے لگی۔ ایک دن سیکرٹری آف سٹیٹ ایک میٹنگ میں یہ جاننے کے لئے جا دھمکا کہ اس کی خاتون مشیروں میں سے دو اس کے آدمیوں کے ساتھ بعض معاملات پر الجھ رہی تھیں۔ بیکر حضرات کے مابین واضح اختلاف رائے پایا جاتا ہے مجھے اس کا اندازہ آج ہوا ہے۔ میں اسے اب محسوس کر رہا ہوں۔" وہ کشیدگی کم کرنا چاہتا تھا مگر اپنے مقصد میں کامیاب نہیں ہوا۔ قانون سازی سے متعلق امور کے چیف مشیر نے کہا "آپ ٹھیک کہتے ہیں عورتیں واقعی مختلف انداز میں سوچتی ہیں۔ ان کی سوچ کا محور یہ ہے آیا ان کے بیٹوں اور بیٹیوں کو مروانے کے لئے محاذ جنگ پر بھیجا جا رہا ہے وہ صدر کا حکم سن کر سخت برہمی اور آزردگی کے عالم میں ہیں"۔

پاول اور چینی نے کرسمس سے ایک ہفتہ قبل بڑھتے ہوئے چڑچڑے پن کی اس فضا میں سعودی عرب کو پرواز کی۔ سفر کے دوران چھوٹی سی الجھن نے سر اٹھایا چینی کے ساتھ آٹھ رپورٹر آئے تھے۔ پریس معاون نے لیفٹیننٹ جنرل کالون اسے پیچ والر کے ساتھ اس کی ملاقات کرائی۔ گمراہ کن اخلاص مندی کے ایک مظاہرے کے دوران جنرل نے انہیں بتا دیا کہ "میں نہیں سمجھتا کہ فوج وسط فروری سے پہلے حملہ کے لئے پوری طرح تیار ہوگی آپ گیدڑ بھبکیوں سے راز فاش ہونے کی بات سن چکے ہیں۔ بعد ازاں شوارزکوف نے اسے پریس سے نمٹنے کے لئے کچھ مخفی ہدایات دیں۔ ایک سٹاف میٹنگ میں چینی نے کہا۔ "ہم این ایف ایل کے جنرل کو خوش آمدید کہتے ہیں"۔ یہ توازن پیدا کرنے والے نازک کام کا ایک مثبت سبق تھا۔ جو ایک طرف انتظامیہ حاصل کرنے کی کوشش کر رہی تھی۔ دوسری

طرف اس کا تقاضا تھا کہ فوجی پلاننگ سپاہیوں پر چھوڑ دی جائے۔ ان سے توقع کی گئی کہ وہ سیاستدانوں کی طرح پیش آئیں۔

کرسمس سے چار روز قبل بش نے بی وائل مرغ کا سالانہ شکار کھیلا۔ اس نے نئے سال کی تقریب ہوسٹن میں منائی۔ پھر وہ بارہ دن کی رخصت پر کیمپ ڈیوڈ چلے گئے وہاں سے گورباچوف اور دیگر عالمی رہنماؤں کے ساتھ فون پر رابطہ قائم کیا اپنے سٹاف کے ارکان، کانگریس کے ممبران اور ذاتی دوستوں کے بارے میں رائے کا جائزہ لیا۔ اس کام سے فارغ ہو کر وہ سوچ کی اتھاہ گہرائیوں میں کھو گیا۔ اس کے ایک قریبی افسر نے بتایا "اس موقع پر بش نے اپنے پرائیویٹ خدا سے دل کی باتیں کیں۔ جب چرچ سے لوٹا تو ایسا لگتا تھا اس کی دعا قبول ہو گئی ہے" اس نے اس امکان کے ساتھ سمجھوتہ کر لیا تھا کہ صدام اپنے دعویٰ سے ہرگز دستبردار نہیں ہو گا۔ یہ کہ اقوام متحدہ کی قراردادوں پر عمل کرانے کے لئے جنگ لڑنی پڑے گی۔

سال نو کے روز بش نے اپنے نصف درجن کے قریب ترین دوستوں اور مشیروں کو وائٹ ہاؤس میں آنے کی دعوت دی۔ انہوں نے اوپر کی منزل کے فیملی کوارٹرز میں ملاقات کی۔ ایک گھنٹہ چاندی کی پیالوں میں ہلکے مشروبات پینے اور پاپ کارن کھانے میں گزارا پھر وہ انتخابات کی باتیں کرنے لگے۔ صدر سنتا رہا۔ اس کے بعد کانگریس کے آئندہ اجلاس میں متوقع بحث پر تبادلہ خیال ہوا۔ اسے اسرائیلیوں کے بارے میں پریشانی تھی۔ بین الاقوامی کولیشن میں اختلافات پیدا ہونے کے امکان پر بھی بات ہوئی۔ ڈیزرٹ شیلڈ کے متعلق زیادہ گفتگو نہیں کی گئی۔ اگلے روز بش نے سال نو کے موقع پر ہونے والے سینیئر سٹاف کے اجلاس میں شرکت کی۔ جب خلیج کے متعلق اپنے خیالات ظاہر کئے تو پتہ چل گیا کہ جنگ شروع ہونے کے بارے میں وہ جسے بھی مشکوک رکھتا تھا۔ کیمپ ڈیوڈ میں وہ سب دور کر لئے تھے۔ اس نے لوگوں کو بتایا کہ میں نے اس مسئلہ کے ساتھ مصالحت کر لی ہے۔ اسے خواب اچھی طرح سمجھ لیا ہے۔ میرے شکوک بھاپ بن کر اڑ گئے ہیں۔ اگر مجھے قدم اٹھانا پڑا تو اس سے کوئی فرق نہیں پڑے گا۔ کہ کانگریس میں کوئی شخص میری مدد کرتا ہے یا نہیں اور یہ کہ

رائے عامہ کیا کہے گی میرے خیال میں یہ ایک درست قدم ہے مجھے بہر صورت یہ کام کرنا ہے صدام کو ایک آخری موقع دینے کے لئے "بش نے پیشکش کی کہ وہ بیکر کو عزیز کے ساتھ ملاقات کے لئے جنیوا بھیجے گا۔ اس خیر سگالی کا مقصد کانگریس کو ایک بار پھر یقین دلانا تھا کہ جو جنگ کے اجازت نامہ سے متعلق قرار داد پر بحث کرنے والی تھی۔ دنیا میں امید کی نئی کرن پھوٹی۔ مصالحت کے بارے میں قیاس آرائیاں ہونے لگیں۔ تاہم بش کو عزیز پر قطعاً اعتماد نہ تھا۔ اس کی نظر میں عزیز صدام کا ایک ایسا "پالتو کتا" تھا جو شاید صدام کو یہ بھی نہ بتائے کہ بیکر نے اس سے کیا کہا تھا۔ اس بات کو یقینی بنانے کے لئے کہ ملاقات میں خوش فہمیاں وقوع پذیر نہ ہوں۔ اس نے صدام کے نام ایک مراسلہ لکھا تھا لیکن عزیز نے اسے لینے سے صاف انکار کر دیا۔ یہ توہین ایک سیاسی تحفہ ثابت ہوئی۔ صدر پر انتہا پسندی کا جو الزام لگایا جا رہا تھا۔ اس کا داغ دھل گیا۔ تین دن بعد کانگریس میں طاقت کے استعمال پر ووٹنگ ہوئی۔ سینیٹ میں صرف ۵ ووٹوں کے فرق سے منظوری دی گئی۔ اس سے ہار جیت کے مابین کمزور فرق واضح ہو گیا۔ کوئی بھی ایسے صدر کا جو کانگریس کی صریح خواہش کے برعکس جنگ پر تلا ہوا تھا۔ آئینی تماشا دیکھنے کا روادار نہیں تھا۔

جونہی 15 جنوری کی ڈیڈ لائن قریب پہنچی، بوڑھے بش کے رویہ میں خوشگوار تبدیلی محسوس ہونے لگی۔ اسے اب بھی یقین نہیں آ رہا تھا کہ صدام سامان حرب پر بھروسہ کرے گا چینی پاول، اور شوارزکوف نے بنا سنوار کر کیس پیش کر دیا تھا صدر کے اب بھی یقین نہ کرنے کا مطلب یہ تھا کہ نئے منصوبہ پر عمل کیا جائے۔ صدام اپنے عوام اور ملک کو محض بے جا غرور اور گھمنڈ کے باعث مروانے پر جس طرح تیار ہو چکا تھا۔ بش نے اس سے بیزاری کا اظہار کیا۔ تاہم وہ بش کی سر دردی نہیں تھی۔ اس پر اپنا راستہ بالکل روشن ہو گیا تھا۔ کمانڈر انچیف کے اعلیٰ ترین سپاہی، پاول نے افواج سے کہہ دیا تھا۔ "اگر ہم لڑے تو فتح کے لئے لڑیں گے، اپنا مذاق نہیں اڑوائیں گے۔" صدام اس پیغام کو بھی نہ سمجھ پایا۔ جنگ کی شاہراہ ختم ہو گئی۔ جیٹ طیاروں کی گڑگڑاہٹ اور میزائلوں کی روشنی سے ڈیزرٹ شیلڈ ڈیزرٹ سٹارم میں تبدیل ہو گیا۔

(یہ حصہ ہفت روزہ زندگی کی 9 تا 15 مارچ کی اشاعت سے لیا گیا جس کے لئے مصنف شکر گزار ہے)

نئی دنیا۔ دہلی

امریکی صدر جارج بش کی مرضی اور امریکی دفاعی ادارہ پنٹاگون کے مشورہ کے خلاف خلیجی جنگ آخر کار بند ہو گئی۔ امریکی کمانڈر انچیف نارمن شوازکوف میدان جنگ میں اتحادی فوجیوں کی کامیابی کے چاہے جتنے بھی ڈھول پیٹیں امریکی و برطانوی سیاستداں جانتے ہیں کہ اس جنگ میں وہ سیاسی فتح حاصل کرنے میں ناکام رہے ہیں۔ پوری دنیا پر یہ بات واضح تھی اور خود امریکی صدر بش اور برطانوی وزیر اعظم جان میجر اس بات کا اعتراف کر رہے تھے کہ خلیجی جنگ کا مقصد کویت کو عراق کے قبضہ سے آزاد کرانا نہیں بلکہ صدام حسین کو ختم کرنا اور عراق پر قبضہ کر کے اسے تباہ و برباد کرنا ہے۔ اگر مقصد کویت کی آزادی ہوتا تو صدام حسین اگست ء کو کویت پر قبضہ کے فوراً بعد ہی پیچھے ہٹنے کو تیار تھے جنوری سے پہلے بھی صدام حسین نے اقوام متحدہ کے سیکرٹری جنرل پیرس ڈی کویار پر یہ واضح کر دیا تھا کہ وہ کویت سے ہٹنے کو تیار ہیں۔ مگر امریکہ واس کے پٹھو ممالک اس کے لئے قطعاً تیار نہیں تھے۔ وہ عراق پر حملہ کر کے اسے نیست و نابود کرنا چاہتے تھے۔ حقیقت یہ ہے کہ فروری کو امریکی صدر بش کے جنگ بندی کے اعلان سے چند گھنٹے قبل تک امریکی کمانڈر انچیف و وزیر خارجہ جیمز بیکر کھلے عام یہ اعتراف کر رہے تھے کہ جنگ کا مقصد عراق پر قبضہ اور صدام کی موت ہے۔ اسی بنیاد پر امریکہ نے روسی امن پلان نامنظور کر دیا تھا۔ پھر آخر اچانک ایسی کونسی بات ہو گئی جس کی وجہ سے چند گھنٹے بعد اچانک صدر جارج بش نے امریکی عوام کے نام ٹیلی ویژن پر خصوصی خطاب میں یہ اعلان کیا کہ وہ جنگ بند کر رہے ہیں۔

ان چند گھنٹوں میں آخر ایسی کون سی بات ہو گئی جس کی وجہ سے امریکہ، برطانیہ اور اسرائیل کو جنگ کے اصل مقاصد کو خیرباد کہنا پڑا۔ خود امریکی کمانڈر انچیف شوارکوف کے مطابق اتحادی اگر چاہتے تو وہ بغداد پر قبضہ کر سکتے تھے۔ پھر سوال یہ ہے کہ انہوں نے ایسا

یوں نہیں کیا۔ اچانک امریکیوں نے بغداد پر قبضہ، صدام حسین کی موت اور عراق کے ٹکڑے ٹکڑے کرنے کا پلان کیوں ملتوی کیا۔

روسی ایرانی دھمکی

نئی دنیا کی اطلاعات کے مطابق امریکہ اچانک جنگ بند کرنے کے لئے دو تین وجوہات کی بنا پر مجبور ہوا۔ اس سلسلہ میں سب سے اہم وہ دھمکی تھی جو روسی صدر گورباچوف اور ایرانی صدر رفسنجانی نے امریکہ کو دی تھی۔ اس معاملے میں راجیو گاندھی نے بہت اہم رول ادا کیا تھا۔ بلکہ اس جنگ کے سوال پر روس اور ایران کو قریب لانے کا سہرا راجیو گاندھی کے سر تھا۔ راجیو گاندھی نے گورباچوف پر دباؤ ڈالا تھا کہ وہ عراق کی بربادی کو روکیں اور امریکہ کو بغداد پر قبضہ سے باز رکھیں۔ انہوں نے روس پر یہ واضح کر دیا تھا کہ ایسا ہوا تو پورے ایشیا پر امریکہ کا تسلط قائم ہو جائے گا۔ ان کی کوششوں کا نتیجہ یہ ہوا کہ روس جو ابھی تک خلیجی جنگ کا تماشائی بنا ہوا تھا سرگرم ہو گیا اور گورباچوف نے بش پر واضح کر دیا کہ کویت سے عراقی فوجوں کے انخلاء کے سوال پر تو وہ اتحادیوں کے ساتھ ہے مگر وہ اس کے آگے جانے کو تیار نہیں ہے۔ اگر بغداد اور بصریٰ پر قبضہ کی کوشش کی گئی، صدام حسین کو قتل کرنے کی کوشش کی گئی، صدام حسین کو قتل کرنے کی کوشش ہوئی یا عراق کے ٹکڑے ٹکڑے کرنے کے پلان پر عمل در آمد ہوا تو روس بھی میدان جنگ میں آجائے گا اور عراق کی مدد و حمایت کرنے پر مجبور ہو گا۔ پھر یہ جنگ عالمی جنگ کی شکل اختیار کر لے گی اور تمام تر نتائج کی ذمہ داری امریکہ پر ہو گی۔

ادھر ایران کے صدر رفسنجانی اور راجیو کے درمیان طویل ملاقاتیں ہوئیں راجیو گاندھی گورباچوف کا خصوصی پیغام لے کر ایران گئے تھے یہاں یہ حکمت عملی تیار ہوئی کہ امریکہ اور اس کے حلیف ممالک عراق پر قبضہ کے منصوبہ سے باز نہ آئے تو ایران بھی اس جنگ میں براہ راست حصہ لینے پر مجبور ہو جائے گا۔ ایرانی ہوائی اڈے عراقی طیاروں کی اڑان کے لئے استعمال کرنے کی اجازت دے دی جائے گی۔ بلکہ بصریٰ پر اتحادی فوجوں نے قبضہ کی کوشش کی تو ایران اسے ناکام بنانے کے لئے زمینی جنگ میں شامل ہو جائے گا۔ اس

دھمکی سے جارج بش گھبرائے کیونکہ ایسا ہونے سے طاقت کے توازن پر تو زیادہ اثر نہ پڑتا مگر میدان جنگ پھیل جاتا اور امریکہ و اس کے حلیف ممالک کو اپنے اندازوں سے زیادہ نقصان کا سامنا کرنا پڑتا۔

اب تک روس نے عراق کو کیمیائی ہتھیاروں کے استعمال سے باز رکھا تھا۔ مگر اب عراق نے روس پر واضح کر دیا تھا۔ مگر اب عراق نے روس پر واضح کر دیا تھا کہ وہ مزید صبر سے کام نہیں لے سکتا۔ اس لئے مجبوراً انھیں اپنے دفاع کے لئے ان ہتھیاروں کا استعمال کرنا ہی ہو گا اور اس کے جو بھی نتائج ہوں گے ان کی ذمہ داری امریکہ کے سر ہو گی۔ جارج بش کو یہ بھی اندازہ تھا۔ کہ عراق نے اسرائیل کے خلاف کیمیائی و جراثیمی ہتھیاروں کا استعمال کیا تو وہ جوابی کارروائی کے طور پر عراق پر ایٹمی حملہ کر سکتا ہے جو پوری دنیا میں زلزلہ پیدا کر دے گا۔ امریکی اتحاد پاش پاش ہو جائے گا۔ خود یورپ کے ممالک اور جاپان وغیرہ امریکی جنگی عزائم کی مخالفت شروع کر دیں گے۔ بلکہ حقیقت یہ ہے کہ اس اتحاد میں پہلے ہی پھوٹ پڑ چکی تھی۔ جب کہ اسرائیل، کویت اور سعودی عرب کو صدر صدام حسین کا سر چاہیے تھا اور عراق کی مکمل تباہی و بربادی چاہیے تھی جرمنی، فرانس و اٹلی جنگ جاری رکھنے کی مخالفت کر رہے تھے۔

امریکی صدر بش کے قدم پیچھے ہٹانے کی ایک وجہ یہ بھی تھی کہ نصیریہ - بصریٰ سیکٹر میں صدام کے ری پبلکن گارڈز سے ٹکر اتحادیوں کو بہت مہنگی پڑ رہی تھی پچھلے 40 دن سے زبردست فضائی بمباری کا شکار ہونے، مواصلاتی نظام درہم برہم ہونے اور رسد کی لائن کٹ جانے کے باوجود ری پبلکن گارڈ بہت جذبہ اور ہمت سے اتحادی فوجوں کا مقابلہ کر رہے تھے۔ کویت میں تعینات نیم منظم عراقی فوج کے مقابلے میں ری پبلکن گارڈ کسی قیمت پر ہتھیار ڈالنے کو تیار نہیں تھے۔ بلکہ وہ ہر قیمت پر عراق کی سرزمین کی حفاظت کے لئے تیار نظر آ رہے تھے۔ یہ واضح تھا کہ صدام حسین نے کویت سے باہر نکلنے کا پلان بہت پہلے بنایا تھا۔ اس لئے ان کی یہ فوج کویت میں نہیں بلکہ کویت عراق سرحد پر تعینات تھی۔ اس کے علاوہ بمباری توپخانہ اور جدید ترین ٹینک بھی پہلے ہی کویت سے نکالے جا چکے تھے۔ نتیجہ یہ ہوا کہ

کویت میں تعینات نیم تربیت یافتہ عراقی فوج نے تو زیادہ مزاحمت کئے بغیر ہتھیار ڈال دیے مگر ری پبلکن گارڈز نے اتحادیوں کے دانت کھٹے کردئے۔

ری پبلکن گارڈ کے ہاتھوں اتحادیوں کو زبردست جانی نقصان کا سامنا کرنا پڑا حالانکہ اتحادیوں نے اپنے مرنے والوں کی تعداد پر پردہ ڈال رکھا ہے پھر بھی اب حقائق آہستہ آہستہ سامنے آرہے ہیں۔ برطانوی روزنامہ انڈپنڈنٹ کے مطابق اس جنگ میں کئی ہزار امریکی و برطانوی ہلاک ہوئے ہیں اور جس ہمت، جوش اور جذبہ سے ری پبلکن گارڈ لڑ رہے تھے اس کے نتیجہ میں اتحادیوں کا زبردست جانی نقصان ہو سکتا تھا۔ ان کی فضائی برتری کے باوجود ان کی فتح شکست میں بدل سکتی تھی۔ خود امریکی صحافیوں کے مطابق ری پبلکن گارڈ کے جوش و جذبہ کا یہ عالم ہے کہ امریکی جنگ بندی کا اعلان کے باوجود ری پبلکن گارڈ کے حملوں میں کوئی کمی واقع نہیں ہوئی۔ ہتھیار ڈالنا تو دور کی بات ہے وہ امریکی جنگ بندی کے باوجود اپنے حملے روکنے کے لئے تیار نہیں تھے۔ ادھر بغداد سے ان کا رابطہ ٹوٹ چکا تھا۔ بہر حال بغداد ریڈیو پر جنگ بندی کے اعلان کے بعد ہی ری پبلکن گارڈ نے جنگ بند کی۔

امریکی پروپیگنڈہ

اس میں شک نہیں ہے کہ عراقی فوج کو کویت میں زبردست نقصان اٹھانا پڑا ہے لیکن یہ اتنا نہیں کہ جتنا امریکی وان کے اتحادی پروپیگنڈہ کر رہے ہیں۔ عراقی فضائیہ، ہیلی کاپٹر، میزائل اعلیٰ قسم کے ٹینک اور توپیں بڑی تعداد میں اب بھی محفوظ ہیں۔ کیونکہ صدام حسین کی حکمت عملی یہ تھی کہ بجائے کویت کی جنگ لڑنے کے عراق کی جنگ لڑی جائے انہیں معلوم تھا کہ امریکیوں کا اصل مقصد کویت پر نہیں عراق پر قبضہ ہے۔ کویت کے قبضہ کے سوال پر تو خود عراق کے حمایتی ملک بھی ان کے ساتھ نہیں ہیں۔ مگر عراق پر قبضہ کے سوال پر دنیا کے بیشتر ممالک ان کا ساتھ دیں گے۔ اس لئے انہوں نے عراق کی حفاظت کے لئے بھی جنگ لڑنے کی حکمت عملی تیار کی تھی۔ اگر امریکہ واس کے اتحادی اس وقت جنگ بندی کے لئے راضی نہ ہوتے تو پھر عراق ان کے خلاف کیمیائی ہتھیاروں کا استعمال بھی کرتا اور بین الاقوامی سطح پر اسے دنیا بھر کی ہمدردیاں بھی حاصل ہوتیں۔

بہر حال امریکی صدر بش پر روسی و ایرانی دباؤ کا اثر بھی پڑا۔ امریکی لاشوں کے بڑھتے ہوئے ڈھیر سے بھی وہ خوفزدہ ہوئے، عراقی کیمیائی حملوں کا خوف بھی پیدا ہوا، ری پبلکن گارڈز کے عزم نے بھی امریکی عزم کے پاؤں میں زنجیر ڈالی اور بش جنگ بندی کے لئے راضی ہو گئے۔

کون جیتا

امریکہ و اتحادی عراق سے کویت خالی کرانے میں ضرور کامیاب ہو گئے مگر ابھی انہیں سیاسی کامیابی نہیں ملی ہے۔ اس وقت صدام کی کامیابی اس میں تھی کہ وہ امریکہ کے عراق کے ٹکڑے کرنے کے مقصد کو ناکام بنائیں۔ خود صدام حسین اس جنگ سے زندہ بچ نکل آئیں اور امریکی اتحاد میں پھوٹ ڈال دیں۔ اس میں صدام حسین بہت حد تک کامیاب رہے ہیں مگر ابھی جنگ کا فیصلہ نہیں ہوا۔ امریکہ اب اپنے عزائم کی تکمیل کے لئے اسرائیل کا استعمال بھی کر سکتا ہے اور اسرائیل کے ذریعہ عراق پر ایٹمی حملہ کرا سکتا ہے یہ بھی خطرہ ہے کہ جنگ دوبارہ چھڑ سکتی ہے کیونکہ امریکی، اسرائیلی، و برطانوی بظاہر کچھ بھی کہیں اندر سے وہ جنگ کے نتائج سے مطمئن نہیں ہیں۔ انہیں احساس ہے کہ یہ جنگ فیصلہ کن نہیں ہے۔ صدام حسین نے بہت ہمت اور دانشمندی سے اتحادیوں کے عزائم کو ناکام بنا دیا ہے اب اتحادی پریشان ہیں کہ صدر صدام حسین سے کیسے چھٹکارا حاصل کریں۔ انہیں قتل کرائیں یا عراق میں بغاوت کرائیں۔ جب تک صدر صدام حسین زندہ ہیں امریکی اسرائیلی و سعودی چین کی نیند نہیں سو سکتے۔ انہیں خطرہ ہے کہ صدام حسین زندہ رہے تو وہ عرب قوم پرستی اور مزاحمت کی علامت کے طور پر پوری عرب دنیا میں عوامی بیداری و انقلاب کا مرکز بن جائیں گے اور پھر مصر کے حسنی مبارک شام کے حافظ الاسد، سعودیہ کے شاہ فہد اور خلیج کے آرام پسند امیروں کا اقتدار بچانا امریکیوں کے بس کی بات نہیں ہوگی۔ جب تک صدام حسین زندہ ہیں امریکی اتحادیوں کی جنگ نامکمل رہے گی۔

امریکہ صدام حسین کو قتل کرانا چاہتا ہے لیکن عربوں کا دشمن اسرائیل، عراق کو ہمیشہ کے لئے مکمل طور پر ختم کرنے کا منصوبہ بنا رہا ہے۔ یہ اطلاعات موصول ہوئی ہیں کہ

اسرائیل نے عراق پر ایٹمی حملے کی تیاریاں مکمل کرلی ہیں۔ آبزرور لندن میں شائع اپنے مضمون میں جولی فلنٹ نے لکھا ہے کہ اسرائیلی وزیر دفاع موشی آر۔نز نے قبول کیا ہے امریکہ نے عراق پر ایٹمی حملے کے لئے اسرائیل کو ہری جھنڈی دکھلادی ہے۔ ایٹمی حملے بغداد پر ہی نہیں بلکہ متعدد عراقی شہروں اور فوجی تنصیبات پر کئے جائیں گے۔ ایٹمی حملہ ساری دنیا میں سخت ردعمل ہوگا اور اسے روکنے کے لئے عراق پر کیمیائی حملے کرنے کا گھڑت الزام لگایا جائے گا۔ منصوبے کے مطابق امریکہ اور اسرائیل خود ہی کسی اسرا مقام پر کیمیائی ہتھیار استعمال کرکے الزام صدام حسین کے سر تھوپ دیں گے اور پھر بہانے عراق کے فوجی اور شہری علاقوں پر کیمیائی اور نیوکلیائی ہتھیاروں سے زبردست حملے جائیں گے۔ صدر بش نے صیہونی حکمرانوں کو یہ یقین دہانی کرادی ہے کہ عراقی شہروں پر ا حملوں میں وہ اسرائیل کی مدد کرے گا اور ساری دنیا میں اسرائیل مخالف لہر کو اپنی پروپیگنڈہ مشینری سے کچل دے گا۔

امریکہ اور اسرائیل میں برسراقتدار حلقوں کی رائے ہے کہ عراقی فوجی طاقت کو اسرائیل کے لئے ایک بڑا خطرہ ہے، پوری طرح سے ختم کردینے کا یہ سنہری موقع ہے اس موقع کا پورا پورا فائدہ اٹھاتے ہوئے ایٹمی حملے کرکے عراق کو مکمل طور پر تباہ و برباد کر جائے۔

اب سوال یہ ہے کہ اسرائیل ایٹمی حملے فوراً کرے گا، یا چند مہینے بعد؟ اس سلسلے اسرائیلی وزیر دفاع موشی آر۔نز اپنے امریکی آقاؤں سے صلاح مشورے کر رہے ہیں اسرائیلی حکمرانوں کو کچھ ماہرین نے یہ مشورہ دیا ہے کہ اب لوہا گرم ہے اس لئے فوراً ضر لگائی جائے اور صدام حسین پر کیمیائی ہتھیار استعمال کرنے کا جھوٹا الزام لگا کر اہم عراقی شہر کو ایٹمی حملوں سے ناگاساکی اور ہیروشیما بنادیا جائے۔ اس وقت چونکہ جنگ کا ماحول ہے من پسند ممالک اور جنگ مخالف لوگوں کی آواز کو آسانی سے دبا دیا جائے۔ روس اور ناوابستہ ممالک صرف زبانی مذمت کرکے رہ جائیں گے۔ کچھ دیگر ماہرین و مدبرین کا کہنا ہے اگر صدام حسین مبارک جیسے کسی امریکی پٹھو کو عراق کا سربراہ بنادیا جائے تو پھر ایٹمی حملوں

ضرورت نہیں رہے گی۔ ایسی صورت میں عراق کو دو یا تین حصوں میں تقسیم کردیا جائے۔ اور ہر حصے میں امریکہ اور اسرائیل کے پٹھوؤں کو حکومت سونپ دی جائے گی۔ لیکن اگر مستقبل میں صدام حسین برسراقتدار ہیں یا ان کی جگہ کوئی امریکہ دشمن اقتدار پر قابض ہو جائے تب عراق کو ایٹمی حملے سے تباہ کردیا جائے۔

اسرائیل اپنے توسیع پسندانہ عزائم اور امریکہ خلیج میں اپنے مفادات کی تکمیل کے لئے عراق کو فوجی اور سیاسی لحاظ سے تباہ کرنے کے لئے کسی بھی حد تک جاسکتے ہیں۔ اسرائیلی حکمرانوں کا خیال ہے کہ ایٹمی حملوں میں عراق کی مکمل تباہی سے شام اور مصر جیسے عرب ممالک کو بھی سبق مل جائے گا اور وہ اسرائیل کی جانب نظر اٹھانے کی جرات بھی نہیں کر سکیں گے۔

اسرائیلی وزیر اعظم شمیر بار بار یہ مطالبہ کر رہے ہیں کہ صدام حسین کو ہٹایا جائے یا نہیں قتل کردیا جائے۔ دراصل اسرائیلی حکمران عراق اور صدام کو "عظیم تر اسرائیل" قائم کرنے کے لئے اپنے منصوبوں کی راہ میں سب سے بڑی رکاوٹ سمجھتے ہیں۔ یوں بھی صدام حسین ایسے واحد عرب رہنما ہیں جنہوں نے اسرائیل کو للکارنے اور اس پر سکڈ میزائلوں سے حملہ کرنے کی جرات کی۔ صیہونیت پرست اس ذلت و تباہی کا انتقام لینے کے لئے بے چین ہیں جس کا سبب صدام حسین ہیں۔ بش کے حکم پر اسرائیل نے جوابی حملے سے احتراز کیا۔ لیکن اب اسحاق شمیر عراقی سکڈ میزائلوں کا جواب ایٹم بموں سے دینے کی تیاری کر رہے ہیں۔

صلیبی جنگ ہو یا خلیجی جنگ مغربی سامراج نے ہمیشہ عربوں (یا مسلمانوں) کے خلاف جو سب سے بڑا، موثر اور مہلک ہتھیار استعمال کیا ہے وہ مکاری، عیاری اور فریب ہی کا ہتھیار تھا۔ 1919ء ہو یا 1991 --- فرانس ہو یا برطانیہ، اٹلی ہو یا جرمنی اور امریکہ میدان جنگ میں مسلمانوں کی شکست کا عنوان فریب ہی بنا ہے۔ جنگ لڑنے اور جیتنے کے لئے مغربی سامراج نے ہر مرحلہ پر فریب کا سہارا لیا ہے۔ 1918ء میں عربوں کی مدد سے مغرب کی عیسائی حکومتوں نے دنیا کی سب سے بڑی طاقت سلطنت عثمانیہ کو شکست دی تھی عربوں سے وعدہ کیا گیا تھا کہ

انہیں ترکوں کی غلامی سے آزادی دلادی جائے گی۔ لیکن جنگ میں کامیابی حاصل کرنے کے بعد مغربی سامراجی طاقتوں نے عربوں کو دھوکہ دیا اور 1919ء میں ورسیلیز امن کانفرنس عربوں سے سامراجیوں کی وعدہ خلافی کے لئے ایک طویل دور کا نقطہ آغاز ثابت ہوئی۔ یہ کہنا غلط ہوگا کہ 1991ء کی خلیجی جنگ 1914ء سے 1918ء تک عربوں کے اشتراک و تعاون سے ترکوں کے خلاف لڑی گئی اتحادیوں کی ہی جنگ کی ایک کڑی ہے۔ اس جنگ سے پہلے اور جنگ کے دوران مغربی سامراجی ذرائع ابلاغ نے اسی طرح ترکوں کو بے رحم اور ظالم بنا کر پیش کیا جس طرح آج وہ عراقیوں اور ان کے قائد صدام حسین کو بے رحم اور ظالم بنا کر پیش کر رہے ہیں۔ ترکون کے خلاف عربوں کی حمایت اس دعوے کے ساتھ حاصل کی گئی تھی کہ جنگ ختم ہونے کے بعد اتحادی ممالک عربوں کی آزادی کی گارنٹی دیں گے۔ ادھر برطانوی وزیراعظم لارڈ بالفور نے یہودیوں اور صیہونیوں کی حمایت حاصل کرنے کی فکر میں 1917ء میں، فلسطین میں یہودیوں کے لئے ہوم لینڈ بنانے کا وعدہ بھی کیا تھا۔

1920ء میں سان ایمو کانفرنس کی شرطوں کے تحت لیگ آف نیشنز نے فلسطین ٹرانس جارڈن (اردن) اور اس علاقہ کو جو اب عراق کہلاتا ہے برطانیہ کے زیر تحفظ علاقہ بنا دیا تھا اور فرانس کو شام کا محافظ قرار دے دیا تھا۔ ان علاقوں پر فرانس اور برطانیہ کے تسلط کی راہ ہموار کرنے کے لیے لیگ آف نیشنز نے جو حکم جاری کیا تھا اس آرٹیکل 22 میں عربوں اور (یہودیوں) کے جن علاقوں کو مغربی تحفظ فراہم کرنے کی بات کہی گئی تھی۔ ان کی نشاندہی ان توہین آمیز اور ہتک آمیز لفظوں میں کی گئی تھی۔ "وہ علاقے جن میں آباد لوگ اپنے طور پر اس جدید زمانہ کی سختیوں کا سامنا نہیں کر سکتے ایسے لوگوں کی خوش حالی اور ترقی کے مقدس فرض کی ادائیگی مہذب سماج کو کرنی چاہئے جس کا بہترین طریقہ یہی ہے کہ اس طرح کے لوگوں کی پرداخت کا کام ترقی یافتہ اقوام کے سپرد کر دیا جائے"۔ یہاں سے فلسطین اور لبنان کے المیہ کا آغاز بھی ہوا۔ لیگ آف نیشنز کی اس قرارداد کے الفاظ کے تناظر میں جارج بش کے نئے عالمی نظام کی بشارت کو دیکھنا غلط نہ ہوگا۔ انہوں نے جس "سلامتی" کا وعدہ کیا ہے وہ اس "مقدس فرض" ہی جیسا ہے جس کی بشارت لیگ آف نیشنز نے دی تھی اور جارج بش

نے اتحادیوں کی جس ذمہ داری کا ذکر فرمایا ہے وہ بھی بعینہ ویسی ہی ذمہ داری ہے جیسی کہ لیگ آف نیشنز نے عربوں کے سلسلے میں 70 سال قبل ترقی یافتہ ملکوں کو دی تھی۔ اب جنگ ختم ہونے کے بعد امریکہ کی عیارانہ چالوں کے نتیجہ میں جو تیز سیاسی آندھیاں آئیں گی ان میں کس کس ملک کے ایسے لوگوں کے پاؤں اکھڑیں گے جو خود اپنے پاؤں پر کھڑے ہو سکنے کی سکت نہیں رکھتے؟ یہ لوگ کویت کے ہوں گے یا عراق کے، سعودی عرب کے ہوں گے یا اردن کے؟ اس سوال کا جواب تو آنے والا وقت ہی دے گا۔ لیکن فی الحال کویت اور سعودی عرب کو مجبوراً امریکہ کے زیر تحفظ رہنا ہوگا اور اگر سوویت یونین سمیت تمام غیر جانب دار ملکوں نے کوئی فوری قدم نہ اٹھایا تو عراق بھی امریکنوں کے "زیر تحفظ" آجائے گا۔ ادھر اردن کے خلاف اسرائیل، جنگ چھیڑ دے گا اور مغربی کنارے سے پوری فلسطینی آبادی کو زبردستی اردن میں دھکیل دے گا۔ اور اس جبری انخلاء کو فلسطین کے مسئلہ کے مستقل حل سے تعبیر کیا جائے گا۔ اس امکان کا اشارہ گزشتہ ہفتہ اسرائیلی وزیروں کے بیانات سے بھی ملتا ہے۔ مصر یقینی طور پر مغربی کنارے سے فلسطینیوں کے اردن میں دھکیلے جانے پر احتجاج کرے گا۔ لیکن اس کا احتجاج بے اثر ہوگا کیونکہ وہ خود امریکہ اور سعودی عربیہ کی امداد کا محتاج ہے۔ امریکہ اسرائیل کی جارحیت اور فلسطینیوں کے جبری انخلاء کو شیر مادر سمجھ کر پی جائے گا۔ برطانیہ کچھ کسمسائے گا مگر امریکی امداد کے فقدان کے نتیجہ میں اس کی کسمساہٹ بالکل بے اثر ثابت ہوگی اس طرح عظیم تر اسرائیل کے خواب کی تعبیر تلاش کر لی جائے گی۔ اور سعودی سرمایہ، امریکہ ہیبت اور اسرائیلی فوجی طاقت سے خلیج کے علاقہ میں ایک نیا نظام آئے گا جس کا چوکیدار اسرائیل ہوگا۔

پاکستانی پریس کا کردار

یہ بات نہایت افسوس سے کہنی پڑتی ہے کہ اس جنگ میں پاکستانی پریس کا کردار ایسا نہیں رہا جسے قابل تعریف کہا جا سکے۔ ہمارے اخبارات نے خبریں اس انداز میں شائع کیں جس طرح قارئین پسند کرتے تھے۔ اس کا ایک اہم سبب ہمارے بعض سیاستدانوں کا غیر ذمہ دارانہ رویہ بھی تھا۔

یہ وہ سیاستدان ہیں جو کبھی منتخب ہو کر اسمبلیوں میں نہیں آئے اور صرف انتشار کی سیاست کو ہی سیاست سمجھتے ہیں۔ ان کے ہاتھ کوئی ایسا "ایشو" آنا چاہئے جس کو بنیاد بنا کر یہ لوگ حکومت کے خلاف عوام کو سڑکوں پر لا سکیں۔ عراق ہمارا مسلم برادر ہے۔ کون بدبخت مسلمان ہو گا جس کو اپنے اس مسلمان بھائی کی تباہی منظور ہو گی۔ خصوصاً پاکستانی مسلمان تو اس معاملے میں انتہا کے جذباتی واقع ہوئے ہیں۔ دنیا کے کسی بھی کونے میں کسی مسلمان کو گزند پہنچے اس پر سب سے پہلے اور سب سے زیادہ سراپا احتجاج ہمیشہ پاکستانی مسلمانوں ہوتے ہیں۔ لیکن اس مرتبہ بدقسمتی سے عراق نے اپنے ہی ایک مسلمان برادر ملک کے خلاف جارحیت کا ارتکاب کیا تھا اور کویت پر قبضہ کر لیا۔ مسلمان ممالک نے ہر ممکن کوشش کر ڈالی کہ جس طرح بھی ممکن ہے یہ معاملہ مل بیٹھ کر آپس میں افہام و تفہیم کے ذریعے طے کر لیا جائے۔

یہ عالم اسلام کی بدبختی تھی کی ایسا نہ ہو سکا۔ اب صورتحال یہ تھی کی ایک جنگ تو صحرائے عرب میں لڑی جا رہی تھی لیکن اس سے کہیں زیادہ شدت سے بعض پاکستانی سیاستدان اپنی حکومت پر حملہ آور تھے اور عراق کی تباہی کا واحد ذمہ دار پاکستان کو گردانتے رہے۔

حرمین الشریفین کی حفاظت کے لئے بھیجے جانے والے پاکستانی فوج کے چند دستوں کی سعودی عرب میں موجودگی پر وہ طوفان اٹھائے گئے کہ خدا کی پناہ -- " لیکن حقائق بہت تلخ ہوتے ہیں اور اس مرتبہ بھی اپنے آپ کو منوا کر رہے اور پاکستانی جرنیلوں، سیاستدانوں اور خوش فہموں کی توقعات کے برعکس عراقی افواج زمینی لڑائی دو دن بھی جم کر دشمن کا مقابلہ نہ کر سکیں۔ اس بات سے کوئی شک باقی نہیں رہنا چاہئے کہ اخبارات نے دوران جنگ خبریں صرف دباؤ کے تحت شائع کیں اور بعض تلخ حقائق کو محض اس لئے نظرانداز کیا گیا کہ ناعاقبت اندیش سیاستدان عوامی غیظ و غضب کا رخ کہیں اخبارات کے دفاتر کی طرف نہ موڑ دیں۔ اس کے باوجود کچھ ایسے محترم صحافی بھی تھے جن میں جناب ابوذر غفاری سب سے نمایاں ہیں جنہوں نے تمام مصلحتیں بالائے طاق رکھتے ہوئے حقائق لکھے اور پاکستانی عوام اور سیاستدانوں سے التجا کی کہ خدارا! دھوکے میں مت آئیے۔ حقائق کا ادراک کیجئے اور سچائی کو تسلیم کر کے اپنی صفوں میں اتحاد پیدا کیجئے۔ اور دیکھئے کہ ہم کیا سوچتے رہے۔ کیا کہتے رہے۔ کیا کرتے رہے اور ہمارے اندازوں کے بالکل برعکس نتیجہ کیا برآمد ہوا۔ واقعات کی ترتیب کچھ اس طرح سامنے آتی ہے۔

2 اگست 1990ء -- عراق نے علی الصبح دو بجے کویت پر حملہ کر دیا۔ امیر کویت سعودی عرب فرار ہو گئے۔ اقوام متحدہ کی سلامتی کونسل نے عراقی جارحیت کی مذمت کی اور مطالبہ کیا کہ عراقی فوجیں مقبوضہ کویت خالی کر دیں۔

3 اگست 1990ء -- امریکہ نے خلیج میں بحری فوج بھیجنے کا اعلان کیا اور چار ہی روز بعد بری فوج کے لڑاکا دستوں اور فضائیہ کے یونٹوں کو علاقے میں جانے کا حکم دے دیا۔

6 اگست 1990ء -- اقوام متحدہ کی سلامتی کونسل نے صفر کے مقابلہ میں تیرہ ووٹوں سے عراق کے خلاف عالمی تجارتی اور اقتصادی پابندیاں عائد کرنے کی قرارداد منظور کر لی جس سے انسانی ہمدردی کی بنیاد پر ادویات اور خوراک کو مستثنیٰ رکھا گیا۔

8 اگست 1990ء -- عراق نے کویت کو اپنے ملک کا ایک حصہ قرار دے دیا۔

10 اگست 1990ء -- دنیائے عرب کے بارہ رہنماؤں نے سعودی عرب کے تحفظ کیلئے بین

سرب فوج بھیجنے پر آمادگی ظاہر کردی۔

16 اگست 1990ء -- عراق نے مغربی باشندوں کو یرغمالی بنانے کا فیصلہ کرتے ہوئے کویت میں موجود چار ہزار برطانوی اور اڑھائی ہزار امریکیوں کو ہوٹلوں میں اکٹھا ہونے کا حکم دیا یا انہیں گرفتار کرلیا۔

28 اگست 1990ء -- عراق نے کویت کو اپنا 19واں صوبہ قرار دے دیا اور یرغمال بنائے گئے عورتوں اور بچوں کو رہا کرنے کا حکم دیا۔

9 ستمبر 1990ء امریکی صدر جارج بش اور سوویت سربراہ میخائل گورباچوف نے ہلسنکی میں ملاقات کی اور عراق پر کویت خالی کرنے کیلئے زور دیا۔

13 ستمبر 1990ء عراقی فوج نے کویت میں فرانسیسی سفیر اور دیگر مغربی ممالک کے سفارتخانوں پر حملہ بول دیا۔ فرانس نے بعد ازاں اپنی فوج سعودی عرب بھیجنے کا اعلان۔

19 اکتوبر 1990ء عراق کے صدر صدام حسین نے نئے میزائلوں کے ساتھ اسرائیل پر حملہ کرنے کی دھمکی دی۔

23 اکتوبر 1990ء عراق نے کویت میں یرغمال بنائے گئے فرانس کے تمام 330 باشندوں کو رہا کرنے کا حکم دیا۔

9 نومبر 1990ء -- عراق نے دھمکی دی کہ وہ جزیرہ نمائے عرب کو جلا کر خاکستر کردے گا۔ صدر صدام نے اپنی فوج کے سربراہ کو برطرف کردیا جبکہ امریکی صدر جارج بش نے خلیج میں مزید ایک لاکھ فوج بھیجنے کا حکم دیا۔ سوویت یونین نے بھی واضح کردیا کہ طاقت کے استعمال کو خارج از امکان قرار نہیں دیا جاسکتا۔

14 نومبر 1990ء -- عرب سربراہ کانفرنس کے انعقاد کی کوششیں ناکام ہوگئیں جب سعودی عرب، مصر اور شام نے اعلان کیا کہ بات چیت بیکار ہوگی جب تک عراق کویت خالی کرنے پر اتفاق نہیں کرتا۔

18 نومبر 1990ء -- عراق کے صدر صدام حسین نے پیش کش کی کہ وہ 25 دسمبر سے عراق اور کویت میں یرغمال بنائے گئے فوجی اور جاپانی باشندوں کو رہا کردے گا جن کی تعداد کا اندازہ دو ہزار لگایا گیا تھا۔

20 نومبر 1990ء -- عراق نے اعلان کیا کہ وہ جرمنی کے تمام باشندوں کو رہا کردے گا۔ صدر صدام نے کہا کہ وہ مقبوضہ کویت میں پہلے سے موجود تقریباً چار لاکھ عراقی فوج کی کمک کے طور پر اڑھائی لاکھ کی نفری بھیجے گا۔ کمک جنوری کے وسط تک وہاں پہنچ جائے گی۔

22 نومبر 1990ء -- امریکی صدر جارج بش نے خلیج میں امریکی فورسز کی صفوں کا معائنہ کیا۔ برطانیہ نے اعلان کیا کہ وہ مزید 14 ہزار فوجی اور لڑاکا طیارے خلیج بھیجے گا۔

29 نومبر 1990ء -- اقوام متحدہ کی سلامتی کونسل نے دو کے مقابلہ میں بارہ ووٹوں سے عراق کے خلاف طاقت کے استعمال کی منظوری دے دی بشرطیکہ عراق پندرہ جنوری تک کویت کو خالی نہیں کرتا۔ یمن اور کیوبا نے قرارداد کی مخالفت میں ووٹ دیا جبکہ چین نے رائے شماری میں حصہ نہیں لیا۔

30 نومبر 1990ء -- عراق نے اقوام متحدہ کا الٹی میٹم مسترد کردیا اور الزام لگایا کہ امریکہ نے قرارداد منظور کرانے کے لئے سلامتی کونسل کے اراکین کو رشوت دی ہے۔ اسرائیل نے کہا کہ عراق نے اس پر حملہ کیا تو وہ جوابی کارروائی کرے گا۔ امریکی صدر بش نے عراق کے وزیر خارجہ طارق عزیز کو مذاکرات کے لئے امریکہ آنے کی دعوت دی اور پیش کش کی کہ مفاہمت کی غرض سے اپنے وزیر خارجہ جیمز بیکر کو بغداد بھیجنے کے لئے تیار ہیں۔

یکم دسمبر 1990ء -- عراق نے مذاکرات کے لئے امریکی دعوت منظور کرلی اور کہا کہ وہ خلیجی بحران پر بات چیت میں مسئلہ فلسطین سمیت مشرق وسطیٰ کے دیگر مسائل بھی زیر بحث لائے گا۔

4 دسمبر 1990ء -- عراق نے کہا کہ زیر قبضہ سوویت باشندوں کو جن کی تعداد تین ہزار کے لگ بھگ ہے۔ واپس جانے کی اجازت دے دی جائے گی۔ سوویت وزیر اعظم نکولائی ریزیکوف نے خلیج میں سوویت فورسز بھیجنے کی مخالفت کی۔

6 دسمبر 1990ء -- صدر صدام حسین کی اچانک تمام غیر ملکی یرغمالیوں کی رہائی کا حکم دے کر پوری دنیا کی ورطہ حیرت میں ڈال دیا۔ امریکہ نے نیم گرمجوشی سے اس اعلان کا خیر مقدم کیا۔

12 دسمبر 1990ء -- امریکہ نے عراق پر الزام لگایا کہ وہ اعلیٰ سطحی مذاکرات کے لئے تاریخوں کے تعین کی راہ میں روڑے اٹکا رہا ہے۔ امریکی محکمہ خارجہ نے کہا کہ صدام بضد ہیں کہ وزیر

خارجہ جیمز بیکر ان سے ملنے کے لئے 12 جنوری کو بغداد آئیں۔

15 دسمبر 1990ء -- عراق نے کہا کہ 17 دسمبر کو مذاکرات کا امکان دکھائی نہیں دیتا جب وزیر خارجہ طارق عزیز کی امریکی صدر بش سے ملاقات کے لئے واشنگٹن آمد متوقع تھی۔

17 دسمبر 1990ء -- امریکی صدر نے اعلان کیا کہ امن کے آخری موقع کے طور پر عراق سے مذاکرات بروقت ہونے چاہئیں تاکہ عراق پندرہ جنوری سے پہلے پہلے کویت سے اپنی فوجیں نکال سکے۔

18 دسمبر 1990ء -- صدر صدام نے کہا کہ عراق امریکہ سے مذاکرات نہیں کرے گا اگر اس کا مقصد اقوام متحدہ کی قرارداد کو دہرانا ہی ہے جسے ان کا ملک مسترد کر چکا ہے۔

22 دسمبر 1990ء -- عراق نے کہا کہ وہ کبھی کویت سے دستبردار نہیں ہوگا اور اس پر حملہ کیا گیا تو وہ کیمیائی ہتھیار استعمال کرے گا۔

یکم جنوری 1991ء -- عراق نے مصر کے صدر حسنی مبارک کی امن تجاویز مسترد کر دیں اور الزام لگایا کہ وہ جھوٹے ہیں۔

3 جنوری 1991ء -- امریکی صدر نے عراق کو امریکہ کے اندر جنیوا میں مذاکرات کرنے کی دعوت دی اور کہا کہ بصورت دیگر وہ جنگ کے لئے تیار ہو جائیں۔

4 جنوری 1991ء -- عراق نے 9 جنوری کو جنیوا میں وزرائے خارجہ کی سطح پر مذاکرات کا انعقاد قبول کر لیا۔

5 جنوری 1991ء -- امریکی صدر نے اعلان کیا کہ جنیوا بات چیت میں کوئی خفیہ سفارتی سمجھوتہ نہیں ہوگا بلکہ امریکی وزیر خارجہ جیمز بیکر امریکہ کے موقف کا اعادہ کریں گے کہ عراقی فورسز کویت خالی کر دیں یا خوفناک نتائج کا سامنا کرنے کے لئے تیار ہو جائیں۔

6 جنوری 1991ء -- عراقی صدر صدام حسین نے کہا کہ وہ کویت یا فلسطین پر اپنے موقف سے پیچھے نہیں ہٹیں گے اور اس کے لئے ہر قربانی دینے کو تیار رہیں گے۔ دوسری طرف امریکی وزیر خارجہ نے کہا کہ خلیج میں ان کے اتحادی جنگ کے لئے تیار ہیں۔

9 جنوری 1991ء -- سوئٹزرلینڈ کے شہر جنیوا میں امریکی وزیر خارجہ جیمز بیکر اور عراقی وزیر خارجہ طارق عزیز کے درمیان مذاکرات کے دو ادوار منعقد ہوئے لیکن بات چیت ناکام ہو

گئی۔

10 جنوری 1991ء -- امریکی وزیر خارجہ جیمز بیکر سعودی عرب، اردن اور مصر کے دورے پر روانہ ہوئے جسے سفارتی امن کوششوں کا آخری مرحلہ قرار دیا گیا۔

13 جنوری 1991ء -- عراق کی پارلیمینٹ نے کویت خالی نہ کرنے کے سلسلہ میں صدر صدام حسین کے موقف کی تائید کر دی اور کہا کہ عراقی فوج جنگ کا سامنا کرنے کے لئے تیار ہے۔

14 جنوری 1991ء -- اقوام متحدہ کے سیکرٹری جنرل پیریز ڈی کوئیار امن کے لئے آخری لمحے کی کوششوں کے ضمن میں بغداد پہنچے لیکن صدر صدام سے ان کے مذاکرات نتیجہ خیز ثابت نہ ہوئے۔

15 جنوری 1991ء -- اقوام متحدہ کی سلامتی کونسل میں فرانس کا نیا فارمولا پذیرائی حاصل نہ کر سکا اور ابتدائی اجلاس میں غور کے بعد اسے مسترد کر دیا گیا۔ کونسل دوسرا اجلاس پروگرام کے مطابق منعقد نہ ہو سکا۔ فرانس نے کہا عراق کے خلاف فوجی کارروائی ناگزیر ہو چکی ہے۔

16 جنوری 1991ء -- پاکستان کے وقت کے مطابق صبح دس بجے اقوام متحدہ کی طرف سے دی گئی مہلت کا وقت اختتام کو پہنچ گیا لیکن عراق نے کسی نرمی کا مظاہرہ نہیں کیا۔

17 جنوری 1991ء -- پاکستان کے وقت کے مطابق صبح 5 بجے امریکی قیادت میں کثیر الاقوامی فوج نے عراق پر حملہ کر دیا۔

17 جنوری کو عراق پر اتحادی فضائی حملے کے ساتھ ہی پاکستان میں موجود عراق کا سفارت خانہ حرکت میں آگیا اور دیکھتے ہی دیکھتے صدر صدام حسین کے پوسٹروں کا ایک طوفان ملک کے ایک سے دوسرے کونے میں امڈ آیا۔ بعد میں ان ہی سرگرمیوں کی پاداش میں عراقی ناظم الامور اسمٰعیل حمودی کو پاکستان بدری کا حکم ملا تھا۔

ابتداء ہی سے یہ تاثر دیا گیا جیسے عراق اسرائیل کو تباہ کرنا چاہتا تھا اور یہ حملہ جو اس کے خلاف اسلامی ممالک اور یورپی ممالک کی افواج نے مل کر کیا ہے دراصل اسرائیل کی حمایت میں کیا گیا ہے اور حملہ کرنے والے تمام ممالک کی افواج دراصل کافروں کی فوج ہے جس نے 1991ء کے صلاح الدین ایوبی جناب صدام حسین پر حملہ کر دیا ہے۔

سیاستدان جن کو حکومت کے خلاف کوئی ایشو ہاتھ نہیں آرہا تھا اس جنگ کو عطیہ خداوندی جان کر اپنے تند و تیز بیانات کے ساتھ حکومت پر حملہ آور ہو گئے اور ریٹائرڈ جرنیل صاحبان جن سے درجنوں کارنامے منسوب کئے جاتے ہیں اپنی محدود معلومات کے بل بوتے پر عراق کو ہیرو بنانے پر تل گئے۔

ایک طرف تو عراق کے بدقسمت شہری تھے جو اتحادی وحشیانہ بمباری سے تباہ و برباد ہو رہے تھے اور عراق کی ہر قابل ذکر شے کو اتحادی فضائیہ تباہ کر رہی تھی اور ایک طرف ہمارے جرنیل صاحبان تھے جو پاکستانی قوم کو بتا رہے تھے کہ اتحادی بکواس کرتے ہیں اور انہوں نے "ڈمی ٹارگیٹ" پر حملے کئے ہیں عراق کی ساری طاقت محفوظ ہے اور وقت آنے پر وہ اتحادی فوجوں کو نیست و نابود کر کے رکھ دے گی۔

ایک ریٹائرڈ میجر صاحب تو اخبارات میں تاریخیں اناؤنس کر رہے تھے کہ فلاں تاریخ کو اتنے امریکی مارے جائیں گے۔ فلاں کو اتنے قید ہو جائیں گے اور فلاں تاریخ کو صدر بش ایڑیاں رگڑ کر صدر صدام سے معافی مانگ رہا ہو گا۔ ادھر اخبارات تھے کہ ہزاروں اتحادی فوجیوں کی موت کا "مژدہ" پاکستان کے سادہ لوح عوام کو سنا کر بیوقوف بنا رہے تھے۔ تاریخ ہمارے اس جرم کو کبھی معاف نہیں کرے گی جس سے ہمارے ناعاقبت اندیش سیاستدانوں بزدل صحافیوں اور محض اپنی اکڑفوں کے بل پر خود کو جغادری سمجھنے والے جرنیلوں نے پاکستان کے سیدھے سادے اور سچے مسلمانوں کو دوچار کیا انہیں حالات کی غلط تصویر دکھا کر گمراہ کیا۔ ان کا مورال اتنا اونچا کر دیا کہ بے چارے ہوا میں اڑنے لگے اور جب حقیقت میں امیدوں کے تاج محل کو ایک جھٹکے نے نیست و نابود کیا تو پاکستانی عوام سناٹے میں آگئے۔ آیئے ایک نظر پاکستانی اخبارات کا جائزہ لے لیں۔

روزنامہ نوائے وقت

یکم فروری 91

لاہور (نامہ نگار) ملک بھر کے نمائندہ وکلاء اور سیاستدانوں نے عراق پر امریکہ اور اس کے اتحادی ممالک کے حملہ کو انسانی قتل کے مترادف اور عالم اسلام کے خلاف صیہونی سازش کا

حصہ قرار دیا ہے اور اس بات پر زور دیا ہے کہ امت مسلمہ عالم اسلام کو درپیش خطرات کے مقابلہ کے لئے متحد ہو جائے ان خیالات کا اظہار انہوں نے گذشتہ روز یہاں لاہور ہائیکورٹ بار ایسوسی ایشن کے زیر اہتمام خلیج کے مسئلہ پر منعقدہ "کل پاکستان وکلاء کنونشن" سے خطاب کرتے ہوئے کیا۔ یہ کنونشن صبح 9 بجے شروع ہوا اور بغیر کسی وقفہ کے سہ پہر اڑھائی بجے تک جاری رہا۔ کنونشن کی صدارت لاہور ہائیکورٹ بار کے صدر راجہ محمد اختر اور لاہور ڈسٹرکٹ بار کے صدر خواجہ محمد شریف نے مشترکہ طور پر کی جبکہ کنونشن میں مجموعی طور پر 35 وکلاء نے خطاب کیا جن میں پاکستان مسلم لیگ (قاسم گروپ) کے صدر ملک محمد قاسم، پیپلز پارٹی کے سینئر وائس چیئرمین شیخ محمد رشید، اے این پی کے سابق سیکرٹری جنرل رسول بخش پلیجو، پاکستان ورکرز پارٹی کے سیکرٹری جنرل عابد حسن منٹو، سابق ڈپٹی اٹارنی جنرل میاں عبد الستار نجم، ڈاکٹر فاروق عظیم حسن، سابق جج لاہور ہائیکورٹ ملک سعید حسن، کوئٹہ بار ایسوسی ایشن کے نور محمد اچکزئی، چودھری محمد اسماعیل ایڈووکیٹ، امریکہ کے اٹارنی مسٹر محمد عارف چودھری، پاکستان جمہوری پارٹی پنجاب کے کنوینر عبد الرشید قریشی، تحریک استقلال کے اقبال محمود اعوان، پیپلز لائرز فورم لاہور ہائیکورٹ کے صدر مسٹر مسعود مرزا، دیپالپور بار ایسوسی ایشن کے صدر محمد ریاض رحمت، چودھری نذیر محمد ایڈووکیٹ، لاہور ڈسٹرکٹ بار کے جنرل سیکرٹری ملک وقار سلیم، مردان بار ایسوسی ایشن کے صدر مسٹر تاج محمد خان، ایبٹ آباد کے سید شبیر حسین شاہ، رحیم یار خاں کے محمد سعد شبلی، بیگم شائستہ قیصر ایڈووکیٹ، سوات کے مسٹر عبد الحلیم، محمد سلیم خاں ایڈووکیٹ، اے ڈبلیو بٹ ایڈووکیٹ، امتیاز کیفی ایڈووکیٹ، ڈسٹرکٹ بار ایسوسی ایشن کے سیکرٹری امجد حسین، سید امتیاز الحق نوشاہی، مصدق حسین اسد، رضا الکریم بٹ، ارشد بٹ ایڈووکیٹ، تنویر قریشی ایڈووکیٹ اور احمر بلال صوفی ایڈووکیٹ شامل ہیں۔ کنونشن میں مسٹر سعید انصاری ایڈووکیٹ اور عبد الرشید اشعب ایڈووکیٹ نے نظمیں پڑھیں۔ سٹیج سیکرٹری کے فرائض لاہور ہائیکورٹ بار کے جنرل سیکرٹری مسٹر غلام صابر کیفی نے ادا کئے۔ ملک محمد قاسم نے اپنی تقریر میں کہا کہ عراق پر ہونے والے مظالم پر جو شخص بات نہیں کرتا وہ نہ تو مسلمان ہے اور نہ ہی انسان کہلا سکتا ہے۔ انہوں نے کہا کہ صرف نصیحتیں اور

تقریریں کرنے سے کام نہیں بنے گا بلکہ عراق کے خلاف امریکہ اور اس کے اتحادی ممالک کی جانب سے کی گئی کارروائی کے خلاف تمام مسلمانوں کو اکٹھے ہو جانا چاہئے اور اگر ہم پر یہ احساس اجاگر ہو چکا ہے کہ عراق کے بعد ایران اور پاکستان کی باری ہے تو پھر پاکستانیوں کو بھی تمام قومی معاملات پر ایک دوسرے کے ساتھ متحد ہونا پڑے گا۔ انہوں نے کہا کہ ایم آر ڈی والے دوسروں کو برداشت نہیں کرتے تھے جبکہ دوسرے ایم آر ڈی والوں کو آج تک معاف کرنے کو تیار نہیں۔ وہ ہم سے اب بھی ٹھیک طرح سے ہاتھ بھی نہیں ملاتے اور چاہے ہم اچھی بات بھی کریں محض سیاسی مخالفت کی بنیاد پر اس بات کو خاطر میں نہیں لایا جاتا۔ انہوں نے کہا کہ اگر ہم نے صیہونی طاقتوں کا مقابلہ کرنا ہے اور ان کے مقابلہ میں کامیابی حاصل کرنی ہے تو پھر ہمیں قومی معاملات میں یکجہتی اور اتحاد کا مظاہرہ کرنا پڑے گا۔

شیخ محمد رشید نے اپنی تقریر میں کہا امریکی سامراج کے خلاف جب تک پوری دنیا کے عوام متحد نہیں ہوتے' دنیا میں امن قائم نہیں ہو سکتا۔ انہوں نے کہا امریکہ ہر انقلابی لیڈر اور حکومت کا دشمن ہے اور ویت نام، گوئٹے مالا' نکاراگوا' چلی اور پاکستان کی مثالیں اس کا زندہ ثبوت ہیں۔ انہوں نے دعویٰ کیا کہ پاکستان میں مارشل لا حکومت بھی امریکی سامراج کے ہاتھوں قائم ہوئی تھی۔ انہوں نے اس بات پر افسوس کا اظہار کیا کہ ترکی، شام اور مصر کی حکومتیں عراق سے محض معمولی اختلافات کے باعث خلیج کی جنگ میں اس کی مخالفت کر رہی ہیں۔ انہوں نے کہا خلیج کے معاملہ میں روس کے صدر گورباچوف کا خاموش تماشائی بننا بھی افسوس ناک ہے۔ رسول بخش پلیجو نے کہا کہ خلیج کے مسئلہ نے ہم میں سندھی' پنجابی' پٹھان اور بلوچ کا امتیاز ختم کر دیا ہے اور آج کا نظریہ بن گیا ہے کہ ایک طرف صدام' دنیا کے عوام اور حق ہے اور دوسری طرف امریکہ 'اس کے اتحادی ظلم و بربریت ہے۔ انہوں نے کہا ہماری حکومت کا یہ طرز عمل افسوس ناک ہے کہ وہ بات اسلام کی کرتی ہے اور طرف داری امریکہ کی کرتی ہے۔ انہوں نے کہا کہ صرف حکومت دوسری جانب ہے اور اپنی آنیاں جانیاں دکھا رہی ہے جبکہ اس کے برعکس پورا پاکستان احتجاج' جلسہ اور صدام بن چکا ہے۔ اس طرح پاکستان کے عوام پہلی مرتبہ اس پوزیشن میں آئے ہیں کہ وہ تاریخ کے دھارے کو بدل سکتے

ہیں اور اگر ہم چاہیں تو موجودہ صورتحال میں خطہ میں ہماری مرضی کے خلاف کچھ نہیں ہو سکتا۔ عابد حسن منٹو نے کہا کہ امریکہ اور اس کے اتحادیوں سے پوچھا جانا چاہئے کہ دنیا میں کسی انسانی اصول کے تحت آیا انسانی خون بہانا درست ہے۔ انہوں نے کہا کہ دنیا بھر کے مسلمان عراق کے بارے میں سلامتی کونسل کی قرارداد کو ان معنوں میں نہیں دیکھتے جس طرح امریکہ نے دیکھا اور اس پر عمل کیا ہے۔ ملک سعید حسن نے کہا کہ وکلاء کنونشن کا مقصد صرف یہ ہے کہ امریکہ کی جارحیت کی مذمت کی جائے یہ کنونشن کوئی ہتھیار نہیں ہے۔ سیمینار تو اقوام متحدہ یا میاں نواز شریف کو طلب کرنا چاہئے۔ انہوں نے کہا کہ جس ملک پر چھ ایٹم بموں کے مساوی بارود پھینکا گیا ہو' وہاں انسانوں کا کیا حشر ہو گا لیکن بغداد کے رہنے والے خراج تحسین کے مستحق ہیں کہ بم کھانے کے بعد ان کے چہروں پر مسکراہٹ ہے۔ عبد الرشید قریشی نے کہا کہ اس وقت پوری قوم ظلم کے خلاف سراپا احتجاج بن چکی ہے جبکہ استعماری قوتیں مسلم ممالک کی یکجہتی ختم کرنے کے درپے ہیں۔ اقبال محمود اعوان نے سعودی عرب میں پاکستانی افواج بھجوانے کے بارے میں حکومت کی پالیسی پر تنقید کی اور مطالبہ کیا کہ پاکستانی افواج واپس بلانے کی بجائے عراق بھیجی جائیں تاکہ وہ صدر صدام کے شانہ بشانہ استعماری قوتوں کا مقابلہ کر سکیں۔ محمد عارف چودھری نے الزام عائد کیا کہ خلیج کے معاملے میں پاکستان کی حکومت نے دہری پالیسی اختیار کر رکھی ہے۔ اور درحقیقت ہم امریکہ کے تابع ہو کر رہ گئے ہیں۔ نور محمد اچکزئی نے کہا کہ پاکستان کے حکمران خلیج کی جنگ میں جہاں کھڑے ہیں' پاکستان کے عوام نے اس پلیٹ فارم کو مسترد کر دیا ہے کیونکہ یہ امریکی استعمار کا پلیٹ فارم ہے۔ انہوں نے کہا کہ بلوچستان کے ساحلوں پر امریکی سرگرمیوں سے پاکستان کے عوام واقف ہیں اور اگر خلیج کی جنگ طویل ہوتی ہے تو بلوچستان کے ساحلی اڈے امریکہ کے زیر استعمال آ سکتے ہیں۔ اس طرح ہم خلیج کی جنگ میں براہ راست فریق بن جائیں گے۔ چودھری نذیر محمد ایڈووکیٹ نے کہا کہ صدر صدام نے امریکہ اور اسرائیل کا راستہ روکنے کے لئے جو اقدامات کئے ہیں وہ قابل ستائش ہیں تاہم خلیج میں قیام امن کے لئے عراق کا کویت سے واپس جانا بھی ضروری ہے۔ سید شبیر حسین شاہ نے کہا کہ عراق کی سرزمین

حضرت ابراہیم علیہ السلام، حضرت علی، حضرت امام حسین، اور شیخ عبدالقادر جیلانیؒ کی زمین ہے۔ جس کی فضاؤں میں آج بھی نعرہ "انا الحق" بلند ہو رہا ہے۔ انہوں نے کہا خلیج جنگ عربوں کے ذرائع پیداوار پر تسلط حاصل کرنے کی جنگ ہے۔ محمد سلیم خان ایڈووکیٹ نے کہا کہ جنرل مرزا اسلم بیگ کو ملک میں مارشل لا مسلط کرنے پر مجبور کیا جا رہا ہے لیکن انہیں ایسا نہیں کرنا چاہئے اور خلیج کے معاملہ میں اگر حکومت ان کے نکتہ نظر سے اتفاق نہیں کرتی تو انہیں باعزت مستعفی ہو کر اپنی گھر چلے جانا چاہئے۔ کونشن میں سندھ ہائیکورٹ بار کی ایک قرارداد بھی پڑھ کر سنائی گئی جو خلیج کی جنگ کے حوالے سے منظور کی گئی تھی۔

2 فروری۔ بھاگ جاؤ، اس سے پہلے کہ تمہاری لاشیں صحرا میں سڑیں اور درندے کھا جائیں

نکوسیا (اف پ) عراق نے اتحادیوں سے کہا کہ اس سے پہلے کہ تمہارے لشکر درندوں کی غذا بن جائیں اور تمہاری لاشیں صحرا کی تپتی لو کے رحم و کرم پر پڑی رہ جائیں نجد اور حجاز کی سر زمین خالی کر دو۔ عراقی ریڈیو نے اپنے ایک نشریے میں عراق کے تمام ایمان والوں کی طرف سے امریکی غاصبوں کو خبردار کیا ہے کہ انہیں اپنی لاشیں تھیلوں اور تابوتوں میں ڈال کر واپس جانا پڑے گا۔ اخبار "الجمہوریہ" نے سعودی شہر خفجی پر قبضے کا ذکر کرتے ہوئے کہا کہ عراق نے اپنے "ڈیزرٹ سٹارم" کا آغاز کر دیا ہے اور خفجی پر قبضہ کر کے میدان اپنے ہاتھ میں لے لیا ہے۔ خفجی پر حملے کا ذکر کرتے ہوئے اخبار نے کہا ہے کہ یہ اس تباہ کن طوفان کا آغاز ہے جو صحرائے عرب میں آنے والا ہے اخبار نے مزید کہا ہے کہ عراق نے میدانی جنگ میں اپنی برتری کا فائدہ اٹھاتے ہوئے طاقت استعمال کر کے جنگ کا رخ بدلنا شروع کر دیا ہے۔

سعودی سرحد پر 6 ڈویژن عراقی فوج اور ٹینکوں کی یلغار

ریاض (مانیٹرنگ ڈیسک) سعودی شہر الخفجی کی لڑائی کے بعد اب عراقی فوج کے چھ ڈویژن خفجی سے 80 میل دور سعودی عرب کے دوسرے سرحدی شہر ام جل کی جانب بڑھ رہے ہیں وائس آف امریکہ کے مطابق عراقی فوج کا قافلہ 17 کلو میٹر طویل ہے اور اس میں ایک ہزار کے لگ بھگ ٹینک، بکتر بند گاڑیاں اور دیگر گاڑیاں شامل ہیں اتحادی طیارے عراق کے اس

بھی قافلے پر بمباری کر رہے ہیں۔ اب تک 100 کے لگ بھگ گاڑیوں کو تباہ یا انہیں نقصان پہنچا چکے ہیں وائس آف جرمنی کے مطابق خیال کیا جا رہا ہے کہ یہ فوج ایک نئے بڑے حملے کیلئے سعودی علاقے ام جل کی جانب اتحادی طیاروں کی شدید بمباری کے باوجود انتہائی برق رفتاری سے رواں دواں ہے اور آج رات اس علاقے میں گھمسان کی جنگ کے آثار دکھائی دے رہے ہیں ادھر امریکی ٹیلی ویژن سی این این نے بتایا کہ خفجی کو سعودی اور اتحادی افواج نے عراقی فوجیوں سے خالی کرا لیا گیا ہے تاہم اب بھی شہر کے ارد گرد بعض جگہ لڑائی جاری ہے۔

4 فروری۔ عراقی وائرلیس پر روسی لب و لہجہ اور زبان سنی گئی

پیرس (فارن ڈیسک) اتحادیوں کی انٹیلی جنس نے عراقی فوجی وائرلیس میں روسی زبان میں بات چیت مانیٹر کی ہے۔ فرانسیسی اخبار "لبریشن" نے ریاض میں اپنے نمائندے کے حوالے سے یہ خبر دیتے ہوئے لکھا ہے کہ اتحادی فوج کے اعلیٰ افسروں نے بھی اس کی تصدیق کی ہے۔ انہوں نے اسے "ٹاپ سیکرٹ" قرار دیتے ہوئے صرف اس قدر بتایا کہ یہ بات چیت فوجی نوعیت کی تھی اور پچھلے 48 گھنٹے سے کی جا رہی تھی۔ بعض اعلیٰ فوجی افسروں کے درمیان تبادلہ خیال معلوم ہوتا تھا۔ اتحادی ذرائع کا کہنا ہے ان فوجی افسروں کا لب و لہجہ عراقی نہیں تھا جس سے عراق کی مسلح افواج میں روسی فوجی افسروں کی موجودگی کا پتہ چلتا ہے۔ اتحادی انٹیلی جنس کا خیال ہے کہ مگ طیاروں اور سکڈ میزائلوں کے استعمال کے بارے میں مشورہ دینے کے لئے روسی فوجی ماہرین عراق میں موجود ہیں اور یہ بھی قیاس کیا جا سکتا ہے کہ وہ خلیج کی جنگ میں عراقی فوجی افسروں کی رہنمائی کر رہے ہیں۔

6 فروری۔ صدام، ان کے جرنیلوں اور عوام نے دلیری دکھائی انہیں سلام کرتا ہوں

جنرل اقبال:

امریکی جرنیل "اعلیٰ جنرل شپ" کا مظاہرہ نہیں کر رہے عراق پر بمباری فوری طور پر بند نہ ہوئی تو جنگ عالمگیر ہو جائے گی۔

امریکی جرنیل زمینی جنگ سے گھبرا رہے ہیں انہیں معلوم ہے کہ اس جنگ میں وہ مار کھائیں

گے: نوائے وقت سے انٹرویو۔

عراق نے اپنی فوج کو چھپا رکھا ہے فی الحال استعمال نہیں کر رہا ہے۔ اتحادی سول زندگی کو تباہ کر رہے ہیں: ائر مارشل ایاز

اسلام آباد (جاوید صدیق سے) جائنٹ چیفس آف سٹاف کمیٹی کے سابق سربراہ جنرل ریٹائرڈ اقبال خان نے کہا ہے کہ امریکی جرنیل عراق کے خلاف جنگ میں "اعلیٰ جنرل شپ" کا مظاہرہ نہیں کر رہے وہ تو عراق پر لاکھوں ٹن بارود برسا رہے ہیں جس سے عراق کی سول آبادی متاثر ہو رہی ہے اور زندگی کا دوسرا نظام درہم برہم ہو رہا ہے۔ انہوں نے کہا کہ امریکیوں کو فوری طور پر عراق پر بمباری بند کر دینی چاہیئے۔ امریکی جرنیلوں کو عراق کو کویت سے نکالنے کا کوئی دوسرا طریقہ نہیں ملا تھا کہ انہوں نے سول آبادیوں پر میزائل اور گولہ بارود گرانا شروع کر دیا ہے پاکستان کی چیفس آف سٹاف کمیٹی کے سابق چیئرمین نے کہا کہ عراق پر اتحادی جتنی بمباری کر چکے ہیں اتنی دوسری جنگ عظیم میں بھی نہیں ہوئی تھی۔ انہوں نے کہا فوجی نقطہ نگاہ سے بھی امریکی جنگی منصوبہ بندی قابل تحسین نہیں کہ ایک چھوٹے ملک پر ہر روز ہزاروں ہوائی جہاز خوفناک بمباری کر رہے ہیں۔ اگر امریکیوں نے فوری طور پر بمباری بند نہ کی تو پھر تیسری عالمگیر جنگ شروع ہو سکتی ہے۔ اب اسرائیل بھی جنگ میں کود پڑا ہے اس نے لبنان پر بمباری شروع کر دی ہے اور آہستہ آہستہ جنگ کا دائرہ وسیع ہو رہا ہے۔ اس وقت جو جنگ ہو رہی ہے وہ دوسری عالمی جنگ کے پیمانے کی جنگ ہے۔ دوسری جنگ میں ہٹلر کے خلاف 28 ممالک لڑ رہے تھے اور اس وقت صدر صدام حسین کے خلاف 28 ممالک برسرپیکار ہیں۔ صرف روس ابھی تک اس جنگ سے باہر ہے۔ انہوں نے صدر صدام حسین اور عراقی عوام کو خراج تحسین پیش کیا اور کہا کہ صدر صدام کے جرنیلوں اور عوام نے 19 دن میں جو بہادری اور دلیری دکھائی ہے میں اس پر انہیں سلام کرتا ہوں۔ اس طرح کی جرات کی مثال نہیں ملتی۔ انہوں نے کہا کہ صورتحال یہ ہے کہ امریکی اب زمینی جنگ شروع کرنے سے خوف زدہ ہیں۔ وہ صرف فضائی جنگ لڑ رہے ہیں۔ امریکی جرنیل صرف ٹیکنالوجی کا سہارا لئے ہوئے ہیں۔ وہ زمینی جنگ سے گھبراتے ہیں۔ کیونکہ انہیں معلوم ہے کہ اس

جنگ میں وہ مار کھائیں گے۔ سابق جرنیل نے ایک سوال کے جواب میں کہا کہ میرے خیال میں عراق کی بری فوج ابھی تک صحیح سلامت ہے اور وہ مقابلہ کرنے کی صلاحیت رکھتی ہے۔ البتہ عراقی ائر فورس اب مقابلے کی پوزیشن میں نہیں۔ انہوں نے کہا کہ یہ جنگ فوری طور پر بند ہونی چاہیئے ورنہ ایک اسلامی ملک کی فوج تباہ ہو جائے گی۔ پاک فضائیہ کے سابق ائر وائس مارشل ایاز خان نے خلیج کی جنگ کی تازہ ترین صورتحال پر "نوائے وقت" سے بات چیت کرتے ہوئے کہا کہ عراق کی فوجی حکمت عملی "نان پوزسٹرٹیجی" ہے۔ جس کا مطلب عراق نے اپنی فوج کو چھپا کر رکھا ہے اور انہوں نے اب عراق کی سول زندگی کو تہس نہس کرنے کا سلسلہ شروع کر دیا ہے۔ وہ خوفناک بمباری کر رہے ہیں۔ اتحادی جنگی منصوبہ سازوں کا خیال ہے کہ عراق اس صورتحال سے گھبرا گیا تو اپنی چھپائی ہوئی فوج لے کر باہر آ جائے گا جسے وہ بمباری کر کے تہس نہس کر دیں گے۔ یا پھر صدام حسین مجبوراً کویت سے فوجیں نکالے گا۔ سابق ائر وائس مارشل نے کہا کہ صدام حسین اور ان جرنیلوں نے بے پناہ دلیری اور جرات دکھائی ہے۔ لیکن اب میرے خیال میں صدر صدام حسین کو فوجی حکمت عملی کے پیش نظر کویت سے فوج نکالنے کا اعلان کرنا چاہیئے سابق ائر وائس مارشل نے کہا کہ یہ عراق کی طرف سے "حکمت عملی والا انخلا" ہو گا۔ ائر وائس مارشل ریٹائرڈ ایاز خان نے کہا کہ عراق نے کویت کی سرحد پر 12 ڈویژن فوج چھپا رکھی ہے اور اس کے پاس گولہ بارود کا بھاری ذخیرہ موجود ہے۔

خلیجی جنگ سے کویت آزاد نہیں ہو گا امریکہ صرف اپنے مفادات کے لئے لڑ رہا ہے۔

جدید ٹیکنالوجی نہ افغانستان میں مسلمانوں کا کچھ بگاڑ سکی نہ کشمیر میں کام آئی اور نہ خلیج میں کچھ بگاڑ سکے گی قاضی حسین احمد

لاہور (وقائع نگار) امیر جماعت اسلامی سینٹر قاضی حسین احمد نے کہا کہ خلیج کی جنگ کے نتیجے میں کویت آزاد نہیں ہو گا۔ امریکہ سعودی عرب یا کویت کی حفاظت کے لئے نہیں بلکہ مفادات کی خاطر آیا ہے۔ انہوں نے کہا کہ مسلمان کا ہتھیار اس کا جذبہ شہادت اور موت

سے بے حوصلی ہے۔ جدید ٹیکنالوجی نہ افغانستان میں مسلمانوں کا کچھ بگاڑ سکی نہ یہ کشمیر میں کر کام آ رہی ہے اور نہ ہی یہ خلیج میں کچھ بگاڑ سکے گی۔ امت مسلمہ کو انحطاط سے نکال کر عروج تک لے جانے کے لئے اس وقت جو بیداری کی لہر اٹھی ہے تابناک مستقبل کی نوید ہے۔ اگلی صدی امت مسلمہ کی عظمت کی صدی ہو گی۔ ان خیالات کا اظہار انہوں نے آج یہاں جماعت اسلامی لاہور کے زیر اہتمام "عراق اور کشمیر کے مظلوم مسلمانوں کی حمایت" میں منعقدہ ریلی انار کلی لاہور میں جلسہ سے خطاب کرتے ہوئے کیا۔ جلسے سے صوبائی اسمبلی کے رکن فرید احمد پراچہ، ارشاد سیٹھی اور افغانستان کے حکمت یار گلبدین کے نمائندے انجینئر عابد نے بھی خطاب کیا۔ قاضی حسین احمد نے کہا کہ امریکہ کا دفاعی بجٹ 3 بلین ڈالر ہے جو کہ عربوں کے تیل کے مجموعی دولت کا چار گنا ہے۔ یہ بجٹ اس نے امت مسلمہ کے خلاف استعمال کرنا ہے کیونکہ اس کے نزدیک مسلمان وہ "بنیاد پرست" ہیں جن سے اسے مستقبل میں خطرہ ہے۔ انہوں نے کہا کہ مسلمان کی بیداری اور نشاۃ ثانیہ کی تحریک اٹھ چکی ہے۔ یہ تحریک ماضی میں ایشیا کے راستے ماسکو، قسطنطنیہ اور سپین بھی پہنچی اور اب ایک دفعہ پھر آگے بڑھ رہی ہے۔ اس لئے یہ صدی امت مسلمہ کی عظمت کی صدی ہو گی اور امت مسلمہ کا دنیا میں غلبہ ہو گا۔ انہوں نے کہا خلیج کی جنگ کی بھٹی میں 80،80 ہزار ٹن بارود گرایا جا رہا ہے۔ یہ سارا بارود محض عراق کو ختم کرنے کے لئے نہیں بلکہ اسلام کو دبانے اور ختم کرنے کے لئے استعمال کیا جا رہا ہے۔ قاضی حسین احمد نے کہا کہ آج جو کچھ عراق کے ساتھ ہو رہا ہے وہی کل ترکی اور پاکستان کے ساتھ بھی ہو سکتا ہے۔ امریکی اور صیہونی طاقتیں دنیا میں ایک نیا عالمی نظام استوار کرنا چاہتی ہیں جس میں مسلمان ایک پسماندہ قوم بن کر اور شودر کی حیثیت سے رہیں۔ انہوں نے کہا کیا ماضی میں امریکہ کسی مسلمان کی مدد کے لئے آیا تھا۔ وہ مسلمانوں کا دشمن ہے اور تم دشمنوں سے حفاظت کی توقع رکھتے ہو۔ ہمیں اپنی بنیادوں پر خود کھڑا ہونے کی ضرورت ہے۔ یہ امریکی امداد آپ کی بھلائی کے لئے نہیں بلکہ آپ کو باندھنے کے لئے ہے۔ انہوں نے کہا کہ عوام کو چاہئے کہ وہ جہاد کے لئے تیار ہو جائیں اور اپنے آپ کو منظم کریں۔ فحاشی اور لغویات سے پرہیز کر کے اپنی جسمانی قوت میں اضافہ کریں اور جدید

ٹیکنالوجی سے روشناس ہو کر اسلحہ چلانے کی تربیت حاصل کریں۔ انہوں نے کہا کہ عراق اور سعودی عرب میں تو ویزا اور پاسپورٹ کی پابندی ہے وہاں مجاہدین نہیں جا سکتے لیکن افغانستان اور کشمیر میں ایسی کوئی پابندی نہیں ہے وہاں انہیں جانا چاہئے۔

قبل ازیں جلسے سے خطاب کرتے ہوئے فرید احمد پراچہ نے کہا امت مسلمہ کے خلاف جو محاذ بن گیا ہے عراق اسی کا ایک حصہ ہے۔ ہم جس طرح امریکہ پر زور دیں گے کہ خلیج سے نکل جائے اس طرح عراق سے بھی کہیں گے کہ وہ کویت خالی کر دے۔ انہوں نے کہا کہ بھارت نے کشمیر پر جو جارحیت کی ہے ان کا نتیجہ کشمیر کی آزادی کی صورت میں نکلے گا کیونکہ آپ نے دیکھا ہے کہ افغانستان سے بھی سپر پاور روس کو نکلنا پڑا اسی طرح منی سپر پاور بھارت کو بھی کشمیر سے نکلنا پڑے گا۔ ہم محلوں اور گلی کوچوں میں نوجوانوں کو کشمیر کے جہاد کے لئے تیار کر رہے ہیں۔ ارشاد احمد سیٹھی نے کہا کہ جب بھی امیر جماعت قاضی حسین احمد ہمیں جہاد کے لئے بلوائیں گے ہم ان کی قیادت میں اکٹھے ہو جائیں گے۔ یہ صدی انشاء اللہ مسلمانوں کی صدی ثابت ہو گی۔ انجینئر عابد، نمائندہ حکمت یار گلبدین نے کہا کہ ہم نے جس طرح افغانستان میں ایمان کے اسلحہ کے ساتھ جنگ لڑی ہے اس طرح دو تین ماہ کے اندر اندر افغانی مجاہد کشمیر کے محاذ پر بھی لڑیں گے۔ انہوں نے کہا کہ پاکستان اور کشمیر کے محاذ پر لڑنا اسی طرح ہے جیسے ہم اسلام کے لئے لڑ رہے ہیں اور دنیا میں جہاں جہاں مسلمانوں پر ظلم ہو رہا ہے ہم ان کی آزادی کے لئے لڑیں گے۔

16 فروری عراق نے کویت خالی کرنے کی مشروط پیشکش کر دی

بغداد (مانیٹرنگ ڈیسک) عراق نے کویت سے اپنی فوجوں کے انخلا پر آمادگی ظاہر کی ہے بشرطیکہ اسرائیل بھی مقبوضہ عرب علاقوں کو خالی کر دے۔ اور اگر وہ ایسا نہیں کرتا تو اقوام متحدہ کو چاہئے کہ وہ اسرائیل کے خلاف وہی اقدامات کرے جو وہ عراق کے خلاف کر رہی ہے۔ وائس آف جرمنی کے مطابق عراقی خبر رساں ایجنسی نے بتایا ہے کہ عراقی انقلابی کمانڈ کونسل نے یہ مطالبہ بھی کیا ہے کہ وہ ہتھیار جو اسرائیل کو امریکہ نے حال ہی میں مہیا کئے ہیں اسرائیل انہیں واپس کرے۔ اتحادی افواج ایک ماہ کے اندر اندر خلیج کے علاقے سے واپس

چلی جائیں اور اپنا سامان حرب اپنے اپنے ملکوں کو واپس لے جائیں نیز اتحادی ممالک عراق کی بلا قیمت تعمیر نو کی ضمانت دیں اور یہ ضمانت عراقی انخلاء کی کارروائی سے پہلے پہلے دی جائے۔ امریکی وزارت دفاع کے ترجمان نے عراقی اعلان کے بارے میں شک وشبہ کا اظہار کیا ہے ترجمان کے مطابق امریکہ عراق اور کویت پر بمباری جاری رکھے گا۔ پیرس میں بغداد کے اعلان پر محتاط رد عمل ظاہر کیا گیا ہے۔ وائس آف جرمنی کے مطابق عراق نے کویت سے دستبرداری اور اقوام متحدہ کی سلامتی کونسل کی قرار دادوں کو قبول کرنے پر رضامندی کا اظہار کرتے ہوئے کہا ہے کہ وہ مسئلے کے حل کے لئے متعدد سفارشات تیار کرنے کے لئے بھی تیار ہے۔ تاہم اعلان میں فوجوں کے انخلا کو مشرق وسطی کے دیگر مسائل کے جامع حل کے ساتھ مشروط کیا ہے۔ اس فیصلے کا اعلان عراق کی انقلابی کونسل کمان کی طرف سے جاری کیا گیا ہے۔ جس کے سربراہ صدر صدام حسین ہیں عراقی حکام کا کویت سے انخلاء کا یہ فیصلہ انتہائی غیر متوقع اور اچانک تھا کیونکہ صدر صدام حسین نے گذشتہ روز پی ایل او کے سربراہ یاسر عرفات کو بتایا تھا کہ خلیجی جنگ 6 سال تک بھی جاری رہ سکتی ہے۔ سعودی عرب اور دیگر خلیجی ریاستوں میں اس خبر پر پہلا رد عمل سراسیمگی کی صورت میں برآمد ہوا۔ ان کے لئے یہ خبر نا قابل یقین تھی۔ جبکہ عراقی دارالحکومت بغداد میں جشن کا سا سماں دکھائی دینے لگا۔ کویت کی بحالی کے لئے مصروف جنگ اتحادیوں کے رہنما امریکہ نے عراق کے اعلان کو مسترد کر دیا ہے امریکی وزارت دفاع کے ایک عہدیدار نے ایک وضاحتی بیان میں کہا ہے کہ عراق کا بیان مشکوک ہے اور جب تک انہیں جنگ بندی کے باقاعدہ احکامات موصول نہیں ہو جاتے عراق کے خلاف فوجی کارروائی بدستور جاری رہے گی۔ امریکی اہلکار کے مطابق کویت سے انخلاء کا وعدہ تو صدر صدام حسین نے 2 اگست کو کویت پر قبضہ کے فوراً بعد بھی کیا تھا جس پر وہ خود عملدرآمد نہیں کر سکے تھے۔ امریکی وزارت دفاع کے افسر کا کہنا ہے کہ اب بھی جب تک صدر صدام کوئی عملی اقدام نہیں کرتے ان کے اعلان پر یقین نہیں کیا جا سکتا۔ عراق کی مبینہ دست برداری کا فیصلہ ایک ایسے موقع پر سامنے آیا ہے جب اتحادی فوجیں فضائی حملوں کے ساتھ ساتھ بری جنگ کا بھی آغاز کرنے والی تھیں۔ گزشتہ روز امریکی وزارت دفاع کے ایک

اعلیٰ افسر نے یہی کہا تھا کہ اتحادی طیاروں کی بمباری سے عراقی ٹینکوں کی ایک تہائی تعداد تباہ کی جا چکی ہے جبکہ اسرائیلی فوج کے خفیہ ادارے کا کہنا تھا کہ اتحادی بمباری عراقی افواج کو کوئی خاص نقصان نہیں پہنچا سکی۔ عراق کے تازہ اعلان پر وہائٹ ہاؤس کے حکام نے محتاط رد عمل کا اظہار کیا ہے اور کہا ہے کہ کیونکہ انہوں نے ابھی عراق کے اعلان کا تفصیلی جائزہ نہیں لیا اس لئے وہ اس پر تسلی بخش طور پر اظہار رائے نہیں کر سکتے۔ عراقی بیان پر تبصرہ کرتے ہوئے فرانس کے وزارت دفاع کے ترجمان نے کہا ہے کہ اس پر ہوشمندانہ رد عمل کا اظہار کرنا چاہئے۔ بغداد کے اعلان کی روشنی میں حتمی نتائج تک پہنچنے کی کوشش کرنا چاہئے۔ ماسکو میں صدر گورباچوف کے ایک ترجمان نے کہا ہے کہ عراقی بیان سے روس کا وہ تاثر کسی حد تک صحیح ثابت ہو گیا ہے جو اس نے عراق کے ساتھ رابطہ کے بعد ظاہر کیا تھا۔ صدر گورباچوف کے ایلچی پریماکوف نے کہا تھا صدر صدام کویت سے انخلا پر بات چیت کے لئے آمادہ دکھائی دیتے ہیں۔ تاہم روسی صدر کے ترجمان نے عراق کے اعلان پر تفصیلی تبصرہ کرنے سے معذوری ظاہر کی اور کہا کہ جب تک اس اعلان کے تمام حصول کی وضاحت نہ ہو جائے اس پر کوئی رائے دینا قبل از وقت ہو گا۔ برطانیہ کے وزیر اعظم جان میجر نے اپنا رد عمل ظاہر کرتے ہوئے کہا کہ اگر عراق سلامتی کونسل کی قرار دادوں پر پوری طرح اور کوئی شرط عائد کئے بغیر عمل کرے تو یہ سبھی کے لئے بہت اچھی خبر ہو گی انہوں نے کہا کہ تاہم ابھی ہمیں صاف طور پر معلوم نہیں کہ آیا عراق اپنے اعلان پر عملدرآمد کرنے کے لئے تیار بھی ہے یا نہیں۔ آٹھ ممالک کے وزرائے خارجہ نے جو ایک اجلاس میں شریک تھے ریڈیو بغداد سے جاری کئے جانے والے اعلان پر تبصرہ کرتے ہوئے کویت کے وزیر خارجہ شیخ صباح الاحمد الصباح نے کہا کہ یہ ایک اچھا بیان ہے لیکن اس میں کچھ شرائط کا بھی ذکر کیا گیا ہے انہوں نے کہا کہ عراق کو کویت سے غیر مشروط طور پر نکلنا ہو گا۔ خلیجی تعاون کونسل نے عراقی اعلان کو واضح طور پر مسترد کر دیا ہے جاپان نے عراقی بیان پر رد عمل ظاہر کرتے ہوئے کہا ہے کہ تشویش کی بات یہ ہے کہ عراق کچھ شرائط عائد کر رہا ہے جاپان اس بارے میں تصدیق کرنے کی کوشش کر رہا ہے ٹوکیو میں سرکاری ترجمان نے کہا کہ جاپان صرف اسی صورت میں کویت

سے عراقی فوجوں کی واپسی کا خیر مقدم کرے گا جب یہ سلامتی کونسل کی قراردادوں کے مطابق عمل میں آئے۔ برسلز میں یورپی برادری کے ترجمان نے کہا ہے کہ وہ عراقی بیان پر اپنا ردعمل اس وقت تک ظاہر نہیں کر سکتے جب تک اس خبر کی تصدیق نہیں ہو جاتی جبکہ یورپی برادری کے موجودہ صدر کا کہنا ہے کہ دیگر صورتحال کا بغور جائزہ لینا چاہئے۔

بی بی سی کی خاتون نامہ نگار ڈائنا گڈمین نے واشنگٹن سے اپنی رپورٹ میں بتایا کہ عراقی اعلان سے قبل گزشتہ 24 گھنٹے سے امریکی عوام اپنے آپ کو زمینی لڑائی کے لئے ذہنی طور پر تیار کر رہے تھے جس کے بارے میں افواہیں تھیں کہ کسی بھی وقت شروع ہو سکتی ہے۔ چنانچہ جب یہ خبر آئی کہ عراق سلامتی کونسل کی قرارداد 660 کو نافذ کرنے اور کویت سے فوجیں واپس بلانے کے لئے تیار ہے تو اس کے لئے امریکی تیار نہیں تھے۔ امریکہ میں عراق کے اس اعلان پر بڑے محتاط ردعمل کا اظہار کیا جا رہا ہے اس پر کچھ شکوک و شبہات بھی ظاہر کئے جا رہے ہیں اس لئے کہ عراقی پیشکش مشروط ہے۔

نیٹو کی جانب سے کہا گیا ہے کہ کویت سے انخلاء کے ضمن میں عراق کی پیش کش غیر واضح ہے تاہم یہ خبر ہر ایک کے لئے اچھی ہو گی کہ عراقی فوجیں اقوام متحدہ کے مطالبات کے مطابق غیر مشروط طور پر نکل جائیں۔ ابھی ہمارے سامنے واضح تصویر نہیں آئی اس لئے کوئی تبصرہ کرنا قبل از وقت ہو گا۔ 16 رکنی اتحاد کے ترجمان نے کہا اگر عراق اقوام متحدہ کی قراردادوں کی مکمل اور غیر مشروط پابندی کرے تو یہ خبر سب کے لئے اچھی ہو گی لیکن ابھی ہمیں یہ معلوم نہیں کہ آیا عراقی حکومت کا موقف یہ ہے یا نہیں۔

وہائٹ ہاؤس کے ترجمان نے مارلن فٹزواٹر نے کہا کہ اس اعلان میں کویت سے عراقی افواج کی واپسی کے لئے شرائط موجود ہیں جبکہ سلامتی کونسل کی قراردادوں میں واضح طور پر کہا گیا ہے کہ کویت فوجوں کی مکمل طور پر غیر مشروط پر ہونی چاہئے صرف وعدے کافی نہیں صرف اقوام متحدہ کی قراردادوں پر عمل درآمد کے لئے رضامندی ہی نہیں ہونا چاہئے بلکہ اس کا عمل اور ٹھوس ثبوت درکار ہے۔ حکام کا کہنا ہے کہ قرارداد 660 میں جہاں عراقی افواج کی واپسی کے لئے کہا گیا ہے وہاں یہ بھی کہا گیا ہے کہ کویت اور عراق کے درمیان

مسئلوں کے حل کے لئے مذاکرات ہونے چاہئیں امریکی حکام کا کہنا ہے کہ عراق اس حق سے فائدہ اٹھاتے ہوئے ایسی شرطیں رکھ سکتا ہے جن کو مطمئن کرنا ناممکن ہی نہیں بہت بلکہ دشوار ہو گا۔ وہائٹ ہاؤس کے ایک ترجمان نے بتایا کہ عراقی بیان کا ابھی تجزیہ کیا جا رہا ہے اور اس کے ترجمہ میں اس کے مختلف مطالب سامنے آسکتے ہیں۔ بعض فوجی مبصروں کا خیال ہے کہ عراق کی یہ پیش کش محض بیان کی حد تک ہے جبکہ دوسرے مبصروں کا کہنا ہے کہ صدر صدام حسین خونریز جنگ میں جانے سے گریز کی راہ تلاش کر رہے ہیں۔

برطانوی وزیر اعظم جان میجر نے کہا ہے کہ اگر عراق کویت سے اب واپس جاتا ہے، فیصلہ کن اور ناقابل تنسیخ انداز سے اور بغیر کسی شرط کے اقوام متحدہ کی قراردادوں پر پوری طرح عمل کرتا ہے تو یہ واضح طور پر سب کے لئے اچھی خبر ہے لیکن وہ اس پر زور دینا چاہتے ہیں کہ ابھی تک ہم اس پر یقین نہیں کریں گے کہ یہی پوزیشن ہے ہمیں جلد از جلد واپسی کی شہادت چاہئے فی الحال ایسی کوئی شہادت نہیں۔

بی بی سی نے بتایا کہ بغداد ریڈیو صبح سے ہی یہ اعلان کر رہا تھا کہ وہ ایک اہم بیان نشر کرنے والا ہے۔ عراقی انقلابی کونسل کے اس اعلان میں کہا گیا ہے کہ عراق اقوام متحدہ کی سلامتی کونسل کی قرارداد 660 سے تعاون کے لئے تیار ہے جس میں کویت سے عراقی فوجوں کی واپسی سمیت خلیج کے بحران کے باعزت سیاسی تصفیہ پر زور دیا گیا ہے۔ بی بی سی کے مطابق اس قرارداد میں غیر مشروط واپسی کا مطالبہ کیا گیا تھا لیکن انقلاب کمان کونسل کے اعلان میں متعدد شرائط پیش کی گئی ہیں عراقی اعلان میں کہا گیا ہے کہ عراق کی طرف سے کویت سے واپسی پر رضامندی کو عراق کی ضمانت تصور کیا جانا چاہئے اور تمام بری، بحری اور فضائی کارروائیاں بند کی جانی چاہئیں۔ سلامتی کونسل کی قرارداد 660 کے بعد عراق کے بارے میں جتنی بھی قراردادیں منظور کی گئی ہیں وہ منسوخ کی جائیں اور کویت سے فوج کی واپسی پر رضامندی کو پہلا قدم تصور کیا جائے اس کے ساتھ فلسطین اور دوسرے عرب علاقوں سے اسرائیل کی واپسی منسلک ہونی چاہئے۔ اور اگر اسرائیل نے ایسا نہ کیا تو اس کے خلاف ان تمام قراردادوں کا اعلان ہونا چاہئے جو عراق کے منظور کی گئی تھیں۔ عراقی اعلان میں کہا گیا ہے کہ

کویت سے عراق کی واپسی کے وعدے کے ساتھ علاقے سے امریکہ اور دوسرے ممالک کی فوجوں اور فوجی ساز و سامان اور اسلحہ کی واپسی عمل میں آنی چاہئے جو عراق کے خلاف جارحیت میں شامل ہیں۔ گذشتہ اگست سے جب سے کویت کا بحران شروع ہوا ہے یہ پہلا موقع ہے کہ عراق نے کویت سے واپسی کا نقطہ استعمال کیا ہے اور پہلی بار سلامتی کونسل کی قرارداد 660 سے تعاون پر آمادگی ظاہر کی ہے۔ مگر عراقی قیادت کی جانب سے کویت سے واپسی پر رضامندی کا اظہار بذات خود ایک بڑی پیش رفت ہے۔ سلامتی کونسل کی قرارداد 660 میں جہاں کویت سے عراق کی فوری اور غیر مشروط واپسی کا مطالبہ کیا گیا ہے وہاں اس میں کویت اور عراق کے درمیان مذاکرات پر بھی زور دیا گیا ہے۔ عراق کی طرف سے یہ شرط بھی عائد کی گئی ہے کہ قرارداد 660 کے بعد منظور ہونے والی تمام قراردادیں منسوخ کی جائیں اس کا مطلب یہ ہے کہ عراق کی خلاف اقتصادی ناکہ بندی ختم کی جائے عراق نے یہ مطالبہ بھی کیا ہے کہ اس کے خلاف جارحیت میں جو ملک شامل ہیں وہ عراق کی تباہی اور نقصان کا تاوان ادا کریں اور عراق کے تمام قرضے معاف کئے جائیں۔ عراقی اعلان میں یہ بھی کہا گیا ہے کہ الصباح خاندان کو کویت میں بحال نہ کیا جائے بلکہ وہاں ایک نیا جمہوری نظام قائم کیا جائے جو قومی اور اسلامی رجحان کا مظہر ہو۔

18 فروری عراق میں داخل نہیں ہونا چاہتے۔ امریکی وزیر دفاع

واشنگٹن (ریڈیو نیوز) امریکہ کے وزیر دفاع ڈک چینی نے کہا ہے کہ عراق جب تک اقوام متحدہ کی سلامتی کونسل کی قرارداد پر مکمل اور غیر مشروط عمل درآمد نہیں کرتا جنگ بندی نہیں کی جائے گی۔ آج ایک ٹیلی ویژن انٹرویو میں ڈک چینی نے کہا کہ عراق نے جو تجاویز پیش کی ہیں اسے خلیج کے بحران کے سلسلے میں پیش رفت تو کہہ سکتے ہیں لیکن اس سے جنگ بند نہیں ہو سکتی۔ امریکی وزیر دفاع نے سی این این پر انٹرویو کے دوران ایک سوال کے جواب میں کہا کہ عراقی انخلاء کی پیش کش میں جنگ شروع ہونے کے بعد پہلی بار کویت خالی کرنے پر آمادگی ظاہر کی گئی ہے۔ جس سے یہ ظاہر ہوتا ہے کہ اصولی طور پر عراق نے کویت کو خالی کرنے کا فیصلہ کر لیا ہے۔ ڈک چینی سے پوچھا گیا کہ خلیج کی جنگ میں قیام امن کے لئے روس کی مداخلت کو آپ کس نظر سے دیکھتے ہیں؟۔ اس پر امریکی وزیر دفاع نے کہا کہ روس نے کویت سے عراقی فوج کے انخلاء کے بارے میں سلامتی کونسل کی قرارداد کی مکمل حمایت کی ہے روس نے عراق کو اسلحہ اور گولہ بارود کی تمام فراہمی بند کر رکھی ہے اس لئے ہم سمجھتے ہیں کہ روس عراق پر دباؤ ڈالے گا کہ وہ کویت سے اپنی افواج غیر مشروط واپس نکال لے۔ اس اعتبار سے ہم صدر گورباچوف کی مداخلت کا خیر مقدم کرتے ہیں۔ سی این این کے نمائندے مسٹر چارلس نے مسٹر ڈک چینی سے سوال کیا کہ آپ جنگ بندی کر کے صدام کو موقع کیوں نہیں دیتے کہ وہ کویت سے اپنی فوجیں نکال لے۔ اس پر امریکی وزیر دفاع نے کہا کہ اگر ہم اس مرحلے پر جنگ بندی کرتے تو صدام حسین کو موقع مل جائے گا کہ وہ اپنی پوزیشنوں کو دوبارہ درست کر لے۔ ان سے پوچھا گیا کہ آپ کے خیال میں خلیج کی جنگ کتنا عرصہ مزید جاری رہے گی۔ اس پر امریکی وزیر دفاع ڈک چینی نے کہا کہ جنگ کے بارے میں کوئی اندازہ لگانا غلط ہو گا کیونکہ ہمارے پیش نظر کئی کاوشیں بھی ہیں ہم شہریوں کا اس جنگ میں نقصان کم سے کم چاہتے ہیں اور دیگر کئی پہلو پیش نظر ہیں۔ ان سے پوچھا گیا کہ آیا یہ جنگ ہفتوں چلے گی یا مہینوں پر پھیلے گی؟۔ مسٹر ڈک چینی نے کہا کہ وہ کوئی اندازہ دینے کے لئے تیار نہیں۔ ان سے پوچھا گیا کہ صدر گورباچوف نے صدر بش کو جو خط لکھا ہے کہ اس میں زمینی جنگ شروع نہ کرنے کے بارے میں درخواست کی گئی ہے۔ اس پر مسٹر ڈک چینی نے کہا کہ دو صدروں کے مابین براہ راست خط کے بارے میں کچھ نہیں کہہ سکتا کہ اس خط کے مندرجات کیا تھے۔ زمینی جنگ کے بارے میں ان سے سوال کیا گیا کہ کیا اتحادی افواج عراق کی سرزمین میں بھی داخل ہوں گی۔ اس پر ڈک چینی نے کچھ توقف سے جواب دیتے ہوئے کہا کہ ہم صرف کویت کو خالی کرانا چاہتے ہیں عراق میں داخل نہیں ہونا چاہتے۔ لیکن پھر بھی میں اس وقت اپنے آئندہ نقشے کے بارے میں کچھ نہیں بتانا چاہتا۔ ایک سوال کے جواب میں انہوں نے کہا کہ عراق کی جنگی قوت کے نقصانات کے بارے میں اندازے تھوڑے بہت مختلف ہو سکتے ہیں لیکن میرا خیال ہے کہ بنیادی بات یہ ہے کہ عراق کی جنگی قوت اور مواصلات کو کافی نقصان پہنچ چکا ہے۔ عراقی فوجی مواصلات کے بارے میں ایک سوال کے جواب میں انہوں نے کہا کہ

بغداد میں شہری علاقوں پر مزید مواصلاتی مراکز ہو سکتے ہیں۔ بہرحال ہم نے کہا ہے کہ الرشید ہوٹل پر بمباری نہ کی جائے۔

صدر بش نے کویت خالی کرنے سے متعلق عراقی پیش کش کو "ظالمانہ مذاق" قرار دے دیا

واشنگٹن (مانیٹرنگ ڈیسک) امریکی صدر بش نے کہا ہے کہ آج جب انہوں نے عراق کا اعلان سنا تو اس کا پہلا تاثر خوشی کا احساس تھا انہیں محسوس ہوا کہ شاید عراق کو اس بات کا احساس ہو گیا ہے کہ اسے بالآخر کویت خالی کرنا پڑے گا اور وہ اس پر آمادہ ہو گئے ہیں لیکن جب انہوں نے عراقی بیان کا از سر نو بغور مطالعہ کیا تو معلوم ہوا کہ یہ عراق کی طرف سے ایک "ظالمانہ مذاق" ہے۔ عراق نے جو اعلان کیا ہے اس میں نہ صرف پہلے سے عائد شرائط شامل ہیں بلکہ انہوں نے اس میں مزید شرائط بھی شامل کر دی ہیں۔ صدر بش نے کہا کہ یہ تمام شرائط ناقابل قبول ہیں اور اس اعلان سے یہ عندیہ مل گیا ہے کہ صدر صدام حسین کویت سے بالکل واپس جانا نہیں چاہتے صدر بش نے کہا کہ اگر عراقی عوام خون ریزی کو ختم کرانا چاہتے ہیں تو اس کا صرف ایک ہی راستہ باقی ہے کہ وہ آمر صدام کا تختہ الٹ دیں۔ انہوں نے عراقی عوام اور فوج سے کہا کہ انہیں خون ریزی کو ختم کرنے کے لئے معاملات کو اپنے ہاتھ میں لے لینا چاہئے اور آمر صدام حسین کو بے دخل کر دینا چاہئے۔ انہوں نے کہا کہ امریکہ عراق کا دشمن نہیں ہے تاہم امریکہ صدر صدام کا دشمن ہے جو ملک کو اور عوام کو داؤ پر لگائے ہوئے ہیں۔

19 فروری گورباچوف نے امن منصوبہ پیش کر دیا

ماسکو (مانیٹرنگ ڈیسک) روس کے صدر گورباچوف نے عراقی وزیر خارجہ طارق عزیز کو خلیج کی جنگ کے خاتمہ کے لئے منصوبہ پیش کیا روسی صدر کے ترجمان وتاجی اگنا تنکو نے بتایا ہے کہ صدر گورباچوف نے جو خصوصی منصوبہ پیش کیا ہے اس کے تحت بحران کو سیاسی ذرائع سے حل کرنے کی تجاویز پیش کی گئی ہے۔ عراقی وزیر خارجہ روسی رہنماؤں سے مذاکرات کے بعد صدر گورباچوف کے منصوبے کے بارے میں صدر صدام حسین کو رپورٹ پیش کرنے کے لئے روانہ ہو گئے ہیں طارق عزیز نے صدر گورباچوف کے ساتھ خلیج کے بحران پر ساڑھے تین گھنٹے طویل مذاکرات کئے۔ صدر گورباچوف کے ترجمان نے خلیجی جنگ کے خاتمہ کے سلسلہ میں کہا کہ منصوبہ کے بارے میں تفصیلات بتانے سے انکار کیا۔ تاہم یہ بتایا کہ صدر گورباچوف نے اپنا منصوبہ طارق عزیز کے ساتھ صبح کی ملاقات کے دوران پیش کیا۔ روسی صدر کے ترجمان نے اس کے ساتھ میں بتایا کہ انہیں طارق عزیز کا رویہ تعمیری ہونے کا تاثر ملا ہے۔ بعد میں موصولہ رپورٹوں کے مطابق عراقی وزیر خارجہ طارق عزیز نے روس سے وطن واپسی پر تہران میں قیام کے دوران ایوان کے رہنماؤں سے بھی مذاکرات کئے ہیں۔ طارق عزیز نے ایرانی وزیر خارجہ ڈاکٹر علی اکبر ولایتی کو روسی رہنماؤں کے ساتھ ہونے والی اپنی بات چیت سے بھی آگاہ کیا۔ طارق عزیز نے ماسکو جانے سے قبل بھی اتوار کو تہران میں ایرانی وزیر خارجہ سے مذاکرات کئے تھے۔ بتایا گیا ہے کہ طارق عزیز نے روسی رہنماؤں سے ہونے والی بات چیت کے نتائج کے بارے میں بھی ایرانی وزیر خارجہ سے تبادلہ خیال کیا علاقہ میں سیاسی کوششیں جاری رکھنے اور ایک دوسرے سے زیادہ تعاون کرنے اور تباہ کن جنگ جلد از جلد ختم کرنے کے معاملات پر بھی غور ہوا۔

بی بی سی کے مطابق روسی صدر کے ترجمان نے کہا کہ نئے امن منصوبے کے بارے میں امریکہ کے صدر بش سے کوئی مشورہ نہیں کیا گیا تاہم اتحادی لیڈروں کو بعد میں اس بارے میں آگاہ کیا جائے گا۔ بتایا گیا ہے کہ صدر گورباچوف نے جو نیا امن منصوبہ پیش کیا ہے اس کے بارے میں عراق کے صدر صدام حسین کا جواب منگل تک روسی صدر کو موصول ہو جائے گا۔ گورباچوف نے اپنے امن منصوبے کے بارے میں جرمنی کے چانسلر ہلمٹ کوہل سے بھی تبادلہ خیال کیا ہے وہ اس بارے میں دوسرے اتحادی لیڈروں سے بھی بات کریں گے۔

امریکہ نے مشرق وسطیٰ کا نقشہ بدلنے کے منصوبے کی تصدیق کر دی

ریاض (ڈپ ا / پ پ ا) امریکہ کے محکمہ خارجہ نے اس بات کی تصدیق کر دی ہے کہ وہ مشرق وسطیٰ کے آئندہ نقشے کے بارے میں ایک بلیو پرنٹ تیار کر رہے ہیں جس پر جنگ کے اختتام پر عمل در آمد ہو گا۔ امریکی وزارت خارجہ کی ترجمان مارگریٹ ٹوٹ ویلر فیوز نے تسلیم

کیا ہے۔ کہ خلیج میں جنگ کے بعد مشرق وسطیٰ کی کیا صورت بنتی ہے اس بارے میں وزارت خارجہ میں ایک ریسرچ پر کام ہو رہا ہے۔ اس سلسلہ میں قومی سلامتی کے نائب مشیر رابرٹ گیٹس مختلف ایجنسیوں وائٹ ہاؤس، محکمہ خارجہ اور محکمہ دفاع کے درمیان رابطوں سے ایک فارمولا وضع کر رہے ہیں۔ واشنگٹن پوسٹ میں شائع ہونے والے ایک آرٹیکل کے مطابق مذکورہ پلان میں علاقے کے اقتصادی پہلو، سلامتی، اسلحہ پر کنٹرول اور اسرائیل فلسطین تنازعہ کو سامنے رکھ کر غور کیا جا رہا ہے۔ مشرق وسطیٰ کی امیر ریاستوں کو غریب ریاستوں کی مدد پر آمادہ کیا جائے گا۔ علاقہ سے امریکہ کی زمینی افواج نکل جائیں لیکن فضائی اور بحری فوج سلامتی اور تحفظ کے لئے تعینات کی جائے گی اور عراق کو اسلحہ کی فراہمی پر مستقل پابندی عائد کر دی جائے گی۔ اس سے پہلے یہ خبر آ چکی ہے کہ امریکہ مشرق وسطیٰ میں بعض اہم جغرافیائی تبدیلیاں کرنا چاہتا ہے اور عراق کو مکمل شکست دینے کے بعد اس کو چار مختلف ملکوں میں تقسیم کر دیا جائے گا جن میں ایران شام اور اردن بھی شامل ہیں۔ ایران نے اس منصوبے کو مذموم قرار دیا اور واضح کر دیا کہ وہ ایسے ہر منصوبے کی زبردست مخالفت کرے گا اور عراق کو کبھی تقسیم نہیں ہونے دے گا۔

20 فروری بش نے گورباچوف کا منصوبہ مسترد کر دیا

واشنگٹن (مانیٹرنگ ڈیسک) امریکہ کے صدر بش نے خلیجی جنگ کے خاتمہ کے لئے صدر گورباچوف کے امن منصوبہ کو مسترد کرتے ہوئے کہا ہے یہ منصوبہ جنگ بندی کے ضمن میں امریکہ کے تقاضے پورے نہیں کرتا۔ صدر بش نے کہا کہ اتحادی اپنی منزل کا تعین کر چکے ہیں عراق کو کوئی رعایت نہیں دی جا سکتی اور نہ کوئی مذاکرات ہو سکتے ہیں۔ روسی تجاویز جنگ بندی کے تقاضے پورے نہیں کرتیں انہوں نے کریملن کو بے تکلفی سے بتا دیا ہے کہ فی الحال روسی تجاویز قابل قبول نہیں تاہم ان کا اچھی طرح سے جائزہ لیا جائے گا۔ صدر بش نے کہا کہ انہوں نے صدر گورباچوف کو ان کے منصوبہ کے بارے میں اپنی رائے سے آگاہ کر دیا ہے۔ خلیج میں جنگ بندی اور کویت سے عراق کے انخلاء کو دوسرے مسائل سے منسلک نہیں کیا جا سکتا۔ انہوں نے روسی منصوبے کی تفصیلات کا انکشاف کئے بغیر کہا کہ انہوں نے

تجاویز کا جائزہ لینے کے بعد صدر گورباچوف کو اپنے رد عمل سے آگاہ کر دیا ہے جہاں تک میرا تعلق ہے کوئی مذاکرات نہیں ہو سکتے نہ کوئی رعایت دی جائے گی۔

24 فروری جیتیں گے: ہتھیار نہیں ڈالیں گے۔ صدام

بغداد (مانیٹرنگ ڈیسک) عراق کے صدر صدام حسین نے اعلان کیا ہے کہ ان کا ملک مشرق وسطیٰ کے مسائل کے بارے میں ضمانتیں لئے بغیر کوئی قوم نہیں اٹھائے گا۔ عراق ہتھیار نہیں ڈال سکتا اور اس کی فوج اتحادیوں کے خلاف فتح حاصل کرنے کی پوری پوری اہلیت رکھتی ہے۔ صدر صدام حسین اپنی ہنگامی تقریر میں عراق کے خلاف امریکہ اور اس کے اتحادیوں کی جارحیت کا ذکر کرتے ہوئے سعودی عرب کے شاہ فہد اور مصر کے صدر حسنی مبارک کی خاص طور پر مذمت کی اور کہا کہ عراق کو ان جارح قوتوں کا سامنا ہے جن کے اوسان خطا ہو چکے ہیں۔

صدر صدام حسین نے بغداد ریڈیو سے اپنی ہنگامی تقریر کا آغاز عراق کی مسلح افواج کے ساتھ، تمام عرب عوام اور دنیا بھر کے مسلمانوں کو مخاطب کرتے ہوئے کیا۔ صدر صدام حسین نے کہا کہ امریکہ اور اس کے اتحادیوں کے خلاف لڑائی میں اب تک عراق نے محض اپنا دفاع کیا ہے۔ انہوں نے لڑائی میں امریکہ اور اس کے اتحادیوں کا ساتھ دینے والے تمام علاقائی ممالک کو غدار قرار دیا۔

بی بی سی کے مطابق صدر صدام حسین نے کہا اتحادی یہ چاہتے ہیں کہ ہم ہتھیار ڈال دیں لیکن انہیں مایوسی ہو گی۔ عراق کا ایک نصب العین ہے اور وہ اس پر قائم رہے گا۔ صدر صدام حسین نے یہ وضاحت نہیں کی کہ آیا وہ روس کے صدر گورباچوف کے امن منصوبے کو قبول کرتے ہیں یا نہیں۔

بی بی سی کے مطابق صدر صدام حسین نے اپنی 35 منٹ کی تقریر میں صدر گورباچوف کے امن منصوبے کا براہ راست کوئی حوالہ نہیں دیا اس کے برعکس انہوں نے عراق کی اس پیش کش کا تذکرہ کیا جو عراق کی انقلابی کمان کونسل نے گزشتہ ہفتے آگے بڑھائی تھی انہوں نے کہا کویت سے کسی انخلا کا معاملہ ایک ذیلی کام ہے اور اسے عراق کے سیاق و سباق میں پیش کیا

جائے گا۔ اتحادی چاہتے ہیں کہ عراق ہتھیار ڈال دیں لیکن انہیں مایوسی ہوگی۔ انہوں نے کہا وہ عالمی لیڈر جو عراق کی مخالفت کر رہے ہیں اپنے عوام سے غداری کے مرتکب ہیں۔ صدر صدام کی تقریر اس وقت نشر ہوئی جب عراقی وزیر خارجہ طارق عزیز ماسکو کیلئے روانہ ہو چکے تھے۔ بی بی سی نے بتایا کہ صدر صدام حسین نے واضح طور پر یہ نہیں بتایا کہ آیا وہ روسی منصوبہ قبول کرنے کیلئے تیار ہیں یا نہیں۔ صدر صدام حسین نے اپنی تقریر میں کسی مقام پر یہ نہیں کہا کہ وہ روسی منصوبے کو قبول کرتے ہیں یا مسترد کرتے ہیں لیکن انہوں نے جو کچھ کہا اس سے یہ نتیجہ ضرور اخذ کیا جا سکتا ہے کہ عراق اس مقام پر نہیں ہے جہاں وہ اتحادیوں کے سامنے ہتھیار رکھ دے گا اور کویت سے نکلنے کا اعلان کر دے گا۔ صدر صدام حسین نے دونوں طرح کی باتیں کی ہیں وہ جنگ کیلئے بھی تیار ہیں اور امن کی بات بھی کرتے ہیں صلح کا دروازہ ابھی بند نہیں کیا ہے۔ دیکھنا یہ ہے کہ کیا وہ زمینی جنگ کو ملتوی کرانے میں کامیاب رہے ہیں۔ صدر صدام نے اپنی تقریر میں کہا صبح دور نہیں اندھیر چھٹ کر رہے گا۔

اس تقریر میں عربوں اور ان لوگوں سے ہمدردی کے حصول کا انداز پایا جاتا تھا جنہیں انہوں نے انصاف پسند کہا انہوں نے بار بار کہا کہ "دیکھو ہم کتنی جرات سے بات کر رہے ہیں اور ہمارے مخالفین کتنے غلط ہیں جو ایسی دوغلی باتیں کر رہے ہیں" انہوں نے یہ بھی کہا امریکیوں نے عراقی کمان کونسل کا 15 فروری کا منصوبہ رد کرتے ہوئے کہا ہے کہ "جنگ جاری رہے گی" انہوں نے کہا اگر ایسا ہو تو ٹھیک ہے۔ اپنی تقریر کے شروع میں انہوں نے عرب عوام اور فلسطینیوں کا تفصیل سے ذکر کیا صدر حسنی مبارک کیلئے بڑے تلخ اور ترش الفاظ استعمال کئے اور کہا ان کے دل میں عراق کے بارے میں پرانا کینہ ہے۔ شاہ فہد کے بارے میں صدام نے کہا وہ حرمین شریفین کے غدار ہیں۔ انہوں نے کہا تیل کی دولت کمانے والے خلیج کے دوسرے امیری فلسطینیوں کا استحصال کرتے آئے ہیں۔ اور عربوں کے اصل مفادات کے مخالف ہیں۔ صدام حسین نے کہا ہم نے جدوجہد کی راہ پکڑی ہے اور اب کوئی اور راہ نہیں سوائے اس کے جو ہم نے منتخب کی ہے۔ ہمارے عوام اور ہماری مسلح افواج اس جدوجہد کو جاری رکھنے کا عزم رکھتی ہے وہ قربانیاں دینے کو تیار ہیں۔ انہوں نے کہا یہ ام المحارب

ہماری فتوحات اور ہماری شہادتوں کی جنگ ہے صدر صدام نے امریکہ اور اس کے حلیفوں کا للکارا اور کہا کہ بہت سے لوگوں کو ابھی تک ہماری افواج کی اصل صلاحیت کا علم نہیں۔ امریکی چاہتے ہیں کہ عراق کی زبان سے لفظ "اخراج" سن لیں اور کہتے ہیں کہ اگر ہم نے یہ نہ کیا تو وہ عراق کی اینٹ سے اینٹ بجا دیں گے لیکن میں آپ کو بتاتا ہوں کہ یہ بہت مایوس ہوں گے۔ صدر صدام حسین نے پوری تقریر میں کویت کا نام نہیں لیا بلکہ اسے عراق کا جنوبی علاقہ کہا یہ وہ اصلاح ہے جو عراقی ذرائع ابلاغ 2 اگست کے بعد سے استعمال کرتے آئے ہیں۔ صدر صدام نے کہا وہ مذاکرات کی امید اور کویت سے اخراج کیلئے تیار ہیں لیکن یہ ضمانت چاہتے ہیں کہ ان کی حکومت برقرار رہے۔ صدر صدام حسین کی پہلے کی تقریروں کے مقابلے میں جن میں لہجہ جارحانہ ہوتا تھا۔

26 فروری "اتحادی فوجیں تتر بتر ہو کر بھاگ اٹھیں" عراق کا دعویٰ

"8 گھنٹے کی خونریز جنگ کے بعد اب اتحادی فوجیں سینکڑوں ٹینک اور دوسرا سازو سامان چھوڑ کر پسپا ہو گئیں۔ پہلی بار عراقی فضائیہ نے بھی جنگ میں حصہ لیا"

کویت کے اندر اتحادیوں اور عراقی ٹینکوں کا ٹکراؤ توپ خانے کے حملوں میں شدت آگئی امریکی میرین فوج پر عرقی بکتر بند یونٹ کا زبردست جوابی حملہ

"چاروں محاذوں پر گھمسان کی لڑائی، عراق نے تیل کی خندقوں کو آگ لگا دی بہت سے مصری فوجی گرفتار کر لئے گئے اتحادی ہماری ایک انچ زمین بھی نہیں ہتھیا سکے"

اتحادی فوجیں مسلسل حملے کر رہی ہیں اور اپنے مقاصد میں کامیاب ہو رہی ہیں بڑی تعداد میں عراقی فوجی قید کر لئے گئے 200 ٹینک تباہ کر دئیے ہیں۔ جنرل نیل

نئی دہلی (مانیٹرنگ ڈیسک) عراقی فوج کے تازہ ترین اعلامے میں دعویٰ کیا گیا ہے کہ عراقی فوج نے کویت کا سارا علاقہ چھین کر اتحادی فوج کو واپس سعودی عرب میں دھکیل دیا۔ یہ وہ علاقہ تھا جس پر زمینی جنگ کے آغاز میں اتحادی افواج نے قبضہ کر لیا تھا۔ اعلامئے کے مطابق

اتحادی افواج 8 گھنٹے کی جنگ کے بعد پسپا ہو گئیں۔ جوابی حملے میں پہلی بار عراقی فضائیہ نے بھی حصہ لیا اور اتحادی افواج پر شدید بمباری کی دریں اثناء گذشتہ رات بغداد پر اتحادی فضائیہ کے حملے جاری رہے۔ ریڈیو پاکستان کے مطابق عراقی فوجی اعلامے میں دعویٰ کیا گیا اتحادی فوجیں تتر بتر ہو کر بھاگ رہی ہیں اور سینکڑوں ٹینک اور دیگر ساز و سامان پیچھے چھوڑ گئی ہیں۔ ریڈیو تہران کے مطابق بصرہ اور جنوب مشرقی شہروں پر ہوائی حملے جاری رہے جن میں پٹروکیمیکل تنصیبات سے اٹھنے والے دھوئیں نے ایرانی شہروں آبادان اور خرم شہر کو اپنی لپیٹ میں لے لیا۔ امریکی ہوابازوں نے الزام لگایا ہے کہ عراقی فوج اتحادیوں کی پیش قدمی روکنے کے لئے تیل سے بھری ہوئی خندقوں کو آگ لگا رہا ہے۔ ادھر امریکی فوج کے جنرل رچرڈ نیل نے اتوار کی شام کو سعودی عرب میں پہلی بار بریفنگ سے خطاب کیا جس میں انہوں نے بتایا کہ اتحادی فوجیں مسلسل حملے کر رہی ہیں اور انہیں اپنے مقاصد میں کامیابی حاصل ہو رہی ہے۔ انہوں نے اخبار نویسوں کو بتایا کہ اتحادی فوجیوں کو ہلکی سے لے کر درمیانہ حد تک مزاحمت کا سامنا کرنا پڑا ہے۔ وہ بڑی آسانی کے ساتھ اپنی کارروائی جاری رکھے ہوئے ہیں اور بڑی تعداد میں عراقی فوجیوں کو قیدی بنا رہے ہیں۔ اتحادیوں نے اب تک 200 عراقی ٹینک تباہ کر دیئے ہیں۔ اور یہ سلسلہ ابھی تک جاری ہے۔ انہوں نے ایک سوال کے جواب میں بتایا کہ امریکہ کا جانی نقصان بہت کم ہوا ہے اب تک صرف 4 امریکی فوجی ہلاک ہوئے اور 30 زخمی ہوئے ہیں۔ انہوں نے کہا کہ جوں جوں انہیں جنگ کے بارے میں مزید تفصیلات کا علم ہوتا گیا وہ اخبار نویسوں کو اس سے آگاہ کرتے رہیں گے۔ اس سے پہلے کی اطلاعات میں بتایا گیا تھا کہ اتحادی اور عراقی فوجوں کے درمیان چاروں محاذوں پر گھمسان کی لڑائی کی اطلاعات موصول ہو رہی ہیں۔ اتحادیوں کی طرف سے کویت اور عراق میں مسلسل پیش قدمی کا دعویٰ کیا گیا ہے جبکہ عراق نے دعویٰ کیا ہے کہ لڑائی میں حصہ لینے والے بہت سے مصری فوجیوں کو گرفتار کر لیا گیا ہے۔ تمام محاذوں پر شدید لڑائی جاری ہے جس میں عراقی فوج کا پلہ بھاری ہے۔ بغداد ریڈیو سے نشر کئے گئے ایک فوجی اعلان میں کہا گیا ہے کہ حملہ آور اپنے ہی خون میں نہا گئے ہیں اور اب مدد کیلئے فریاد کر رہے ہیں۔ فوجی اعلان میں امریکی ٹیلی

ویژن اور کویتی خبر ایجنسی کی ان اطلاعات کی تردید کی گئی ہے کہ اتحادی فوجوں نے فلاکہ جزیرے پر قبضہ کر لیا ہے۔ اس جزیرے سے کویت دارالحکومت کویت سٹی اور بندگاہ کا راستہ جاتا ہے۔ اعلان میں اس عزم کا اظہار کیا گیا کہ اتحادی ہماری ایک انچ زمین بھی نہیں ہتھیا سکتے۔ کویت میں سی این این کے نامہ نگار کی اطلاع کے مطابق تقریباً 80 عراقی ٹینک کویت کے جنوب کی طرف بڑھ رہے ہیں جہاں اتحادی فوج موجود ہے۔ ایک اور خبر کے مطابق عراق کویت میں تیل سے بھری خندقوں کو آگ لگا رہا ہے۔ کویت کے اندر دونوں طرف سے ایک دوسرے پر ٹینکوں سے حملے جاری ہیں اور وقت کے ساتھ ساتھ توپ خانوں کے حملوں میں شدت آتی جا رہی ہے۔ نامہ نگار نے بتایا کہ مسلسل حملوں کے باعث جانی نقصان کے بارے میں ابھی اندازہ لگانا مشکل ہے۔ بی بی سی کے مطابق عراق کے ایک بکتر بند یونٹ نے پیش قدمی کرتی ہوئی امریکی میرین فوج پر زبردست جوابی حملہ کیا۔ اتحادیوں نے اس جوابی حملے کا اعتراف کرتے ہوئے دعویٰ کیا کہ یہ عراقی حملہ پسپا کر دیا گیا۔ عراق نے اتحادیوں کے جنگی جہازوں پر بھی میزائلوں سے حملہ کیا تاہم برطانیہ کے میزائل شکن نظام کے ذریعے ان حملہ آور میزائلوں کو ناکارہ بنا دیا گیا۔ ایک اور اطلاع کے مطابق عراقی فوج کے ری پبلکن گارڈز کے دستے بھی کویت سٹی کی طرف بڑھ رہے ہیں۔ ادھر امریکی میرین کمانڈروں نے بتایا کہ کویت کی فضا میں انہیں کیمیاوی گیس کے آثار ملے ہیں جو ممکن ہے ریت میں ان بارودی سرنگوں سے خارج ہو رہی ہو۔ دریں اثناء امریکی ٹیلی ویژن سی این این پر پکڑے گئے عراقی فوجیوں کو دکھایا گیا جن کے ہاتھ رسیوں سے باندھے ہوئے تھے۔ لیکن یہ تعداد تیرہ چودہ سے زیادہ نہیں تھی۔ سی این این کے مطابق عراقی فوج نے صدام حسین کے حکم پر کویت میں بعض اہم عمارتوں کو توپوں سے تباہ کر دیا ہے۔ عراق کے 62 ویں فوجی اعلامیہ میں بتایا گیا کہ عراقی فوج کی تیسری کور نے اتوار کی رات کو حملہ آور اتحادی فوجوں پر زبردست جوابی حملہ کیا اور آٹھ گھنٹے کی خونریز لڑائی میں دشمن کو بھاری نقصان پہنچایا گیا اور ان تمام پوزیشنوں پر دوبارہ قبضہ کر لیا جن پر عراقیوں کا اتحادی حملے سے پہلے کنٹرول تھا۔ اعلامیہ میں دعویٰ کیا گیا ہے کہ عراق کے زبردست جوابی حملے کے بعد اتحادی فوجی اپنے ٹینک اور جلتی گاڑیاں چھوڑ کر

بھاگ نکلے۔

آل انڈیا ریڈیو نے خبردی کے تین سو ہیلی کاپٹروں نے دو ہزار سے زائد فوجی اور 80 گاڑیاں عراق میں 80 کلو میٹر اندر تک اتاری ہیں۔ اطلاعات کے مطابق اتحادی فوجیں جن میں امریکی میرین یونٹ بھی شامل ہے کویت شہر کے دروازے تک پہنچ گئے ہیں۔

بی بی سی کے مطابق فرانسیسی کمانڈر نے دعویٰ کیا ہے کہ ان کی فوجوں نے پوری ایک ڈویژن عراقی فوج کا صفایا کردیا ہے اور بیشتر فوجیوں کو جنگی قیدی بنالیا ہے ان کی پیش قدمی عراق کے اندر جاری ہے اور اب تک ان کے فوجی دستے 165 کلو میٹر تک عراق کے اندر جاچکے صدر صدام حسین کے خصوصی لڑاکا دستے ری پبلکن گارڈز اپنے مورچوں سے باہر نکل آئے ہیں اور اب وہ اتحادی فوجوں سے جنگ کیلئے ان کی طرف بڑھ رہے ہیں خلیج میں دو دن سے جاری زمینی جنگ میں امریکی طیاروں نے زمینی فوجوں کی امداد کیلئے 1300 حملے کئے اس کے دوران امریکہ کے 4 طیارے تباہ ہو گئے امریکی فوجی اعلامیہ میں بتایا گیا ہے کہ دو دن کی جنگ میں اب تک عراق کے 270 ٹینک تباہ کئے جاچکے ہیں اور ان کی تصدیق ہو گئی ہے جبکہ امریکی فوجیوں کا جانی نقصان نہ ہونے کے برابر ہے صرف 4 امریکی ہلاک اور 21 زخمی ہوئے یاد رہے کہ پہلے گیارہ امریکیوں کی ہلاکت اور 30 زخمی کی خبردی گئی تھی لیکن اب اسے غیر مصدقہ قرار دے کر نئے اعداد و شمار جاری کئے گئے ہیں۔

سعودی فوج کے کمانڈر جنرل خالد بن سلطان نے کہا ہے کہ اتحادی افواج کا حملہ کامیابی کے ساتھ جاری ہے جبکہ سعودی فوجی ترجمان نے کہا کہ اتحادی افواج بہت جلد کویت سٹی میں داخل ہو جائیں گی سعودی فوجی ترجمان نے کہا کہ کویت میں ظلم و ستم اور ہلاکتوں کے ذمہ دار عناصر سے جنگی مجرم کی طرح نمٹا جائے گا۔

سعودی کمانڈر نے کہ کہ کویت شہر میں صورت حال بہت خطرناک ہے سینکڑوں کویتی باشندوں کو اذیتیں دیکر ہلاک کیا گیا ہے امریکی بحریہ کے دو ڈویژنوں اور اس کے ساتھ کویتی سعودی [illegible] ی اور برطانیہ کے فوجی کویتی علاقے کے بہت اہم حصہ تک پہنچ گئے ہیں اور عراقی فوجیوں پر غلبہ حاصل کرلیا ہے۔

"امریکیو! صدر بش سے پوچھو، اتحادی فوجوں کا کیا حشر ہوا، کتنے مارے گئے"۔

بغداد ریڈیو

بغداد (سی این این) بغداد ریڈیو نے اپنے ایک تازہ بیان میں امریکہ کے اس دعوے کو غلط قرار دیا ہے کہ عراقی فوجیوں کی ایک بڑی تعداد کو گرفتار کر کے جنگی قیدی بنالیا گیا ہے۔ ریڈیو نے کہا ہے کہ امریکہ اپنے اس دعوے کا ثبوت پیش کرے۔ ادھر امریکی محکمہ دفاع پشاگون کے ذرائع نے دعویٰ کیا ہے کہ چودہ ہزار عراقی پکڑ لئے گئے ہیں جبکہ سعودی عرب میں اتحادی فوج کے ذرائع نے یہ تعداد بیس ہزار بتائی ہے۔ عراق کے فوجی اعلامیہ میں امریکی عوام سے کہا گیا ہے کہ وہ صدر بش سے پوچھیں کہ اتحادی فوجوں کا کیا حشر ہوا انہیں کتنا جانی نقصان پہنچا، وہ اپنے صدر سے کہیں کہ وہ جھوٹ کی بجائے سچ بولیں۔

امام حسینؓ اور غوث الاعظمؒ کے سپاہی صحرائے عرب کو حملہ آوروں کا قبرستان بنا دیں گے

عراق کے بہادر مسلمان اور فوجی صلیبی حملے کا مقابلہ کر رہے ہیں، وہ فتحیاب ہوں گے۔ عراقی سفاتخانہ

اسلام آباد (نیشن رپورٹ) عراقی سفارت خانے کے ایک بیان میں کہا گیا ہے کہ امام حسینؓ اور غوث الاعظمؒ سید عبد القادر جیلانی کے سپاہی اور فوجیں فتحیاب ہوں گی اور صحرائے عرب کو ان کئی خداؤں کو ماننے والے حملہ آوروں کے قبرستان میں تبدیل کر دیں گی۔ اللہ سب سے بڑا ہے، عزت عربوں اور مسلمانوں کا اور ذلت عربوں اور مسلمانوں کے غداروں کا مقدر ہے۔ بیان میں کہا گیا ہے کہ عراق کے بہادر مسلمان فوجی اسلام کے اصولوں پر پختہ یقین رکھتے ہیں اس صلیبی حملے کا مقابلہ کر رہے ہیں۔ جو یہودیوں اور سامراجیوں نے کیا ہے۔ وہ بہادری سے لڑ رہے ہیں تاکہ عربوں اور مسلمانوں کی سرزمین کا دفاع کر سکیں۔ اور ان کی عزت برقرار رکھ سکیں، عراقی سفارت خانے کے بیان میں اس بات پر افسوس کا اظہار کیا گیا ہے کہ ایک ایسے وقت میں جب سلامتی کونسل روسی منصوبے پر غور کر رہی تھی، عراق کی فوجی طاقت اس کے سائنسی اور اقتصادی اداروں کو تباہ کرنے اور مسلمانوں کے قتل عام کے

لئے اچانک بھرپور حملہ کر دیا گیا۔

سینکڑوں مصری فوجی عراقیوں سے مل گئے

ہمیں یہودیوں کے مفادات کے لئے مسلمانوں سے لڑنے پر مجبور کیا گیا۔ فوجیوں کے بغداد ریڈیو پر انٹرویو

صحافیوں کو فلاکہ لے جائیں ہم لیجانے کے لئے تیار ہیں۔ عراقی سفارت خانہ

اسلام آباد (نیشن رپورٹ) اسلام آباد میں عراقی سفارت خانے کے ایک ترجمان نے دعویٰ کیا ہے کہ سینکڑوں مصری سپاہی ہتھیار پھینک کر عراقی فوج سے آکر مل گئے ہیں۔ عراقی سفارت خانے نے کہا کہ امریکہ اور اس کے اتحادیوں کو آزاد نامہ نگاروں کو جزیرہ پر لیجانا چاہئے تب اس کے دعوے کی حقیقت معلوم ہو جائے گی۔ عراق کسی بھی آزاد صحافی کو اس جزیرے میں بھیجنے کو تیار ہے۔ انہوں نے کہا کہ ریڈیو بغداد نے ان مصری سپاہیوں کے انٹرویو نشر کئے ہیں جنہوں نے عراقی فوج کے سامنے ہتھیار ڈال دیئے ہیں۔ ترجمان نے کہا کہ مصری فوجی یہودیوں کے مفادات کے تحفظ کی خاطر مسلمانوں کے خلاف لڑنے پر مجبور کر دیئے جانے پر سخت شرمندہ تھے۔

27 فروری صدر صدام حسین کے حکم پر عراقی فوج نے کویت خالی کر دیا

بغداد (مانیٹرنگ ڈیسک) کل صبح صدر صدام نے اچانک کویت سے اپنی فوجیں واپس بلانے کا اعلان کر دیا۔ ریڈیو پر قوم سے خطاب کرتے ہوئے انہوں نے کہا کہ کویت سے عراق کا انخلاء رات تک مکمل ہو جائے گا۔ عراق کے صدر صدام حسین نے کہا کہ ہماری بہادر قوم اور فوج نے کئی ماہ تک 30 ملکوں کے خلاف اپنے ملک کا دفاع کیا ہے۔ انہوں نے کہا کہ یہ بڑا مشکل وقت تھا لیکن میں خراج تحسین پیش کرتا ہوں اپنے بہادر فوجیوں اور عراقی عوام کو جنہوں نے بغیر کسی خوف و خطر کے قربانیاں دیں اور ایک عظیم جہاد میں حصہ لیا۔ منگل کو ریڈیو پر قوم سے خطاب کرتے ہوئے انہوں نے کہا کہ اے بہادر عراقیو! یہ حق اور باطل کی جنگ تھی جس میں ہم فتح یاب ہوئے۔ صدر صدام حسین نے بار بار کہا کہ ہم "جیت چکے ہیں" "عراقی قوم جیت چکی ہے" انہوں نے کہا کہ کویت سے انخلا کا عمل شروع ہو چکا ہے تاہم انہوں نے

خبردار کیا کہ عراق کے خلاف جارحیت جاری رہی تو اس کا سختی سے جواب دیا جائے گا۔ صدر صدام حسین نے کہا کہ عراق ایک عظیم ملک ہے اور اس کے لوگ بھی عظیم ہیں۔ عراقی صدر نے کہا کہ ہمارا اس خدا کی ذات پر یقین ہے اور یہ خدا کی منشا ہے کہ ہم نے انخلاء کا فیصلہ کیا ہے بصورت دیگر ہماری جدوجہد طویل عرصے تک جاری رہتی۔ تقریر کے دوران انہوں نے ان مصائب کا ذکر کیا جو عراق کو گذشتہ کئی مہینوں سے اٹھانے پڑ رہے ہیں۔ انہوں نے کہا کہ خدا کا فضل ہے کہ ہماری قوم ہر آزمائش پر بخوبی پوری اتری ہے۔ انہوں نے کہا کہ ہماری جدوجہد جائز تھی جو کہ اچھائی اور برائی کے درمیان تھی۔ عراقی صدر نے کہا کہ اے بہادر عراقیو! ہماری عظیم جدوجہد اور جہاد کوئی نہیں بھول سکتا جو ایک عظیم مقصد کے لئے تھی۔ اس عظیم مقصد کے لئے عراقی بہادری سے لڑے کیونکہ ہماری جنگ اصولوں کی جنگ تھی۔ صدر صدام حسین نے کہا کہ عراقی قوم عرب میں ایک ممتاز مقام رکھتی ہے اور عرب قوم کے لئے ایک مثال کی حیثیت رکھتی ہے۔ انہوں نے کہا کہ فلسطین کا مسئلہ حل کرنے کے لئے ہماری جدوجہد جاری رہے گی اور کویت سے انخلاء کے بعد بھی عراق اتحادیوں کی طرف سے کسی بھی جارحیت کا مقابلہ کرنے کے لئے تیار رہے گا۔ صدر صدام حسین نے کہا کہ کویت زیادہ عرصے تک عراق کا انیسواں صوبہ نہیں رہ سکا تاہم ہم عراقی قوم "جنگوں کی ماں" جیت چکی ہے۔ انہوں نے کہا کہ کویت میں عراقی فوج داخل ہونے کے بعد ہم سازشوں کا شکار بنے ہیں تاہم خدا نے عظیم عراقی قوم کی مدد کی اور ہم شیطانی اتحاد کے مقابلے میں فتح سے ہمکنار ہوئے ہیں۔ صدر صدام نے کہا عراقیو! اپنی فتح کی خوشی مناؤ۔ ہم نے 30 ملکوں کے اتحاد اور اس بدی کا مقابلہ کیا ہے جو وہ یہاں لے کر آئے تم نے پوری دنیا کا مقابلہ کیا ہے تم بین الاقوامی اقتصادی پابندیوں اور بعد میں فوجی کارروائی کے سامنے چھ ماہ تک ڈٹے رہے ہو۔ صدر صدام نے کہا امریکہ کے دھوکہ باز صدر کی قیادت میں کثیر القومی اتحاد پر الزام لگایا کہ انہوں نے پہلے سے طے شدہ منصوبے کے مطابق عراق عرب قوم اور اسلامی دنیا کے خلاف جارحیت کا ارتکاب کیا۔ انہوں نے عراقی عوام سے کہا خدا بدی کو مٹا دے گا تم جیت چکے ہو تم نے بھی صحیح راستہ اختیار کیا لیکن بدی کی طاقتیں اپنے موقف پر اڑی رہیں۔ ان کا خیال تھا

کہ وہ عراق پر اپنی مرضی ٹھونس لیں گی۔ عراقی صدر نے مزید کہا کہ دشمن کویت خالی کرنے کے بعد بھی ہمارے خلاف اپنی جارحیت جاری رکھیں گے۔ اس لئے ہمیں مکمل طور پر لڑائی کے لئے تیار رہنا چاہئے۔ تقریر کے اختتام کے قریب ہوائی حملے کے سائرن بج اٹھے اور نشریات مدھم ہو گئیں۔

کویت میں عراق کی ساری فوج موت کے محاصرے میں پھنس کر رہ گئی

بغداد (رائٹر) عراق نے کہا ہے کہ اتحادی پیچھے ہٹتی ہوئے عراقی فوجوں پر حملے کر رہے ہیں لیکن کویت سے فوجی واپسی جاری رہے گی ایک فوجی ترجمان نے ریڈیو بغداد پر کہا کہ اتحادی ٹینک اور طیارے واپس جاتی ہوئی فوجوں پر حملے کر رہے ہیں ترجمان نے اس عمل کو "بزدلانہ" قرار دیا اس سے پہلے ایک اعلان میں کہا گیا تھا کہ جب تک عراقی فوجوں کے منظم طریقے سے واپس جانے کا انتظام نہیں کیا جاتا وہ لڑائی جاری رکھیں گی دریں اثنا مغربی فوجی ذرائع نے کہا کہ اتحادی فوجوں نے جو عراق میں بہت دور تک اندر جا چکی ہیں جنگی زون میں موجود عراقی فوجیوں کے بچ نکلنے کے راستے پر کنٹرول حاصل کر رکھا ہے۔ امریکی فوج کی 18 ویں کور کے چھاتہ بردار جنگجو اور ہیلی کاپٹر سوار دستے جنہیں ٹینک شکن ہیلی کاپٹروں اور جنگی طیاروں کی مدد حاصل ہے عراق میں اتنا اندر گھس چکے ہیں کہ انہوں نے کویت میں عراقی فوج اور جنوبی عراق میں ری پبلکن گارڈز کو عراق کے دوسرے علاقوں سے کاٹ دیا ہے۔ بصرہ کے تمام پل اور دریائے فرات کے بیشتر پل پہلے ہی اتحادی طیاروں کی اندھا دھند بمباری کے سبب تباہ ہو چکے ہیں جس کے نتیجے میں عراقی فوج کے لئے شمال مغرب کی طرف پیچھے ہٹنا ناممکن ہو گیا ہے بچ نکلنے کے راستے نہ ہونے کے برابر رہ گئے ہیں شمال کی طرف سارے پل تباہ ہو چکے ہیں جونہی عراقی دستے اپنے مورچوں سے باہر آئیں گے وہ اتحادیوں کے لئے آسان شکار بن جائیں گے شمال میں امریکی یونٹ، ہیلی کاپٹروں، طیاروں اور توپوں سے زبردست گولہ باری کر رہے ہیں جس کے نتیجے میں عرقی فوج پھنس کر رہ گئی ہے۔

عراق کی بہترین فوج کا قتل عام شروع ہو گیا

نکوسیا (رائٹر/مانیٹرنگ ڈیسک) امریکی فوج جنوبی عراق کے ریگستان میں گھری ہوئی عراق کی

بہترین فوج ری پبلکن گارڈ کو نیست و نابود کرنے میں لگی ہوئی ہے گارڈز کے ٹینک ڈویژنوں پر تین طرف سے گولہ باری ہو رہی ہے سعودی عرب میں امریکہ فوجی ذرائع کے مطابق اتحادیوں نے مکمل فضائی برتری اور زمین پر بہتر توپ خانے کے ذریعے ری پبلکن گارڈز کے توپخانہ ڈویژن کے پرخچے اڑا دیئے ہیں۔ حمورابی ڈویژن مقابلہ کر رہا ہے جبکہ مدینہ ڈویژن بچ نکلنے کی کوشش میں ہے ایک سینئر امریکی افسر نے کہا ہے کہ ہم کباڑ خانے کے بھوکے کتے کی طرح ان پر لپک اور جھپٹ رہے ہیں۔ پینٹاگون کے ایک ترجمان نے کہا ہے کہ وہ ری پبلکن کو برباد کئے بغیر نہیں چھوڑیں گے۔ امریکی ٹینکوں کے دستے جنگ ختم ہونے سے پہلے صدر صدام کی مسلح افواج کی کمر توڑنے پر تلے ہوئے ہیں۔ امریکی فوجی ذرائع کا کہنا ہے کی دو روز کی شدید جنگ کے بعد ری پبلکن گارڈ کے ایک بکتر بند ڈویژن کو تباہ و برباد کر دیا گیا ہے۔ اتحادی ذرائع کے مطابق گھبرائے ہوئے عراقی فوجیوں کے ہجوموں نے کویت سے بصرہ جانے والی بڑی شاہراہ بلاک کر رکھی ہے۔ دنیائے عرب کی سب سے طاقتور فوج کا نصف حصہ یعنی 5 لاکھ فوجی کویت اور جنوبی عراق میں گھر گئے ہیں اتحادی بکتر بند دستے اور طیارے عراق کی آخری دفاعی لائن ری پبلکن گارڈز کو بڑے منظم طریقے سے تباہ کر رہے ہیں۔ اس لڑائی میں 5 سو امریکی ٹینک حصہ لے رہے ہیں۔ 8 ڈویژنوں پر مشتمل ری پبلکن گارڈز کی کل تعداد ایک لاکھ پچاس ہزار ہے۔ دریں اثناء عراق نے الزام لگایا ہے اتحادی فوجیں واپس آتی ہوئی عراقی فوجوں پر بزدلانہ حملے کر کے ان کے راستے میں رکاوٹ ڈال رہی ہیں۔ عراق کے ایک فوجی ترجمان نے کہا ہے میدان جنگ میں خراب موسم کے باوجود دشمن کی فضائیہ واپس جاتی ہوئی عراقی فوج پر حملے کر رہی ہے اور اتحادی ٹینک عراقی فوجی دستوں کا راستہ روک رہے ہیں۔ ترجمان نے یہ بھی کہا کہ اس بزدلانہ کارروائی کی قیمت انہیں چکانی پڑے گی جو اس علاقے میں پیچھے رہ جائیں گے۔ ایک اطلاع کے مطابق ری پبلکن گارڈز ابھی سخت مزاحمت کر رہے ہیں صحرا میں شدید بارش کے سبب دلدل نے فرانسیسی فوج کا راستہ روک رکھا ہے اور کچھ نظر بھی نہیں آتا۔ فرانسیسی چیف آف سٹاف نے بتایا کہ ری پبلکن گارڈز کے دو ڈویژن حسور کی پسپائی اختیار کر رہے ہیں اور بقیہ تین ڈویژن امریکہ کی ساتویں کور اور برطانیہ

کے آرمرڈویژن کا مقابلہ کر رہے ہیں۔ فرانسیسی چیف آف سٹاف نے بتایا کہ عراقی فوج کی فضائی قوت نہ ہونے سے ہوئی جس کے نتیجے میں اتحادی طیاروں کو ہفتوں عراقی فوجوں بمباری کا کرنے کا موقع مل گیا ہے اور ان کے حوصلے پست ہو گئے ہیں۔

27 فروری۔ عراق تمام شرائط مان گیا

امریکہ نے پیشکش مسترد کردی

پیشکش ناکافی ہے ، برطانیہ ، سلامتی کونسل کے ارکان نے بھی قرار دادیں تسلیم کرنے کو ناکافی قرار دیدیا

واشنگٹن (مانیٹرنگ ڈیسک ،ڈپ ا ،اف پ) عراق نے اقوام کی خلیج کے بحران پر اقوام متحدہ سلامتی کونسل کی تمام بارہ قرار دادوں کو تسلیم کرنے کا اعلان کر دیا ہے۔ جبکہ امریکہ نے عراق کی اس پیشکش کو یہ کہتے ہوئے مسترد کر دیا ہے کہ جنگ کے خاتمے کے لئے جن شرائط کی ضرورت ہے یہ اس سے بہت کم ہے صدر بش کا کہنا ہے کہ جنگ کو اس کے اختتام پر لے جایا جائے گا اور وائٹ ہاؤس کے ایک ترجمان نے عراق کے فوجی ڈھانچے کی مکمل تباہی تک جنگ جاری رکھنے کا اعلان کیا ہے۔ سلامتی کونسل کے ارکان نے بھی عراقی پیشکش کا ناکافی قرار دیتے ہوئے مسترد کر دیا ہے۔ ریڈیو کے مطابق صدر بش نے مشرقی یورپ کے بارے میں کانفرنس کے افتتاح کے موقع پر بے حد خوش اور ہشاش بشاش نظر آرہے تھے۔ انہوں نے کہا خلیج سے دل خوش کرنے والی خبریں آرہی ہیں تمام امریکیوں کو کویت شہر کی آزادی پر خوشی ہوئی ہے اور پورے کویت کی آزادی قریب قریب مکمل ہو گئی ہے۔ بش نے کہا جنگ کو اس کے اختتام تک لیجایا جائے گا۔ بش نے عراق کی جانب سے تازہ پیش کش کو مسترد کر دیا ہے انہوں نے کہا ہے کہ عراق کی جانب سے تازہ پیش کش بھی اتحادیوں کے مطالبات پر پوری نہیں اترتی۔ انہوں نے کہا کہ عراق سلامی کونسل کی تمام قرار دادیں کسی قسم کی شرط کے بغیر قبول کرلیں۔ اس سے پہلے جنگ بندی پر غور نہیں ہو سکتا۔ انہوں نے اعلان کیا کہ جنگ جاری رہے گی۔ وائٹ ہاؤس کے ترجمان نے بھی کہا کہ تمام قرار دادوں کے ساتھ ساتھ عراق کو اتحادیوں کی شرائط بھی تسلیم کرنا ہو گی۔ ترجمان نے کہا کہ ضروری نہیں کہ جنگ کو

ے عراقی فوجوں کی واپسی پر ختم ہو۔ اقوام متحدہ کی قرار دادوں میں اس علاقہ کے استحکام کا مطالبہ کیا گیا ہے اور اتحادی اس وقت تک عراق کے فوجی ڈھانچے کو کم کرنے کی کوشش کرتے رہیں گے جب تک یہ مقصد پوری طرح حاصل نہیں ہو جاتا یہ جنگ اس وقت تک جاری رہے گی جب تک عراقی فوج لڑائی کے قابل ہے۔ سی این این کے مطابق نیو یارک میں سلامتی کونسل کے ارکان نے نجی صلاح مشورے کے بعد عراقی وزیر خارجہ کی جانب سے اقوام متحدہ کے سیکرٹری جنرل کو یئار کے نام مراسلہ میں تمام قرار دادوں کو تسلیم کرنے پر آمادگی کے اظہار کو جنگ بندی کے لئے ناکافی قرار دے کر مسترد کر دیا ہے۔ سلامتی کونسل کے ارکان نے کہا ہے عراق نے 3 قرار دادوں کو جو عراق کے خلاف اقتصادی پابندیوں سے متعلق ہیں۔ ختم کئے جانے کی شرط کے ساتھ سلامتی کونسل کی باقی تمام قرار دادیں منظور کرنے پر آمادگی ظاہر کی ہے یہ شرط ارکان کے لیے ناقابل قبول ہے۔ برطانوی حکومت نے بھی عراق کی جانب سے جنگ بندی کے عوض تاوان جنگ کی ادائیگی اور جنگی قیدیوں کی رہائی سے متعلقہ پیش کش کو ناکافی قرار دیتے ہوئے کہا کہ عراق کے خلاف اقوام متحدہ کی عائد کردہ پابندیاں یکطرفہ طور پر نہیں اٹھائی جاسکتیں۔ اس سے پہلے عراق نے اعلان کیا تھا کہ وہ جنگ بند کرنے کی صورت میں تاوان جنگ ادا کرنے پر غور کے لئے تیار ہے اور جنگی قیدی بھی رہا کردے گا۔ اقوام متحدہ میں عراقی سفیر نے بھی کہا کہ سلامتی کونسل جنگ بندی کا اعلان کردے تو ہم اس کی تمام قرار دادیں قبول کرلیں گے۔

بغداد ریڈیو نے اعلان کیا ہے کہ عراق نے کویت پر اپنا دعویٰ ترک کرنے پر اتفاق کیا ہے اور جنگ بندی کے عوض جنگ کے تاوان پر غور کرنے کے لئے راضی ہے۔ بغداد ریڈیو کے مطابق اگر اقوام متحدہ جنگ بندی کا انتظام کرے جس کے نتیجہ میں تمام فوجی کارروائی بند ہو جائے تو عراق جنگی قیدیوں کی رہائی کے لئے تیار ہو گا۔ عراق اقوام متحدہ سے کہے گا کہ اس پر اب ان تین قرار دادوں کا اطلاق نہیں ہونا چاہئے جو عراق کے خلاف اقتصادی پابندیوں کے بارے میں منظور کی گئی تھیں عراق کی یہ پیشکش وزیر خارجہ طارق عزیز نے بغداد میں روسی سفارت خانے کے ذریعے اقوام متحدہ کے سیکرٹری جنرل پیرز ڈی کوئیار کے نام مراسلہ میں کی

ہے۔ اقوام متحدہ میں عراق کے مندوب ڈاکٹر عنبری نے اس پیشکش کی تعریف کردی ہے۔ بی بی سی کے مطابق عراقی مندوب نے کہا ہے کہ انہوں نے سلامتی کونسل کے صدر سے ملاقات کے لئے کہا ہے تاکہ اعلیٰ سطح پر عراقی حکومت کے اس فیصلہ سے مطلع کیا جاسکے کہ عراق نے سلامتی کونسل کی تمام قرار دادوں کو تسلیم کرنے کا فیصلہ کیا ہے۔ ان میں سے بعض پر عمل ہو چکا ہے اور بعض پر عمل در آمد باقی ہے۔ ہم نے کویت سے اپنی واپسی مکمل کرلی ہے۔ اور بدھ کی صبح کویت سے آخری عراقی فوجی واپس چلا گیا۔ اگر سلامتی کونسل جنگ بندی کی قرارداد منظور کرلے تو دوسری قرار دادوں پر بھی عمل در آمد ہو سکتا ہے۔ واشنگٹن سے موصولہ رپورٹ کے مطابق ابھی امریکی حکومت نے عراق کے اس فیصلہ کی خبر پر کوئی فوری ردعمل ظاہر نہیں کیا۔

اتحادی چھاتہ فوج بصرا کے قریب نصیریا میں اتر گئی

اتحادی فوجیں اور ٹینک پیش قدمی کرتے ہوئے دریائے فرات تک پہنچ گئے: عراق نے پیش قدمی کی تصدیق کردی

نصیریہ شہر پر قبضہ کرکے عراقی فوج کا راستہ کاٹ دیا جائے گا: عراقی عوام اور فوج بے جگری سے مقابلہ کررہے ہیں: بغداد ریڈیو

(بغداد رائٹر) عراق کے اندر اتحادی فوجوں کی پیش قدمی جاری ہے ان فوجوں کو ٹینکوں کی مدد حاصل ہے اور یہ دریائے فرات تک پہنچ چکی ہیں عراق کے ایک فوجی اعلامیہ میں اتحادی فوجوں کی پیش قدمی کی تصدیق کی گئی ہے اور بتایا گیا کہ دشمن نے نصیریہ شہر کے نزدیک اپنے چھاتہ بردار فوجی بھی اتار دئے ہیں یہ فوجی عراقی ہوائی اڈے کے نزدیک اتارے گئے عراق کے فوجی اعلان کے مطابق عوام اور فوج دشمن کے دستوں کا بڑی بے جگری سے مقابلہ کررہے ہیں دریائے فرات کے کنارے آباد نصیریہ شہرانتہائی فوجی اہمیت کا حامل ہے یہ شہر بصرہ کے شمال میں واقع ہے اس کی زبردست فوجی اہمیت کے باعث اتحادی فضائیہ بار بار اس پر بمباری کررہی ہے تاکہ ان پلوں کو تباہ کردیا جائے جو بغداد جانے والی بڑی سڑک کو شمالی عراق سے ملاتے ہیں مبصرین کے مطابق نصیریہ شہر پر قبضے سے کویت سے نکلنے والی عراقی فوج کا بڑا راستہ

کاٹ دیا جائے گا۔

آئے اب حقائق پر نظر رکھنے والے دو دانشوروں کے خیالات سے بھی مستفید ہوں اور دیکھیں کی جب بڑے بڑے جغادری، دانشور، سیاستدان اور جرنیل غلط اندازے لگا کر حالات کی عجیب و غریب تصویر پیش کر رہے تھے تب ان لوگوں کی سوچ کیا تھی۔

7 فروری 91ء کے روزنامہ نوائے وقت میں "خلیج کی تباہ کن جنگ دو اہم سوالات" کے عنوان سے جناب ابوذر غفاری نے لکھا ہے۔

امریکہ نے اپنے اتحادیوں سمیت عراق پر غیر معمولی بمباری کرنے کا جو عمل 17 جنوری 1991ء سے شروع کیا ہوا ہے اس نے ہر مسلمان کو تڑپا کر رکھ دیا ہے۔ مسلمان سمجھتے ہیں کہ اتحادیوں کی یہ قیامت خیز بمباری عراق کو کویت سے نکالنے کیلئے نہیں بلکہ اسے ہر لحاظ سے تباہ کرنے کی غرض سے کی جارہی ہے تاکہ مشرق وسطیٰ میں امریکہ کے غنڈے اسرائیل کے واسطے کوئی خطرہ باقی نہ رہے۔ اس کے ساتھ ہی مسلمانوں کو یہ یقین ہے کہ عراق کی تباہی کے بعد ایران اور پاکستان دونوں کو فوجی اور اقتصادی لحاظ سے کمزور کیا جائے گا تاکہ اسرائیل کو اس علاقے میں من مانی کارروائیاں کرنے کا موقع مل جائے۔ یہی وجہ ہے کہ ہر مسلمان کی یہ دلی خواہش اور دعا ہے کہ یہ جنگ فوری طور پر ختم ہو جائے۔ مصری صدر حسنی مبارک اور روسی صدر گورباچوف کئی بار صدام حسین سے یہ درخواست کرچکے ہیں کہ اگر وہ صرف ایک مرتبہ کویت سے نکلنے کا اشارہ دے دیں تو پھر جنگ بند کروانا ان کی ذمہ داری ہوگی۔ لیکن صدر صدام حسین ڈٹے ہوئے ہیں اور کسی حالت میں بھی کویت سے نکلنے کیلئے تیار نہیں۔

اب یہ ایک حقیقت ہے کہ عالم اسلام کی تو یہ خواہش اور کوشش ہے کہ جنگ فوری طور پر ختم ہو جائے تاکہ عراق تباہی سے بچ جائے لیکن صدر صدام حسین کا منصوبہ یہ ہے کہ اس جنگ کو زیادہ سے زیادہ طول دیکر زیادہ زیادہ امریکیوں کو مارا اور زخمی کیا جائے تاکہ امریکی رائے عامہ اپنے صدر کے خلاف اٹھ کھڑی ہو۔ اس کے ساتھ ہی وہ چاہتے ہیں کہ اسرائیل کو جنگ میں کھینچ لیا جائے گا تو پھر پورا عالم اسلام عراق کی پشت پر ہوگا اور پاکستان سے لیکر مصر تک کے اسلامی ممالک عراقیوں کی مدد کرنے پر مجبور ہو سکتے ہیں۔

یہاں دو سوالات ذہن میں اٹھتے ہیں۔ پہلا سوال یہ ہے کہ کیا صدر صدام حسین خلیج جنگ کو امریکہ کیلئے دوسرا ویٹ نام بنا سکتے ہیں۔ اور دوسرا سوال یہ ہے کہ کیا وہ اسرائیل کو جنگ میں ملوث کر سکیں گے۔ پہلے سوال کا جواب معلوم کرنے کیلئے ہمیں ویٹ نام کی جنگ کا جائزہ لینا ہو گا۔ ویٹ نام کی جنگ درحقیقت سرمایہ دارانہ نظام اور کیمونزم کے درمیان جنگ تھی۔ دوسری جنگ عظیم کے بعد امریکہ اور روس کے مابین جس سرد جنگ کا آغاز ہوا تھا وہ ویٹ نام میں اپنے عروج پر پہنچ گئی تھی۔ چین تو 1950ء کے عشرے کے اوائل سے ہی شمالی ویٹ نام کی مدد کر کے اسے جنوبی ویٹ نام پر قبضہ کرنے کیلئے تیار کر رہا تھا۔ ہزارہا چینی ماہرین شمالی ویٹنام میں سرگرم عمل تھے جبکہ شمالی ویٹنامی آہستہ آہستہ بڑے منظم طریقے سے جنوبی ویٹنام کے اندر سرنگوں کا جال بچھایا جا رہا تھا۔ کئی سرنگیں تو سینکڑوں کلو میٹر لمبی تھیں۔ دیہاتوں میں گوریلا مراکز قائم کئے جا رہے تھے اور شہروں میں دہشت گرد تیار ہو رہے تھے۔ 1961ء میں جب کیمونسٹوں کی جنوبی ویٹ نام میں سرگرمیاں بہت بڑھ گئیں تو امریکہ نے وہاں اپنے مشیر بھیجنے کا سلسلہ شروع کیا۔ اس طرح امریکہ آہستہ آہستہ ویٹ نام میں ملوث ہونے لگا۔

1964ء میں جب امریکہ کے ساتھ مفاہمت کی پالیسی اپنانے کے داعی خروشیف کو برطرف کر کے روسی فوج اور نوکر شاہی نے روس میں اقتدار سنبھال لیا تو شمالی ویٹ نام کو روسی امداد وسیع پیمانے پر دی جانے لگی۔ شمالی ویٹ نام کی افواج تیزی سے روس کے جدید ترین ہتھیاروں سے لیس ہونے لگیں۔ 1965ء میں جب امریکہ نے ویٹ نام میں اپنے فوجی بھیج کر حالات کو کنٹرول میں لانا چاہا تو اس کی شمالی ویٹ نام کی بحریہ اور فضائیہ سے جھڑپیں ہونے لگیں۔ امریکہ آہستہ آہستہ ویٹ نام میں اپنی افواج کو بڑھاتا رہا اور 1969ء میں ان کی تعداد پانچ لاکھ افراد تک جا پہنچی۔ اسی دوران امریکی مرتے اور زخمی ہوتے رہے۔ جب یہ لاشیں امریکہ پہنچتیں تو وہاں پر سوال کیا جاتا کہ آخر کار اس جنگ سے امریکہ کی عوام کا کیا تعلق ہے۔ اس وقت ہر نوجوان امریکی کو جبری طور پر دو سال کیلئے فوج میں کام کرنا ہوتا تھا۔ ویٹ نام کی جنگ میں جبراً بھیجے جانے کے خوف سے امریکی نوجوان امریکی حکومت کے خلاف

اٹھ کھڑے ہوئے۔ آخر کار امریکی حکومت کو عوام کے سامنے جھکنا پڑا اور 1975ء میں امریکہ ذلیل و خوار ہو کر ویٹ نام سے بھاگ آیا۔ اس جنگ میں امریکہ کے ساٹھ ہزار کے لگ بھگ نوجوان موت کا شکار ہوئے۔

اس جنگ کے دوران امریکی فوج کا سب سے بڑا مسئلہ یہ تھا کہ دشمن کہاں ہے۔ جیسا کہ بتایا گیا ہے کیمونسٹوں نے زمین کے اندر سینکڑوں میل لمبی سرنگیں کھودی ہوئی تھی۔ درحقیقت انہوں نے زیر زمین شہر بسائے ہوئے تھے۔ انہیں معلوم تھا کہ مغربی ممالک کا واحد موثر ہتھیار فضائیہ ہے۔ اسی لئے وہ اس سے بچنے کیلئے زیر زمین چلے گئے تھے۔ امریکہ کیلئے ان سرنگوں کا پتہ لگانا ایک انتہائی مشکل کام تھا۔ ویٹ نامی ان سرنگوں سے نکل کر اچانک امریکی فوج پر حملہ آور ہونے کے بعد پھر ان میں غائب ہو جاتے۔ امریکہ ان کو دس برسوں تک تلاش کرتا ہوا ہلکان ہو گیا۔ اس کے علاوہ امریکہ کا بڑا دشمن ویٹ نام کے گھنے جنگلات تھے۔ ان جنگلات نے امریکی فضائیہ کو غیر موثر بنا کر رکھ دیا تھا۔ امریکہ ان جنگلات کے خاتمے کے لئے کیمیاوی مادہ استعمال کرتا رہا لیکن وہ قدرت کے عمل کو نہ روک سکا۔ شمالی ویٹ نامی درختوں کی پناہ میں اپنے ساتھیوں تک سامان جنگ اور خوراک پہنچاتے رہے۔ اسی دوران چین اور روس دونوں شمالی ویٹ کی بھرپور اقتصادی اور فوجی امداد کرتے رہے۔ ہزارہا روسی اور چینی فوجی ماہرین شمالی ویٹ نامیوں کے شانہ بشانہ لڑتے رہے۔

ویٹ نام کی جنگ نے امریکہ کو فوجی اور اقتصادی لحاظ سے بہت کمزور کر دیا۔ امریکہ والوں نے توبہ کی کہ وہ آئندہ کبھی کسی صورت میں بھی دوسرے ممالک کے معاملات میں مداخلت نہیں کریں گے۔ تاہم امریکی افواج اس جنگ کے دوران نئے ہتھیاروں کے تجربات کرتی رہی۔ امریکی فضائیہ کی یہ ضرورت تھی کہ اس کے ہوا باز اس قابل ہونے چاہیں کہ وہ دشمن کے بہت قریب جا کر اپنے آپ کو خطرے میں ڈالنے کی بجائے دور سے اسے اپنا نشانہ بنا سکیں۔ اس کے ساتھ ہی وہ چاہتی تھی کہ اس کے ہوا باز رات کے وقت بھی دشمن کو تباہ کر سکیں۔ مزید براں یہ کہ امریکی طیارے ہر موسم میں دشمن پر حملے کر سکیں۔ امریکی فوج یہ چاہتی تھی کہ اس کو ایسے ہیلی کاپٹر ملنے چاہئیں جو فوجیوں اور توپوں کو ایک جگہ سے دوسری جگہ پہنچا

سکیں۔ اس کے علاوہ اسے ایسے ہیلی کاپٹروں کی ضرورت تھی جو دشمن کے ٹینکوں اور مورچوں کو آسانی سے تباہ کر سکیں۔ فضائیہ اور فوج کی ان ضروریات کو پورا کرنے کیلئے نئے ہتھیار اور آلات بنائے گئے اور ان کا ویٹ نام میں تجربہ بھی کیا گیا۔ اس جنگ کے خاتمے کے بعد جب کمپیوٹر کی ٹیکنالوجی نے ہتھیار سازی میں انقلاب برپا کر دیا' اور پھر جب افغانستان پر روس نے قبضہ کر کے امریکہ کو اپنی فوجی طاقت میں بے پناہ اضافہ کرنے کا سنہری موقع دے دیا تو خلائی جنگ کیلئے نئی قسم کے ہتھیار بنائے جانے لگے۔ ایسے طیارے بنائے گئے جو ہر موسم میں لڑ سکتے ہیں اور وہ ایسے آلات سے لیس ہیں جو رات کو دن بنا دیتے ہیں۔ خلا میں جاسوس سیارچے زمین پر گہری نظر رکھ سکتے ہیں۔ خلا سے زمینی اشیاء کی تصویر بنانا معمولی کام ہے۔ ایسے بم بنائے گئے جو 60 میل کے فاصلے سے دشمن کو اپنا نشانہ بنا سکتے ہیں۔ بہر کیف کمپیوٹر ٹیکنالوجی کی برکت سے ایسے ہتھیار اور آلات بنائے جنہوں نے غیر صنعتی ممالک کے جدید اور جدید ترین ہتھیاروں کو فرسودہ بنا دیا۔ نئے انقلابی ہتھیار بنانے کے علاوہ امریکہ نے افغان قوم کی قربانیوں کا فائدہ اٹھا کر تین لاکھ افراد پر مشتمل ایک سریع الحرکت فوج بھی تیار کر لی۔

اب جس وقت عراق کے کویت پر قبضے کے بعد امریکہ کو خلیج میں آنا پڑا تو اس وقت امریکی عوام کو جو سب سے پہلا خطرہ محسوس ہوا وہ یہ تھا کہ خلیج ان کیلئے ویٹ نام ثابت ہو سکتی ہے۔ اسی لئے امریکی جنرل پاول نے یہ کہا کہ امریکہ اس جنگ میں ویٹ نام کی طرح آہستہ آہستہ ملوث نہیں ہو گا۔ اس کا کہنا تھا کہ امریکہ اسی وقت جنگ میں کودے گا جب اسے یہ یقین ہو جائے کہ وہ چند روز کے اندر عراق کو دبا لے گا۔ اس حکمت عملی کے تحت امریکہ نے تیزی سے اپنی سریع الحرکت فوج کو خلیج کے علاقے میں پہنچانا شروع کر دیا۔ اسی کے ساتھ ہی سرد جنگ کے خاتمے کا فائدہ اٹھا کر یورپ سے امریکہ اپنی بیشتر فوج کو وہاں سے لے آیا۔ جب پانچ لاکھ سے زائد زمینی فوج اور دو ہزار لڑاکا اور بمبار طیارے اکٹھے کر لئے گئے تو پھر عراق پر فضائی حملہ کر دیا گیا یہ حملہ اتنا اچانک اور پراسرار تھا کہ عراق کے کمانڈ اور کنٹرول کے مراکز کو زبردست نقصان پہنچا۔ ہوائی اڈوں کو بہت نقصان پہنچایا گیا۔ امریکہ اس حملے میں ایسے طیارے استعمال کر رہا ہے جو ہر موسم میں کام کر سکتے ہیں اور وہ رات کے وقت بھی سرگرم

عمل ہوتے ہیں۔ ایسے بم استعمال ہو رہے ہیں جو 60 میل فاصلے سے چھوڑے جانے کے بعد بھی اپنے ہدف تک پہنچ سکتے ہیں۔ ٹام ہاک کروز میزائل تو سینکڑوں میلوں کے فاصلے سے محو پرواز ہو کر ٹھیک اپنے نشانے پر پہنچتے ہیں۔

اس پس منظر میں اگر دیکھا جائے تو پہلی حقیقت جو ہم پر عیاں ہوتی ہے وہ یہ ہے کہ ویت نام میں ویت نامیوں کو امریکہ کا مقابلہ کرنے کے لئے روس اور چین کی بھرپور امداد حاصل تھی۔ جبکہ اس خلیج کی جنگ میں عراق کو ساری دنیا کا سامنا ہے اور روس اس سے کہہ رہا ہے کہ تباہی کے راستے پر مت چلو۔

دوسری حقیقت یہ ہے کہ ویت نام میں امریکہ کا دشمن زیر زمین سرنگوں اور جنگلوں میں چھپا ہوا تھا۔ اس لئے امریکہ کا واحد موثر ہتھیار فضائیہ غیر موثر تھا۔ جبکہ خلیج کے علاقے میں کوئی جنگل نہیں۔ ریگستان میں فوجی مورچے زیر زمین ہونے کے باوجود امریکہ کی نظروں سے پوشیدہ نہیں۔ ایسے کیمرے ہیں جو زمین کے اندر چھپے ہوئے ٹینکوں کی تصاویر لے سکتے ہیں۔ تیسری حقیقت یہ ہے کہ ویت نام میں امریکہ آہستہ آہستہ ملوث ہوا تھا جبکہ خلیج میں وہ پوری طاقت سے سرگرم عمل ہوا ہے اور چوتھی حقیقت یہ ہے کہ ہتھیار سازی میں کمپیوٹر ٹیکنالوجی اور لیزر ٹیکنالوجی وغیرہ کی وجہ سے اب بم خود اپنے ہدف کو ڈھونڈتے ہیں۔

ان حقائق کی روشنی میں اگر دیکھا جائے تو معلوم ہو گا کہ خلیج کی جنگ امریکہ کے لئے دوسرا ویت نام ثابت نہیں ہو سکتی۔ خلیج کے علاقے کو عراق امریکہ کے لئے دلدل بنا سکتا تھا اگر وہ اگست 1990ء میں امریکی فوج وہاں پہنچنے کے فوراً بعد اس پر حملہ آور ہو جاتا۔ یہ عراق کا قصور ہے کہ اس نے امریکہ کو ساڑھے پانچ مہینے کا عرصہ دے دیا کہ وہ اپنی بے پناہ فوجی طاقت کو اکٹھا کرے۔ اگر اس وقت عراق حملہ کرتا تو امریکہ کے لئے اس پر اتنی شدید بمباری کرنا ممکن نہ ہوتا۔ سچ تو یہ ہے کہ عراق نے وہ موقع ضائع کر دیا۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ صدر صدام حسین اپنے فوجیوں اور طیاروں کو زیر زمین پہنچانے کا اہتمام کرتے رہے۔ اب دیکھنا یہ ہے کہ وہ کب تک ان فوجیوں اور طیاروں کو چھپائے رکھتے ہیں۔ اگر دشمن نے ان کا ان سے رابطہ منقطع کر دیا تو پھر عراق ایک زبردست آزمائش سے دوچار ہو جائے گا۔

یہاں یہ بتا دینا ضروری ہے کہ اگر کوئی یہ سمجھتا ہے کہ امریکہ کا جنگی سازو سامان کم ہو جائے گا تو اسے یہ بتانا بے محل نہ ہو گا کہ وقت گزرنے کے ساتھ امریکہ کی فوجی قوت میں تیزی سے اضافہ ہو گا۔ اس وقت ہر روز چھ ہزار بڑے ٹرک اتحادی فوج کو سامان جنگ اور خوراک پہنچا رہے ہیں۔ اس لئے اس خوش فہمی میں مبتلا ہونا ٹھیک نہ ہو گا کہ امریکہ کمزور ہو گا۔ اس کے برعکس عراق کی طاقت روز بروز کم ہوتی جائی گی۔ اس وقت عراق صرف اس قابل ہے کہ وہ گاہے بگاہے سکڈ میزائلوں سے اسرائیل اور سعودی عرب کو نشانہ بنائے۔ کہتے ہیں کہ اس کی فوج اور فضائیہ محفوظ ہے۔ ہمیں یہ نہیں بھولنا چاہئے کہ 16 دسمبر 1971 کو جب پاکستان دولخت ہوا تو مشرقی پاکستان میں ہماری فوج اور فضائیہ محفوظ تھیں۔ فوجی تاریخ ہمیں بتاتی ہے کہ اگر ایک فوج کو دوسری مخالف فوج پر فضائی برتری ہو تو وہ من مانی کاروائیاں کر سکتی ہے۔ مجھے یقینی خطرہ ہے کہ اگر چند روز میں عراقی فضائیہ نے متحرک ہو کر امریکی فضائیہ کا مقابلہ نہ کیا اور وہ اسی طرح زیر زمین مورچوں میں چھپی رہی تو پھر امریکہ پورے عراق پر چھا جائے گا۔

جہاں تک دوسرے سوال کا تعلق ہے تو یہ بتانا کافی ہو گا کہ اگر اگست 1990ء میں ہی صدر صدام حسین اسرائیل پر میزائلوں سے حملہ کر دیتے تو وہ عرب اسرائیل جنگ شروع کر سکتے تھے۔ جب وہ خاموش رہے اور امریکہ کو ان پر حملہ کرنے کا موقع مل گیا تو پھر وہ اس قابل نہ رہے کہ اسرائیل کو جنگ میں ملوث کر سکیں۔ اس وقت وہ اگر میزائل اسرائیل پر داغتے ہیں تو اس کے عوض یہودی امریکہ سے اربوں ڈالر وصول کر لیتے ہیں۔ اب تو اسرائیل کو میزائل شکن پیٹریاٹ میزائل بھی مل گئے ہیں۔ اسے ڈالر بھی مل رہے ہیں اور ہتھیار بھی۔ یہ کہا جا سکتا ہے کہ جب عراق اسرائیل پر زہریلی گیس پھینکے گا تو اسرائیل کو جنگ میں ضرور ملوث ہونا ہو گا۔ اس کا جواب یہ ہے کہ عراق ہرگز یہ زہریلی گیس استعمال نہیں کرے گا۔ اسے معلوم ہے کہ اگر اس نے ایسا کیا تو پھر امریکہ کو یہ موقع مل جائے گا کہ وہ اسے عراق کے خلاف استعمال کرے۔

پاکستانی فوج کے چیف آف دی آرمی سٹاف جنرل مرزا اسلم بیگ نے 2 دسمبر 90ء اور پھر 28

جنوری 91ء کو جو بیانات خلیج کی اس جنگ کے پس منظر میں دئے ان پر ممتاز دانشور جناب عطا الرحمٰن نے 10 فروری 91ء کی روزنامہ نوائے وقت کی اشاعت میں "خلیج کی جنگ اور جنرل مرزا اسلم بیگ کے خیالات" کے عنوان سے ایک مضمون قلمبند کیا جس کا مطالعہ قارئین کے لئے دلچسپی سے خالی نہ ہو گا ملاحظہ فرمایئے۔ عطاالرحمٰن لکھتے ہیں۔

خلیج کی جنگ کے پس منظر میں پاکستان کے چیف آف دی آرمی سٹاف جنرل مرزا اسلم بیگ کی دو تقریریں اس موضوع پر ہمارے کسی بھی قومی یا سیاسی رہنما کے بیانات اور تبصروں کے مقابلے فطری میں کہیں زیادہ انہماک اور توجہ کے ساتھ پڑھی اور سنی گئی ہیں۔ اس کی ایک وجہ تو فطری ہے کہ جنگی حالات اور منظر پر یہ ایک حربی و دفاعی امور کی ماہر اور مقتدر شخصیت کا تبصرہ ہے۔ دوسری وجہ یہ ہے کہ پاکستان کے مخصوص ماضی کے پیش نظر ہمارے ملک کی ہیت مقتدرہ میں مسلح افواج کے سربراہ کو ہمیشہ کلیدی حیثیت حاصل رہی ہے۔ لہٰذا اب جو خلیج کے بحران نے تاریخی، دینی، جغرافیائی اور تلخ بین الاقوامی حقائق کی بنا پر ہماری قوم کو بجا طور پر تشویش کے عالم میں بلکہ بعض عوامی طبقوں کو اس سے بھی آگے بڑھ کر ہیجانی کیفیت سے دوچار کر دیا ہے۔ تو ان حالات میں موجودہ چیف آف دی آرمی سٹاف کی تقریروں پر عوامی اور سیاسی رہنماؤں کی توجہ کا مبذول ہو جانا مخصوص پاکستانی تناظر میں کوئی غیر معمولی بات نہیں ہے۔ پھر جنرل اسلم بیگ کی تقریروں کا لہجہ چونکہ اس مسئلے پر عوامی آہنگی سے خاصی مطابقت رکھتا تھا جبکہ سویلین حکومت سٹیٹ کرافٹ کے فوری تقاضوں کے تحت قدرے نرم رویہ اختیار کرنے پر مجبور ہے اس لئے بھی ہمارے سپہ سالار اعلیٰ کے خیالات کی اہمیت دوچند ہو گئی۔

جناب اسلم بیگ مرزا کی تقاریر پر یہ اعتراض تو ملک کے سیاسی اور جمہوری اذہان کی جانب سے سامنے آیا ہے کہ اس انداز سے خارجہ امور کو اپنے ہاتھ میں لینا کہ ان کے بیانات منتخب سویلین حکومت کی واضح اور اعلان کردہ خارجہ پالیسی سے مختلف رنگ اختیار کر جائیں۔

اپنی دونوں تقریروں میں جنرل صاحب نے جو مرکزی خیالات پیش کئے ہیں ان میں 2 دسمبر والے بیان میں تو موصوف نے یہ ارشاد فرمایا ہے کہ عراقی عوام بھی ایک سپر طاقت کے

سامنے اس جرات اور بہادری کے ساتھ اٹھ کھڑے ہوئے ہیں جس کا مظاہرہ حال ہی میں افغانستان اور فلسطین کے بہادر مسلمان کر چکے ہیں۔ کویت پر عراق کے قبضے سے قطع نظر اگر عراق کی فوجی طاقت کو تباہ کر دیا گیا تو اگلا نشانہ ایران ہو گا۔ 28 جنوری والی تقریر کا مرکزی نقطہ یہ ہے کہ عراق کے خلاف اس وقت جو جنگ لڑی جا رہی ہے اسے 1948ء - 1956ء - 1967ء اور 1973ء کی جنگوں کے تناظر میں دیکھنا چاہئے۔ پہلی تین جنگوں میں اسرائیل کے مقابلے میں عربوں کو شکست ہوئی تھی جبکہ 1973ء میں اسرائیل کے ناقابل تسخیر ہونے کا خیال درہم برہم ہو گیا اس کے بعد عربوں کے خلاف ایک نئی اور گہری سازش کا تانا بانا تیار کیا گیا۔ اس کے تحت پہلے تو انہیں آپس میں لڑا کر کمزور کیا گیا اور اب عراق کو کویت پر حملے پر اکسا کر اس کے خلاف اعلان جنگ کر دیا گیا۔ جنرل صاحب کے خیال میں اگرچہ عراق نے جارحیت کا ارتکاب کر کے غلطی کی ہے لیکن اس کو احساس دلانے کے لئے مزید وقت صرف کرنا چاہئے تھا۔ جنگ شروع کرنے میں جلد بازی سے کام لیا گیا ہے۔ اب پورا عراق ایک کربلا بن چکا ہے۔ دنیا بھر کے مسلمان عراق کی حمایت میں جو اٹھ کھڑے ہوئے ان کے پیچھے عشق رسول اور حب آل رسول کا جذبہ کارفرما ہے۔

راقم کے خیال میں جنرل اسلم بیگ کا پہلا ارشاد ایک ضابطے پر مبنی ہے۔ عراقی حکومت اس وقت اخلاقی سطح پر جس نوعیت کی دفاعی جنگ لڑ رہی ہے اسے سوویت سپر طاقت کے خلاف برپا کی جانے والی افغان مسلمانوں کی جنگ مزاحمت یا جہاد اور اسرائیل کے خلاف فلسطینی عوام کی تحریک انتفاضہ سے ہرگز تشبیہ نہیں دی جا سکتی۔ ان دونوں جنگوں اور حالیہ ام المحارب میں چند بنیادی فرق پائے جاتے ہیں جن کا باہمی موازنہ کرتے وقت لحاظ رکھنا چاہئے۔ افغانوں اور فلسطینی عوام کے خلاف سوویت یونین اور اسرائیل کی جنگوں کا آغاز ہی سراسر ظلم اور ناانصافی پر مبنی تھا۔ دونوں مواقع پر بین الاقوامی قوانین بین المملکتی اخلاقیات کی کھلم کھلا خلاف ورزی ان دونوں بڑی طاقتوں کی جانب سے کی گئی۔ افغانستان اور فلسطین کے عوام محض اپنے وطن کی آزادی اور غیر ملکی قبضہ سے نجات حاصل کرنے کے لئے میدان جنگ میں اترے تھے یہ ان کا بنیادی انسانی حق اور بطور مسلمان اسلامی فریضہ تھا۔ انہوں نے

عراق کے برعکس اپنے کسی کمزور یا طاقتور ہمسائے کے خلاف کسی نوع کی جارحیت یا زیادتی کا ارتکاب ہرگز نہیں کیا تھا۔ دونوں قوموں نے کسی بھی بین الاقوامی قانون یا معاہدے کی کوئی خلاف ورزی نہیں کی تھی۔ کہ ان کے خلاف سوویت سپر طاقت یا اسرائیلی صیہونیت ریاست کا کوئی قدم بھی کسی پہلو سے جائز قرار پاتا۔ افغانستان پر سرخ افواج کی یلغار اور فلسطینی علاقوں پر اسرائیل کا 1967 سے لے کر اب تک قبضہ دونوں ظلم و زیادتی اور سراسر ناانصافی پر مبنی تھے ان کے خلاف افغان اور فلسطینی عوام کی تمام تر جدوجہد اپنے حقوق کی بازیابی۔ آزادی کے ساتھ زندہ رہنے کے بنیادی انسانی حق اور مسلمان قوموں کی حیثیت سے اسلامی اصولوں کے عین مطابق ہے۔

اس کے برعکس کویت پر عراق کا قبضہ جو مشرق وسطیٰ کی حالیہ جنگ کا فوری باعث بنا ہے سراسر ایک غلط اقدام۔ بین الاقوامی قوانین کی صریحاً خلاف ورزی اور اسلامی انصاف کے مسلمہ اصولوں کی پامالی ہے۔ اس لحاظ سے عراق کی حکومت اپنے طاقت ور قوتوں کے خلاف خواہ کتنی زوردار دفاعی جنگ کیوں نہ لڑے اس کی اخلاقی حیثیت بہرصورت کمزور رہے گی۔ اس لئے کویت پر قبضے کی کوئی حمایت نہیں کر سکتا نہ کسی نے اب تک کی ہے۔ اسے یہ ریاست جلد یا بدیر خالی کرنے پڑے گی۔ اس کے خلاف اقوام متحدہ اور سلامتی کونسل نے ایک نہیں بارہ قراردادیں منظور کی ہیں۔ طاقت کے استعمال کی اجازت دی ہے۔ کیا امریکہ۔ برطانیہ اور اسرائیل مل کر اپنی بے پناہ فوجی طاقت اور معاشی رسوخ کے باوجود فلسطینیوں کے خلاف 1967ء سے اب تک کوئی قرارداد منظور کرا سکے ہیں۔ امریکہ نے اسرائیل کے خلاف قرارداد کو ویٹو کیا ہے لیکن اس کے حق میں وہاں سے خواہش کے باوجود کوئی موثر یا مثبت کارروائی 1948ء میں قیام اسرائیل کے غلط اقدام کے بعد نہیں کرا سکا۔ اس کی وجہ محض اور محض یہ ہے کہ اسرائیل کی طاقت اور امریکی سرپرستی سے قطع نظر فلسطینیوں کے مقابلے میں یہودی ریاست کا موقف نہایت ہی غلط بین الاقوامی قوانین کی پامالی اور اقوام متحدہ کے چارٹر کی خلاف ورزی کا مظہر ہے۔ اسی طرح اقوام متحدہ سے افغان مجاہدین کے حق میں تو مسلسل دس سال تک قراردادیں منظور ہوتی رہی ہیں اور بھاری اکثریت سے ہوتی رہی ہیں۔

سوویت یونین اس وقت ایک موثر اور طاقت ور عالمی اشتراکی بلاک کا قائد تھا۔ تیسری دنیا کے کئی ممالک امریکہ کے مقابلے میں اس کے ہمدرد و مونس تھے۔ اس سے فوجی و معاشی امداد حاصل کرتے تھے۔ اس سب کے باوجود اقوام متحدہ کے ڈیڑھ سو میں سے اوسطاً ایک سو بیس ممالک ہر برس سوویت یونین کے افغانستان سے نکل جانے کا مطالبہ کرتے تھے۔ اقوام متحدہ اس میں کوئی شک نہیں فلسطینیوں اور کشمیریوں کے مقابلے میں امریکی رسوخ کی وجہ سے عملاً ایک غیر موثر ادارہ رہا ہے لیکن حقیقت یہ ہے کہ امریکہ اسرائیل اور بھارت فلسطینی عوام اور اہل کشمیر کے خلاف اسی طرح ایک قرارداد بھی منظور کرانا تو درکار پیش کرنے کی جرات نہیں کر سکے۔ جس طرح کی بارہ قراردادیں چار مہینوں کے اندر عراق کے خلاف پاس کی گئی ہیں۔

صدام حسین یقیناً ایک مسلمان حکمران ہیں اور اس لحاظ سے غیر مسلم اقوام کے مقابلے میں ہماری ہمدردیاں ان کے ساتھ ہونی چاہئیں۔ لیکن ایک مسلمان ہونے کی حیثیت سے یہ حق انہیں کس نے دیا تھا کہ وہ ایک کمزور لیکن جس ہمسایہ مسلمان ریاست پر بلاوجہ یلغار کر دیں وہاں لوٹ کھسوٹ مچائیں بے گناہ مسلمان شہریوں کو بے گھر کریں اور اس پر اپنا قبضہ جما لیں۔ اس طرح پوری دنیا کی غیر مسلم طاقتوں کو یہ موقع مہیا کر دیں کہ وہ مسلمانوں کی سرزمین پر اپنی فوجیں لے آئیں اور ایک مسلمان ملک کے خلاف اعلان جنگ کر دیں۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے کہ اپنے بھائی کی مدد کرو خواہ وہ ظالم ہو یا مظلوم۔ صحابہ نے پوچھا حضور مظلوم کی مدد کریں لیکن ظالم کا ساتھ کس طرح دیں۔ اللہ کے نبی نے ارشاد فرمایا کہ ظالم بھائی کی مدد یوں کرو کہ اسے ظلم کرنے سے روکو۔ سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ صدام حسین نے جب کویت پر مسلمان عوام کے خلاف ارتکاب ظلم کیا تھا تو کیا ہم مسلمانوں نے اسے روکنے کے لئے کوئی سنجیدہ اور بامعنی کوشش کی تھی۔

جنرل مرزا اسلم بیگ کے ارشادات کے دوسرے مرکزی نقطہ کا جہاں تک تعلق ہے یہ مشاہدہ بہت درست اور حالات کا صحیح مطالعہ ہے لیکن اس کے ساتھ ہی انہیں ایک حکمت کار اور سپہ سالار کے طور پر یہ بھی سوچنا چاہئے کہ مسلمانوں میں سے جس شخص نے سازش

میں مرکزی کردار کیا ہے۔ عیسائی اور یہودی طاقتوں کو جنگ برپا کرنے کا بہانہ فراہم کیا ہے اس کی حرکات کو ہم مسلمانوں نے بروقت کیوں نہیں بھانپا۔ مغربی طاقتوں کی سازش کا قبل از وقت اندازہ لگا کر ہم اس کے خلاف متحد اور مستعد کیوں نہیں ہوئے۔ جنرل صاحب کا کہنا ہے کہ پہلے صدام حسین کو کویت پر قبضہ کرنے پر اکسایا گیا پھر کے اس کے خلاف مغربی قوتیں اکٹھی ہو گئیں۔ اگر یہ بات صحیح ہے تو اس کا مطلب یہ ہے کہ صدام حسین یا تو جان بوجھ کر مغربی طاقتوں کے مقاصد آگے بڑھا رہا ہے یا ایک اچھا فوجی کمانڈر ہونے کے باوجود کم عقلی کی بنا پر دشمنوں کے ہاتھوں میں کھلونا بن گیا ہے۔ ہر دو صورتوں میں اسے ایک مسلمان قوم اور وہ بھی اہل عراق جیسی بہادر قوم کی قیادت کا کوئی حق نہیں پہنچتا۔ وہ محض اپنے آمرانہ ہتھکنڈوں کی وجہ سے عراقی مسلمانوں کا حاکم بنا بیٹھا ہے اور اب اس نے صرف اہل عراق ہی نہیں پورے عالم عرب اور دیگر مسلمان قوموں کی تباہی کا موقع فراہم کر دیا ہے۔ ہمیں ایسے شخص کے ساتھ اظہار ہمدردی کی بجائے سب مسلمان قوموں کے ساتھ مل بیٹھ کر کوئی ایسا لائحہ عمل اپنانے پر غور کرنا چاہئے تھا جس کے نتیجے میں صدام حسین کی غلط حرکت کا تدارک بھی ہوتا اور مغربی طاقتوں کو بھی متحد ہو کر عالم عرب میں اپنی فوجیں اتارنے کا موقع نہ ملتا۔ جنرل اسلم بیگ ارشاد فرماتے ہیں کہ مسلمان عوام صدام حسین کے ساتھ اظہار ہمدردی کر کے عشق رسول کا اظہار کر رہے ہیں اور پورا عراق اس وقت کربلا بنا ہوا ہے۔ عشق رسول جو مسلمانوں کے سینوں میں ایمان باللہ کے بعد سب سے بڑی نعمت ہے اس کے سوتے ایمان عقل اور بالغ نظری سے پھوٹتے ہیں۔ عراق کی سرزمین میں یقیناً اس وقت کربلا بنی ہوئی ہے لیکن بدقسمتی سے اس قافلہ حسینی سے محروم ہے جس نے نواسہ رسول کی قیادت میں دنیوی لحاظ سے ہار کر بھی ایک جنگ جیتی تھی۔

ایک اسلامی تاریخ کے ایک ادنیٰ طالب علم کی حیثیت سے اپنے ملک کے صاحب بصیرت اور حکمت کار سپہ سالار کو مشورہ دینا چاہتا ہوں کہ وہ اپنے اوقات مطالعہ میں سے چند گھنٹے غزوہ احد اور اس کے دوران درپیش آنے والے حالات پڑھنے اور ان پر غور و فکر پر صرف کریں۔ اس غزوے کی تفصیلات پڑھ کر ہمیں معلوم ہوتا ہے کہ اللہ تعالیٰ کے قوانین

مسلمانوں کے معاملے میں بھی کتنے واضح اٹل اور بین اصولوں پر مبنی ہیں۔

قرآن مجید کی سورہ آل عمران میں آیت نمبر 120 سے لے کر 180 تک اس جنگ میں مسلمانوں کو پیش آنے والی مشکلات پر تفصیلی تبصرہ کیا ہے اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو اطمینان دلایا ہے کہ وہ ان واقعات پر رنجیدہ نہ ہوں کیونکہ حقیقی اور حتمی کامیابی بالآخر انہیں ہی ملے گی جو بالآخر حاصل بھی ہوئی لیکن اس کے ساتھ ہی ان مسلمانوں کو سختی کے ساتھ سرزنش کی ہے جنہوں نے دوران جنگ کمزوری دکھائی۔ اپنے نبی کی پوری اطاعت نہ کی اور مسلمانوں کی جماعت کے لئے پریشانی کا باعث بنے۔ گویا اللہ تعالیٰ نے اس سے یہ واضح کردیا کہ محض مسلمان کہلوا لینے سے انسان اللہ تعالیٰ کی تائید و نصرت کا مستحق نہیں بن جاتا خواہ وہ کفار کے ساتھ ہی برسرپیکار ہو بلکہ اس کے لئے ہر حالت میں چند اصولوں پر سختی سے کاربند رہنا پڑتا ہے۔

13 فروری 91ء کے روزنامہ نوائے وقت میں ممتاز دانشور اور مجاہد صحافی ابوذر غفاری نے خلیج کی تباہ کن جنگ چند حقائق کے عنوان سے ایک مضمون قلمبند کیا جس میں پاکستانی عوام سے درخواست کی کہ خدارا جذبات کی رو میں بہنے کے بجائے حقائق کو سمجھیے اور اس بین الاقوامی سازش کا حصہ نہ بنئے جو عالم اسلام کے خلاف روبہ عمل ہے۔ جناب ابوذر غفاری لکھتے ہیں۔

وادی کشمیر کے نہتے مسلمان جب جنوری 1990ء میں اللہ اکبر کا نعرہ لگا کر منی سپر طاقت بھارت کے خلاف سرگرم عمل ہوئے تو بھارتی فوج نے انہیں خون میں نہلانا شروع کردیا۔ ایران صغیر اور زمین پر فردوس کا جہنم بنا دیا گیا۔ ساری وادی کشمیر کربلا بن گئی لیکن کشمیری قوم کا جذبہ حریت جنون کی طرح بڑھتا ہی چلا گیا۔ ساری دنیا نے اہل کشمیر کی آہ و پکار کو سنا۔

پاکستان کی سابق وزیر اعظم محترمہ بے نظیر بھٹو نے اسلامی ممالک کا طوفانی دورہ کر کے عالم اسلام کے مسلمانوں کی توجہ مسئلہ کشمیر پر مرکوز کروانے کی بھرپور کوشش کی۔ عراق کے سوا تمام اسلامی ممالک نے کشمیر کے سوال پر پاکستان کا ساتھ دینے کے عزم کا اظہار کیا۔ اسی دوران فلسطین کے نہتے عوام پر بھی یہودیوں کے مظالم کی انتہا ہو چکی تھی۔ اسی لئے یہ ضروری سمجھا گیا کہ عالم اسلام کے مسائل پر غور و فکر کرنے کے لئے جولائی 1990 کے اواخر

میں اسلامی ممالک کے وزرائے خارجہ کی قاہرہ میں کانفرنس منعقد کروائی جائے۔

ظاہر ہے کہ بھارت یہ ہرگز برداشت نہیں کر سکتا تھا کہ اسلامی ممالک کی وزرائے خارجہ کی کانفرنس میں سے ایک مجرم کے طور پر پیش کیا جائے۔ اسی طرح اسرائیل بھی اسلامی ممالک کے اتحاد کو پسند نہیں کر سکتا تھا۔ اب یہ ایک حقیقت ہے کہ 1970ء کے عشرے کے اوائل سے عراق اسی طرح ایک معاہدے کے تحت روس کا اتحادی بنا تھا جس طرح 1971ء میں بھارت نے روس کے اس گٹھ جوڑ کا فائدہ اٹھانے کے لئے سابق بھارتی وزیر خارجہ گجرال نے صدر صدام حسین سے ملاقات کر کے ان کو خفیہ منصوبے پر عمل کرنے کی ترغیب دی جو انہوں نے روس اور بھارت کے ساتھ مل کر خلیج کے علاقے پر غلبہ حاصل کرنے کے لئے بنایا ہوا تھا۔ منصوبہ یہ تھا کہ عراق کویت پر قبضہ کرے گا اور جب خلیج کی عرب ریاستیں امریکہ کی مدد سے اسے وہاں سے نکالنے کی کوشش کریں گی تو بھارت پاکستان پر حملہ کردے گا تاکہ پاکستانی قوم کو سعودی عرب اور امریکہ کی مدد نہ مل سکے۔ اس طرح بھارت کو مسئلہ کشمیر سے نجات مل جاتی اس کے ساتھ ہی عراق نے اسرائیل پر میزائلوں اور طیاروں سے حملہ کر کے اسرائیل جنگ کا آغاز کرنا تھا تاکہ امریکہ کے خلاف تمام عالم اسلام اٹھ کھڑا ہو۔ اس طرح جب جنگ بہت پھیلتی تو پھر گورباچوف پر اتنا دباؤ پڑتا کہ وہ روسی جرنیلوں اور کے جی بی کے بات مانتے ہوئے امریکہ کا راستہ روکنے پر مجبور ہو جاتے۔ اس طرح پھر سرد جنگ کا آغاز ہو جاتا۔ اس ضمن میں گورباچوف کی اقتصادی اور سیاسی پالیسیوں پر کھلے عام شدید تنقید کرنے والے کرنل جنرل میکاشوف کا 17 جولائی 1990ء کا دورہ بغداد بہت اہم ہے۔ اس دورے کے بعد ان کو عراق میں روس کا فوجی مشیر مقرر کردیا گیا۔

بدقسمتی سے صدر صدام حسین روس اور بھارت کے جال میں پھنس گئے اور انہوں نے اس وقت کویت پر حملہ کردیا جب اسلامی ممالک قاہرہ میں فلسطین اور کشمیر کے مسلمانوں کی پکار پر لبیک کہنے کا فیصلہ کرنے والے تھے۔ عراق کی کویت پر حملے کی خبر عالم اسلام پر بم کی طرح گری اور اس نے مسلمانوں کے اتحاد کے خواب کو خاک میں ملا دیا۔ کشمیر اور فلسطین کے مسلمانوں کی آہ و پکار صدر صدام حسین کے ٹینکوں کے شور میں دب کر رہ گئی اور ساری دنیا

کی توجہ خلیج کے علاقے پر مبذول ہو گئی۔ سعودی عرب نے اپنے آپ فوری خطرے سے دوچار ہوتا ہوا محسوس کر کے اپنے دوستوں کو مدد کے لئے پکارا۔ پاکستان اور سعودی عرب کی دوستی مثالی رہی ہے جب بھی پاکستان کی سلامتی کو خطرہ لاحق ہوا اس نے سعودی عرب کو اپنے ساتھ کھڑا ہوا پایا۔ دسمبر 1981ء میں جب بھارت کی جانب سے پاکستان کی سلامتی کے لئے حقیقی خطرہ پیدا ہوا اور یہ برملا کہا جانے لگا کہ بھارت ایف سولہ طیاروں کے پاکستان میں آنے سے پہلے ہی اس کی ایٹمی تنصیبات کو تباہ کردے گا تو 2 دسمبر کو شہزادہ سلطان بن عبدالعزیز نے پاکستان آکر یہ اعلان کیا کہ پاکستان کی سلامتی کے منافی کوئی حرکت برداشت نہیں کی جائے گی۔ بھارت کو یہ معلوم تھا کہ سعودی عرب کے اواکس طیارے اور ایف پندرہ طیارے پاکستان کی مدد کے لئے پہنچ جائیں گے۔

اب پاک سعودی عرب دوستی کے پیش نظر یہ منطقی بات تھی کہ پاکستان سعودی عرب کی امداد کی اپیل پر فوراً حرکت میں آتا اور وہ اس کی بھرپور مدد کرنے کا اعلان کر دیتا۔ پاکستان کے پاس پانچ لاکھ سے زیادہ ریزرو فوجی ہیں۔ پچاس ہزار کے قریب ریزرو فوجی دس روز کے اندر سعودی عرب جا سکتے تھے اور وہاں ان کو جدید ترین اسلحہ سے لیس کرنا کوئی مسئلہ نہ تھا۔ بھارت کو یہی خطرہ تھا کہ جس طرح پاکستان نے افغانستان پر روس کی لشکر کشی کا فائدہ اٹھا کر اپنے آپ کو فوجی اور اقتصادی طور پر مضبوط بنا لیا ہے اب وہ خلیج کے بحران کی وجہ سے طاقت میں بے پناہ اضافہ کرلے گا۔ افسوس پاکستان نے اس صدی کے سنہری موقع کا فائدہ اٹھایا اور اس نے عراق کے کویت پر قبضے کے ایک ماہ بعد رائفلوں سے مسلح دو ہزار فوجی سعودی عرب بھیجے۔ ایسا معلوم ہو رہا تھا کہ وہ فوجی کسی ملک کے دفاع کے لئے نہیں بلکہ کرنے جا رہے تھے۔ اب اگر سعودی عرب کا انتہائی گہرا دوست پاکستان اس کی مدد کو نہیں آرہا تھا تو پھر اسے اسلامی ملک سے کسی مدد کی توقع ہو سکتی تھی۔ مصر پر سعودی عرب ایک حد تک کم اعتماد کر سکتا ہے۔ ویسے بھی مصر کے لئے یہ ممکن نہ تھا کہ وہ فوری طور پر سعودی عرب کی مدد کو پہنچتا۔ کہتے ہیں کہ شاہ فہد امریکہ کی زمینی فوج کو بلانے کے حق میں نہیں تھے لیکن جب اسلامی ممالک ہی ان کو دھوکا دے گئے تو وہ کیا کرتے۔ ان کو مجبوراً امریکہ کو مدد

لئے بلانا پڑا۔ امریکہ تو پہلے ہی تیار تھا وہ کئی عشروں سے تیل پر کنٹرول حاصل کرنے کے لئے منصوبہ بندی کر رہا تھا۔

اب امریکہ کے لئے سعودی عرب میں آنا مہیب خطرات سے پر تھا۔ اسے معلوم تھا کہ صدر صدام حسین نے ایک زبردست فوجی طاقت جمع کر رکھی ہے جو جنگ آزمودہ ہے۔ صدر بش کو یقین تھا کہ اگر خلیج میں جنگ طول پکڑ گئی تو پھر حالات انکے قابو سے باہر ہو سکتے ہیں۔ روسی جرنیل، کے جی بی اور کمیونسٹ پارٹی والے جو سرد جنگ کے خاتمے کو اپنے لئے پیغام موت سمجھتے ہیں ان کو یہ موقع مل جائے گا کہ وہ روس کو خلیج کے بحران میں ملوث کر دیں۔ امریکی صدر کو یہ بھی علم تھا کہ اسرائیل کے جنگ میں کود پڑنے سے یہ جنگ عرب اسرائیل جنگ بن جائے گی۔ انہیں اس کی بھی آگاہی تھی کہ امریکہ کے عوام ویت نام کے بھوت سے اب بھی ڈرے ہوئے ہیں اس لئے وہ ایک طویل جنگ کو برداشت نہیں کریں گے۔ یہی وجہ ہے کہ امریکہ نے پندرہ سو طیارے اور پانچ لاکھ امریکی فوجی خلیج میں اکٹھے کر لئے تاکہ ہر قسم کی صورتحال کا مقابلہ کر سکے۔ بعض لوگ اسے ضرورت سے زیادہ رد عمل کہتے ہیں لیکن یہ ضروری تھا۔

سلامتی کونسل نے جب 29 نومبر 1990ء کو عراق سے کہا کہ وہ 15 جنوری 1991ء تک کویت سے نکل جائے بصورت دیگر اسے طاقت کے ذریعے وہاں سے نکالا جائے گا تو یہ ضروری معلوم ہوتا تھا کہ تمام عالم اسلام متحدہ ہو کر خلیج کے بحران پر قابو پانے کی کوشش کرتا۔ تلخ حقیقت یہ ہے کہ عالم اسلام متحدہ کیسے ہوتا، صدر صدام حسین نے کویت پر قبضہ کر کے مسلمانوں کے درمیان عدم اتحاد کو یقینی بنا دیا تھا۔ اس کے علاوہ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ مسلمان امریکہ اور عراق کے درمیان زور آزمائی کو نورا کشتی سمجھتے رہے۔ اسی لئے کسی نے اسلامی ممالک کو متحد کرنے کی کوشش نہ کی۔

جیسا کہ بتایا گیا ہے کہ امریکہ کا مفاد اسی میں تھا کہ جنگ کو بہت جلد ختم کرایا جائے تاکہ طول پکڑ کر اس کے لئے مصیبت نہ بن جائے۔ امریکہ کو اصل خطرہ یہ تھا کہ اگر عراق نے اسرائیل پر حملہ کر دیا تو یہ جنگ عرب اسرائیل جنگ ہو گی۔ اسی لئے اس نے ڈیڈ لائن کے

ختم ہونے کے چند گھنٹے بعد عراق پر فضائی حملہ کر دیا۔ جیسا کہ جنگی تجربہ رکھنے والے فوجیوں کو یقین تھا امریکہ نے اپنی اعلیٰ ٹیکنالوجی کے بل بوتے پر چند گھنٹوں میں عراقی فضائیہ کو غیر موثر بنا کر فضائی برتری حاصل کر لی۔ عراق پر امریکہ کا اچانک اور شدید حملہ عالم اسلام پر بجلی بن کر گرا۔ بغداد مسلمانوں کی دینی اور دنیاوی طاقت کا مظہر رہا ہے۔ یہ وہ مقام ہے جہاں ہمارے پیران پیر عبد القادر جیلانیؒ اور امام اعظمؒ جیسے بزرگان دین آرام فرما رہے ہیں۔ ان کے مقدس مقبروں پر کافروں کے طیاروں کے سایوں کا پڑنا مسلمانوں کے دلوں پر چھریاں چلانے کے مترادف ہے۔ اسی لئے تمام عالم اسلام کے عوام سراپا احتجاج بن گئے۔ ان کو یہ معلوم تھا کہ صدر صدام حسین نے اپنے دور اقتدار میں بیشمار علمائے کرام کو شہید کیا ہے اور یہ کہ اس نے کویت پر قبضہ کر کے عالم اسلام کی پشت میں خنجر گھونپا ہے۔ لیکن بغداد اور نجف کی خاک کو اپنی آنکھوں کا سرمہ سمجھنے والے مسلمانوں کے لئے یہ ناقابل برداشت تھا کہ وہ اپنے مقدس ترین مقامات کی بے حرمتی ہوتا ہوا دیکھتے رہیں۔ تیرھویں صدی میں ہلاکو خان نے بغداد کی اینٹ سے اینٹ بجا دی تھی اور پھر دوسری جنگ عظیم میں انگریز نے اپنے ناپاک قدموں سے اس سرزمین کو روندا تھا۔ اب امریکہ اسے تباہ و برباد کر رہا تھا۔

اب عقل کا تقاضا یہ تھا کہ عراق پر اتحادیوں کے حملے کے بعد پاکستانی قوم کے رہنما بلا تاخیر اکٹھے ہوتے اور یہ سوچتے کہ عراق کو تباہی سے کس طرح بچایا جائے۔ بدقسمتی سے ایسا نہ ہوا۔ ایک سیاسی جماعت نے عراق میں لڑنے کے لئے رضا کار بھرتی کرنے شروع کر دیئے، اس کے ساتھ ہی اس نے یہ مطالبہ کرنے کا آغاز کر دیا کہ سعودی عرب سے پاکستانی فوج کو واپس بلایا جائے۔ اس کے علاوہ اس نے احتجاجی جلسوں اور جلوسوں کا سلسلہ شروع کر دیا۔ حیرانگی کی بات ہے کہ رضا کار اکٹھے کرنے والوں کو یہ خیال نہ آیا کہ وہ عراق کیسے جائیں گے اور اگر وہاں چلے بھی گئے تو وہ وہاں کیا کریں گے؟ عراق کے پاس پندرہ لاکھ کے قریب فوجی ہیں۔ اتحادیوں کے فضائی حملوں کی وجہ سے ان فوجیوں کو خوراک پہنچانا عراق کے لئے بڑا مسئلہ بنا ہوا ہے۔ اللہ ہی بہتر جانتا ہے کہ رضا کار بھرتی کرنے والوں نے یہ بھی سوچا ہے کہ نہیں کہ رضا کاروں کو خوراک کون دے گا۔

بہرکیف امریکہ کو تو ہم جہنم بھیج سکتے ہیں لیکن سعودی عرب کو تو ہم دور نہیں کر سکتے۔ تمام عرب خلیجی ریاستیں شام، مصر اور ترکی پوری طرح عراقی جارحیت کے خلاف نبرد آزما ہیں۔ یہ کہا جا سکتا ہے کہ ہم ایران کے ساتھ گہرا اتحاد کر لیں ہم تو ایسا کرنا چاہیں گے لیکن کیا ایران ہمارے کسی کام آسکتا ہے۔ ہمیں یہ حقیقت مدنظر رکھنی چاہئے کہ آٹھ سالہ جنگ نے ایران کو خون میں نہلا دیا ہوا ہے۔ دنیا جانتی ہے کہ 1979ء کے اوائل میں ایران ایک منی سپر طاقت تھا لیکن جنگ نے اب اسے معمولی فوجی طاقت میں تبدیل کر دیا ہے۔

میری اپنی قوم سے یہی عرض ہے کہ وہ جذبات کے طوفان کی نذر ہونے سے بچے۔ ہمارے رہنماؤں کو چاہئے کہ وہ اکٹھے ہو کر بیٹھیں اور یہ سوچیں کہ عراق کو تباہی سے کیسے بچایا جائے۔ یاد رہے اگر وطن عزیز میں انتشار پھیلا تو پھر مارشل لاء کا نفاذ ناگزیر ہو جائے گا۔ حقائق پر مزید روشنی ڈالنے اور اپنی جذباتی قوم کو عمل کی راہ دکھانے کے لئے جناب ابو ذر غفاری نے 24 فروری 91ء کو روزنامہ نوائے وقت میں ایک اور مضمون "خلیج کی تباہ کن جنگ چند حقائق" کے عنوان سے لکھا ملاحظہ فرمائیے۔

دوسری جنگ عظیم کے دوران امریکہ اور برطانیہ کے بمبار طیاروں نے جرمنی کے دو شہروں کے سوا تمام شہروں کو تباہ و برباد کر دیا تھا۔ 1944ء میں جرمنی کے شہر ڈرسڈن پر سارا دن ایک ہزار امریکی بمبار طیاروں نے بمباری کی اور پھر رات کے دوران ایک ہزار برطانوی بمبار طیارے بمباری کرتے رہے۔ یہ سلسلہ لگاتار تین روز چلتا رہا۔ اس خوفناک بمباری کے نتیجے میں بھڑکنے والی آگ نے علاقے کی ساری آکسیجن کو ختم کر کے تہ خانوں میں تین لاکھ کے قریب چھپے ہوئے جرمن مردوں، عورتوں اور بچوں کو موت کی نیند سلا دیا۔ یہی حشر کئی جرمن شہروں کا کیا گیا۔ جاپان میں بھی امریکی بمبار طیاروں نے شہروں کو برباد کیا۔ جب جاپان نہ جھکا تو اس کے دو شہروں پر ایٹم بم گرا کر چند منٹوں میں لاکھوں جاپانیوں کو موت کے گھاٹ اتار دیا۔

فوجی تاریخ ہمیں بتاتی ہے کہ بے پناہ مادی وسائل رکھنے والا امریکہ اپنے ایک فوجی کی جان بچانے کے لئے سینکڑوں ٹن بارود ضائع کر دیتا ہے۔ امریکہ کے اس فوجی طریقے سے بے

خبر لوگ یہ سمجھنے سے قاصر ہیں کہ وہ کیوں عراق کی زمینی فوج کے خلاف اپنی زمینی فوج کو حرکت میں لانے کی بجائے کئی روز سے عراق اور کویت پر فضائی بمباری کر رہا ہے۔ امریکہ کو اپنے فوجیوں کی جان بہت عزیز ہے۔ اس کے علاوہ امریکی صدر کو علم ہے کہ اگر امریکی فوجی زیادہ تعداد میں مرے تو پھر امریکہ میں عوام حکومت کے خلاف اٹھ کھڑے ہوں گے۔ اسی لئے امریکہ کی یہ کوشش ہے کہ وہ بمباری کر کے عراقیوں کو اتنا کمزور کر دے کہ اس کی زمینی فوج کے لئے ایک تر نوالہ ثابت ہوں۔ امریکہ کے بی باون بمبار طیارہ جو تباہی برپا کرتے ہیں اس کا اندازہ صرف وہی شخص کر سکتا ہے جو ان کی بمباری کا تلخ تجربہ کر چکا ہو۔ ایسا ایک بمبار طیارہ پچاس بم گراتا ہے اور ہر بم کا وزن سات سو پچاس پونڈ ہوتا ہے۔ اس قسم کے درجنوں بمبار طیارے دن رات عراق کی بہترین فوج محافظین جمہوریہ پر بم گرا رہے ہیں۔

ایسا معلوم ہوتا ہے کہ امریکہ عراق پر پچاس ہزار کے قریب حملے کر کے بھی مطمئن نہیں ہوا۔ 4 فوری 1991ء سے اس نے اپنے خوفناک بحری جنگی جہاز میسوری کو بھی جنگ میں جھونک دیا ہے۔ اس بحری جنگی جہاز پر سولہ انچ دہانے کی نو سپر توپیں نصب ہیں۔ ہر توپ ایک ٹن وزنی گولہ بائیس میل سے زیادہ دوری تک پھینک سکتی ہے۔ ہر پاکستانی فاتح جوڑیاں اور کھیم کرن رانی نامی توپ کے بارے میں جانتا ہے۔ آٹھ انچ دہانے کی یہ توپ ڈھائی من وزنی گولہ تقریباً دس میل کی دوری تک پھینک کر بھارتی فوج کی ایک پوری پلاٹون (نفری 40 فوجیوں کے قریب) کو تباہ کر دیتی تھی۔ اگر یہ گولہ کسی ٹینک کے نزدیک گرتا تو وہ اسے الٹا دیتا تھا۔ اب ذرا سوچئے کہ اگر رانی روپ کے اس گولے کو گیارہ گنا وزنی بنا دیا جائے تو پھر یہ کتنا تباہ کن ہو گا۔ میسوری توپوں کا ہر گولہ اس سے زیادہ وزنی ہوتا ہے۔ یہ جہاں گرتا ہے وہاں قیامت برپا ہو جاتی ہے۔ عراق کی فضائیہ اور نیوی کے غیر موثر ہو جانے کے بعد امریکہ کو یہ موقع مل گیا ہے کہ وہ اس خوفناک بحری جنگی جہاز کو کسی قسم کے خطرے کے بغیر استعمال کر کے عراقی ٹھکانوں کو تباہ کر سکے۔ اب کہا جا رہا ہے کہ اسی قسم کا ایک اور بحری جنگی جہاز وسکانسن نامی بھی بہت جلد عراقیوں کے خلاف سرگرم عمل ہونے والا ہے۔

اب امریکہ بمباری اور گولہ باری سے عراق میں جو تباہی پھیلا رہا ہے اس کا انتہائی درد

…پہلو یہ ہے کہ پاکستان میں یہ تاثر پھیلایا جا رہا ہے کہ اس سے عراقیوں کا کوئی قابل ذکر نقصان نہیں ہو رہا اور یہ کہ صدر صدام حسین ساری دنیا کے سامنے ڈٹے ہوئے ہیں۔ جب فضائی بمباری کا آغاز ہوا تو یہ کہا گیا کہ امریکہ ایک "ڈمی بغداد" کو اپنا نشانہ بنا تا رہا ہے۔ اسی طرح یہ کہا جا رہا ہے کہ عراق کے فوجی اور طیارے چھپے ہوئے ہیں اور امریکہ ڈمی ٹھکانوں پر اپنا بارود ضائع کر رہا ہے۔ اور یہ بات پورے وثوق سے کہی جاتی ہے کہ وقت آنے پر عراق کے ٹینک اور طیارے حرکت میں آ کر اتحادیوں کی فوج کو تباہ و برباد کر دیں گے۔ ان باتوں نے پاکستانی عوام کے مورال کو بہت بلند کیا ہوا ہے۔ چند لوگوں کو تو میں نے یہ بھی کہتے ہوئے سنا ہے کہ دشمن کا بارود زمین تک پہنچنے سے پہلے ریت میں تبدیل ہو جاتا ہے۔ سچ تو یہ ہے کہ پاکستانی قوم یہ تسلیم کرنے کے لئے تیار ہی نہیں کہ عراق کو آہستہ آہستہ ایک منظم منصوبے کے تحت تباہ و برباد کیا جا رہا ہے تاکہ وہ دنیا کے لئے ایک عبرت بن جائے۔ اگر کسی شخص کو یہ بتایا جائے کہ یہ کہنا کہ عراقیوں کا کوئی نقصان نہیں ہو رہا درحقیقت مغربی ممالک کے ہاتھوں میں کھیلنا ہے تو وہ اسے ہرگز قبول نہیں کرے گا۔ لوگ یہ کہتے ہوئے تھکتے نہیں کہ صدر صدام حسین نے دنیا کی واحد سپر طاقت کو للکار کر کمال کر دیا ہے۔ کاش ان کو کوئی بتائے کہ اگر کسی طاقتور کو للکارنا تباہی کا باعث بنے تو اس کا کیا فائدہ؟ آخر کار پانامہ کے نوریگا نے بھی تو امریکہ کو للکارا تھا۔

یہ سب کچھ بتانے کا واحد مقصد یہ ہے کہ ہماری قوم جذبات کی نذر ہو کر حقائق کا سامنا کرنے کے لئے تیار نہیں۔ پہلی حقیقت یہ ہے کہ صدر صدام حسین نے کویت پر قبضہ کر کے امریکہ کو یہ موقع فراہم کر دیا ہے کہ وہ عراقیوں کی فوجی اور اقتصادی طاقت کو تباہ کر دے۔ اسی لئے کویت پر حملہ کرنا صدر صدام حسین کی مہلک غلطی تھی۔ دوسری حقیقت یہ ہے کہ جب جنگ شروع ہونے کے بعد یہ عیاں ہو گیا تھا کہ عراقی فضائیہ اتحادیوں کی فضائیہ کا راستہ روکنے میں بری طرح ناکام ہو گئی ہے تو اس کے بعد پوری پاکستانی قوم کو اپنی توجہ اس جنگ کو بند کروانے پر مرکوز کر دینی چاہئے تھی۔ بد قسمتی سے ایسا نہ ہوا۔ جنگی جنون کو مزید ہوا دینے کے لئے رضا کار بھرتی کرنے کا سلسلہ شروع کیا گیا۔ کسی نے یہ نہ سوچا کہ یہ رضا کار کیسے

عراق جائیں گے اور یہ وہاں جا کر کیا کریں گے۔ اس طرح یہ نعرہ لگایا گیا کہ پاکستان اپنی خارجہ پالیسی تبدیل کرے۔ تاہم کسی نے یہ نہ بتایا کہ اس خارجہ پالیسی کو کس طرح تبدیل کیا جائے اور یہ کہ اس کا کیا رخ ہو۔

ان حقائق کی روشنی میں اگر دیکھا جائے تو ہم پر عیاں ہو گا کہ اس وقت ہماری قوم کو اس کا پورا احساس ہو جانا چاہئے کہ عراق کویت پر قبضہ کرنے کے نتیجے میں تباہ برباد ہو رہا ہے۔ ہمیں یہ معلوم ہونا چاہئے کہ عراق بالکل بے بس ہو چکا ہے۔ اس لئے ہماری پوری توجہ اس پر مرکوز ہو جانی چاہئے کہ اس جنگ کو کس طرح فوری طور پر بند کروایا جائے۔ یہ جنگ جلسوں اور جلوسوں سے بند نہیں ہو سکتی۔ تاہم ان حرکات سے وطن عزیز میں انتشار ضرور پھیل سکتا ہے۔ اس کے علاوہ ان جلسوں اور جلوسوں کی خبروں سے صدر صدام حسین اس غلطی میں مبتلا ہو سکتے ہیں کہ مسلم عوام ان کے ساتھ ہیں۔ اس طرح وہ دوسروں کی مدد کے سراب کا شکار ہو کر عراقی عوام کو مزید تباہی کی نذر کر سکتے ہیں۔ مطلب یہ کہ سڑکوں پر احتجاج کر کے ہم عراقی عوام کی تباہی کا باعث بن سکتے ہیں۔ پاکستان ہو یا کوئی اور اسلامی ملک ہو وہ عراقی عوام کو تباہی سے بچانے کے لئے صرف یہ کر سکتا ہے کہ وہ اسلامی ممالک کی کانفرنس کے لئے کوشش کرے۔ یہ اسلامی ممالک کی کانفرنس مسجد نبوی میں ہو اور وہاں صدر صدام حسین کو بلوا کر ان سے کویت سے غیر مشروط طور پر نکلنے کا اعلان کروایا جائے۔

عراق کی پسپائی اور ہمارے مجموعی رویئے پر جناب عطاالرحمٰن نے بڑی خوبصورت بحث کی ہے اور 26 فروری 91ء کو روزنامہ "نوائے وقت" لاہور میں انہوں نے ایک مضمون "عراق کی پسپائی اور ہمارا ملی و سیاسی رویہ" کے عنوان سے لکھا۔ ملاحظہ فرمائیے۔

خلیج کی جنگ میں عراق نے غیر مشروط طور پر کویت خالی کرنے کا مطالبہ تسلیم کر کے اپنی شکست کو تسلیم کر لیا ہے۔ یہ جو امریکہ نے جنگ بندی کیلئے سوویت عراق معاہدے کو منظور نہیں کیا اس کی وجہ یہ نہیں کہ اس معاہدے میں عراق کو کوئی رعایت دی گئی ہے جو امریکیوں کو پسند نہیں نہ اس کی وجہ یہ ہے کہ اس میں سلامتی کونسل کی قراردادوں کا پوری طرح لحاظ نہیں کیا گیا۔ بلکہ امریکی انکار کے پس پردہ دو محرکات کام کر رہے ہیں ایک یہ کہ جارج بش

ی معاملات میں بنیادی نوعیت کے فیصلے طے کرنے میں سوویت یونین کو کسی قسم کی بنیادی فیصلہ کن کردار دینے کے لئے تیار نہیں ہیں اور دوم یہ کہ امریکہ عراقی فوج کو الٹی میٹم کے ریعے یا براہ راست میدان جنگ میں پسپائی پر مجبور کر کے مشرق وسطیٰ کے خطے اور خلیج کے نیوں پر اپنا مستقل تفوق اور تسلط قائم رکھنا چاہتا ہے۔ یہ تفوق اس وقت تک قائم نہیں ہو سکتا جب تک تمام علاقے اور پوری دنیا پر یہ واضح نہیں کر دیا جاتا کہ امریکہ نہ صرف طاقت ٹیکنالوجی اور عالمی رسوخ کے بل بوتے پر اپنی شرائط منوانا جانتا ہے بلکہ اپنے ہراس غنیم کو جو میدان جنگ میں اس مقابلہ کرنے کی ٹھان لیتا ہے پوری طرح رسوا کر کے گھر روانہ کر دیتا ہے۔ یہ امریکی طرز فکر و عمل مسلمان ملکوں اور قوموں کے معاملے میں اور زیادہ اہمیت کے لئے اختیار کر لیتا ہے کہ آج کی دنیا میں مسلمانوں کے علاوہ باقی تمام دنیا عملاً مغربی تہذیب جس کی سیاسی اور فوجی قیادت امریکہ کے پاس ہے اور اس کی کوکھ سے جنم لینے والے سماجی و اقتصادی نظریات کی برتری کی قائل ہو چکی ہے۔ دونوں تحلیل ہو لئے ہیں۔ لیکن مسلمان عملی لحاظ سے تو نہیں لیکن اصولی اور فکری طور پر آج بھی اپنی منفرد تہذیب اور نظریہ حیات کے ساتھ چمٹے ہوئے ہیں۔ ہر مسلمان فرد یا معاشرہ خواہ وہ عملی زندگی میں اسلام میں کتنا ہی ورکیوں ہو اپنے منفرد و ملی تشخص کے شعور سے عاری نہیں ہوتا۔ یہ شعور اور احساس ہی بڑے مغربی قوتوں کے عالمی تسلط کے عزائم کی راہ میں حائل رہا ہے۔ اسی احساس میں و شعور نے انیسویں صدی کے آخر اور بیسویں کے آغاز پر برطانیہ اور فرانس کے سامراجی قوتوں کے خلاف ابتدائی اور انتہائی موثر تحریکوں کے لئے نظریاتی ایندھن کا کام دیا تھا۔ پھر دوسری جنگ عظیم کے بعد امریکہ اور برطانیہ کو کمیونزم کا چیلنج اور سوویت سپر طاقت کا مقابلہ درپیش تھا تو مغربی دانشوروں اور پالیسی سازوں نے اسلام اور مسلمانوں کے ملی شعور ہی کو اشتراکیت کی یلغار کو روکنے کے لئے ڈھال کے طور پر استعمال کرنے یا اس سے فائدہ اٹھانے کا فیصلہ کیا تھا۔ اب جو کمیونزم علمی اور عملی دونوں میدانوں میں پسپا ہو چکا ہے۔ سوویت سپر طاقت کئی ایک بین الاقوامی معاملات میں امریکہ کی تابع مہمل کا کردار ادا کر رہی ہے تو اب صرف اسلام اور مسلمان ہی باقی رہ گئے ہیں جنہیں جب تک پوری طرح نیچا نہیں دکھایا جاتا

اس وقت تک کرہ ارض امریکی حکمرانی اور انسانی زندگی پر مغربی تہذیب کی بالادستی اپنے تمام تر لوازم کے ساتھ قائم نہیں ہوگی۔

اس نظریات توجیہ کے علاوہ دوسرا جو امریکہ اور اس کے حواریوں کی نظر میں مسلمان ملکوں اور عوام کی پسپائی کے لئے ضروری ہے وہ عالمی نقشے پر بلاد اسلامیہ کا ایک جغرافیائی وحدت کی شکل میں پایا جانا ہے۔ مشرق اوسط کا پورا خطہ ایسی جگہ پر واقع ہے جہاں ایک نہیں تین براعظم آن کر ملتے ہیں۔ پاکستان کی جغرافیائی اہمیت اس کے قیام کے روز اول مسلّم رہی ہے۔ ایران عرب ریاستوں کی زمین حسین خزانے کو اگلتی ہے وہ مغربی دنیا کے صنعتی ڈھانچے کے لئے آکسیجن کا حکم رکھتا ہے۔ یہی وہ اصل وجہ ہے جس کی بنا پر جارج بش نے نہ صرف سوویت امن منصوبے کو مسترد کیا ہے بلکہ میخائل گورباچوف نے امریکی حکومت کو رضامند کرنے کے لئے جمعہ 22 فروری کو جو مزید ترمیمات پیش کی ہیں وہ بھی اسے قبول نہیں۔ حالانکہ اس منصوبے میں امریکہ کو جو سب سے بڑی رعایت دی گئی ہے وہ یہ ہے کہ مشرق اوسط پہلے امریکی اتحادی افواج کی واپسی کا نہ تقاضا کیا ہے نہ اس کے انخلاء کی کوئی تاریخ تجویز کی گئی ہے۔ لیکن اس کے باوجود امریکہ اس وقت تک جنگ بند کرنے پر آمادہ نہیں جب تک عراق کی پوری طرح ہزیمت نہیں ہو جاتی صدام حسین کو اقتدار سے علیحدہ کر کے ایک مجرم کے طور پر "عالمی امریکی عدالت عالیہ" کے قاضیوں کے سامنے پیش کر دیا جاتا یوں پورا عالم عرب قطع نظر اس سے کوئی اس بات کو پسند کرتا ہے یا نہیں اس امر کا قائل نہیں ہو جاتا کہ اس کے مستقبل کی طنابیں امریکی سپر طاقت کے ہاتھوں میں ہے۔

سوویت یونین جو پہلے کبھی ان کا دم بھرلیتا تھا اب ہزار کوششیں کرے عالمی اور عرب سیاست میں وہ مقام حاصل نہیں کر سکتا جو سرد جنگ کے ماضی قریب کے زمانے میں اس کے پاس تھا۔

یہاں مسلمان قوم کے افراد کی حیثیت سے ہمارے لئے یہ امر گہرے غور و فکر کا متقاضی ہے کہ آخر ایک باشعور ملت کے افراد ہونے کے باوجود ہم اس ہزیمت سے بچنے کے لئے ان تمام تدابیر کیوں اختیار کر سکے جن کی بنا پر خلیج کی جنگ کو چھڑنے اور اس افسوسناک انجام تک پہنچنے دونوں سے روکا جا سکتا تھا۔ امریکہ مسلمانوں اور اسلام کا دشمن ہے اس میں شک

ہی کوئی گنجائش نہیں۔ وہ اہل اسلام کی شکست اور رسوائی کا کوئی موقع ہاتھ سے گنوانا نہیں چاہتا اس حقیقت سے بھی کوئی انکار نہیں کر سکتا۔

لیکن آخر صدام حسین ایک مسلمان حکمران کے طور پر ذاتی سطح پر یا اس کے جملہ اعمال میں کون سی ایسی خوبی تھی جس کی بنا پر ہم موجودہ جنگ میں عوامی اور جذباتی سطح پر اس کا ساتھ دینے پر تلے ہوئے تھے اور اپنی حکومتوں کو مجبور کر رہے تھے وہ سب کچھ چھوڑ کر اور ہر قسم کے نتائج و عواقب سے بے پرواہ ہو کر صدام حسین کی صفوں میں جا کر شامل ہو جائیں۔

یہ جنگ جو درحقیقت باطل اور باطل کے درمیان مسلمانوں کے علانیہ دشمنوں اور ہماری آستین کے سانپوں کے مابین ایک معرکہ تھا اسے ہم نے اہل اسلام کی عزت و غیرت کا مسئلہ بنا کر کیا غنیم کو یہ پروپیگنڈا کرنے کا موقع نہیں دیا کہ مسلمان ایک اور معرکے میں شکست کھا گئے ہیں۔ حقیقت یہ ہے کہ اس وقت ملت اسلامیہ کو "عقلمند دشمنوں" کے مقابلے میں اپنے ملی و سیاسی قائدین کی شکل میں "نادان دوست" سے واسطہ پڑا ہوا ہے اور یہی اس کی ہزیمت کا اصل باعث ہیں۔

موجودہ تنازعے میں اگر ہماری قائدین کرام غیر جانبداری کا رویہ اختیار کرتے۔ اسے اسلام اور کفر کا معرکہ نہ بناتے۔ اس اصولی موقف پر پرچم بلند کرتے کہ ایک انصاف پسند قوم کی حیثیت سے ہم جہاں فلسطین پر اسرائیل کے قبضہ اور کشمیر پر بھارت کے قبضہ کے مخالف ہیں وہیں کویت پر عراق کا فوجی تسلط بھی ہمیں کسی حالت میں بھی منظور نہیں تو دنیا بھر میں ہمارے سیاسی رہنماؤں اور ملی قائدین کی اخلاقی ساکھ قائم ہوتی۔ مسلمانوں نے جب کبھی دنیا بھر کی طاغوتی طاقتوں کو شکست دے کر ایک عالم پر فرماں روائی کی تھی تو اس زمانے میں علم اور عقل دونوں سے کام لیا کرتے تھے اس کے بعد خدا کی مدد بھی ان کے شامل حال ہو جاتی تھی محض جہالت اور جذبات کی آمیزش سے تیار ہونے والے نعرے بلند کر کے انہیں دنیا پر نہ کبھی پہلے سیادت حاصل ہوئی تھی نہ اب اس کا کوئی امکان ہے۔ جہالت اور جذبانیت سے تو محض رسوائی ملتی ہے کسی کو اگر اس کا یقین نہیں آتا تو بہتر یہ ہے کہ وہ قرآن پڑھ کر یہ شعور حاصل کر لے۔

امریکہ اور یہودیت

اسرائیل کا نام زبان پر آتے ہی مسلمان ہی کیا دنیا کے ہر اس انسان کا دل غم و غصے سے بھر جاتا ہے جو کسی نہ کسی حوالے سے انسانیت سے اپنا ناطہ جوڑے ہوئے ہے۔
یہ کہنا زیادتی ہو گی کہ صرف مسلمان ہی یہودی سے نفرت کرتے ہیں۔ باشعور ہندو، سکھ، عیسائی، بدھ، پارسی غرض دنیا کے کسی مذہب کے پیروکار نے کبھی یہودی کے متعلق کلمہ خیر نہیں کہا۔ سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ اس کا سبب آخر کیا ہے اگر غیر جانبداری سے اس سوال کا جواب تلاش کیا جائے تو ایک جواب پر قریباً دنیا کے تمام دانشور متفق ہیں۔ وہ ہے احسان فراموشی۔

جی ہاں بلا شبہ یہ قوم خداوند عزوجل ہی کی نہیں بلکہ دنیا کے ان تمام اقوام اور ممالک کی احسان فراموش ہے جنہوں نے انہیں پناہ دی۔ امان دی۔ کھانا دیا۔ رہنے کو گھر دیئے۔ تحفظ دیا۔

بلاد عرب جہاں یہودی کبھی ایڑیاں رگڑ رگڑ کر زندہ درگور تھے جب ان کے لئے جائے امان تھا تو اس احسان فراموش قوم نے سب سے پہلے اسی کو ڈسا اور آج اپنی ریشہ دوانیوں اور سازشوں کے بل بوتے پر جب عربوں کے سینے میں خنجر اتار کر یہودیوں نے یہاں اسرائیل کے نام سے اپنی عالمی دہشت گردی کے لئے ایک اڈہ قائم کر لیا تو اس نے سانپ کی طرح سب سے پہلے اپنے مالکوں ہی کو ڈسنا شروع کر دیا ہے۔ اس غنڈے نے اپنی حرام کاریوں کے بل بوتے پر امریکہ جیسی سپر پاور کو اپنی ڈھال بنا لیا ہے۔
آج اسرائیل دنیا کے کسی بھی کونے میں کسی بھی قسم کی بدمعاشی کرے تو امریکہ لپک کر اس کے اور آزاد دنیا کے درمیان ڈھال بن جاتا ہے اور دنیا بھر کی ساری لعن طعن اپنے سر لے کر

اسرائیل پر آنچ بھی نہیں آنے دیتا ساری دنیا میں امریکہ کے سپر پاور ہونے کا ڈھنڈورا پیٹا جا رہا ہے۔ دنیا بھر کا پریس عراق کی تباہی کا الزام امریکہ اور اس کے اتحادیوں کے سر تھوپ رہا ہے

لیکن:-

دنیا کو علم نہیں کہ امریکہ کی اپنی حیثیت نہ ہونے کے برابر ہے اگر کچھ ہے تو یہودیت ہے۔ یہودیت ہے جس نے سارے امریکہ کو آکٹوپس کی طرح اپنی گرفت میں جکڑ رکھا ہے۔ کوئی ایسا شعبہ زندگی نہیں جس پر یہودیوں نے اپنے پنجے نہ گاڑ رکھے ہوں۔
سیاست، معیشت، معاشرت، دفاع، پریس، غرض کوئی ایسا شعبہ زندگی نہیں جس پر امریکہ میں یہودی قابض نہ ہوں۔!
بیرون امریکہ امریکی تاجر امریکی نہیں یہودی ہے۔ یہودی!
امریکی وزارت خارجہ، پینٹاگان، سی آئی اے، بیرونی سفارتخانوں اور حساس نوعیت کے دفاعی اداروں کی تمام قابل ذکر پوسٹوں پر یہودی قابض ہیں۔
ستم ظریفی ملاحظہ فرمایئے کہ گوری چمڑی والے عوام کو بھی ایک دوسرے سے رابطے کے لئے یہودیوں کی خدمات حاصل کرنا پڑتیں ہیں۔ یورپی ممالک کی طرف سے جو اہم سفارت امریکہ بھیجی جاتی ہے اس کا سربراہ عموماً یہودی ہوتا ہے اس طرح جب امریکہ یورپی اقوام سے رابطہ کرتا ہے تو اس کی نمائندگی کرنے والا سفارت کار بھی یہودی ہوتا ہے۔
اب تو حالت یہ ہے کہ امریکہ میں رہنے والے یہودیوں کا یہ دعویٰ ہے کہ امریکہ کی بنیادیں یہودی اصولوں پر مبنی ہیں نہ کہ عیسائی اصولوں پر۔
وہ کہتے ہیں کہ تاریخ عالم کو از سر نو مرتب کرنے کی ضرورت ہے تاکہ یہودیوں کو اس میں ان کے شایان شان مقام مل سکے اور اس کام کا آغاز بھی انہوں نے بڑے زور شور سے ایک عرصے سے شروع کر رکھا ہے۔

آج کی دنیا میں جبکہ روس نے اپنی غلط پالیسیوں کے ہاتھوں اپنا حلیہ بگاڑ لیا ہے اور وہ سپر طاقت کی سطح سے گر کر ایک بھکاری ملک بن گیا ہے جس کو ہر لمحے اقتدار اعلیٰ کو درپیش خطرات کا دھڑکا لگا رہتا ہے تو عالمی سطح پر صرف امریکہ ہی سپر پاور بن چکا ہے اور اس سپر پاور

کے اندر ایک اور منی سپر پاور بھی موجود ہے جو امریکن یہودی ہیں۔

یوں سمجھ لیجئے کہ امریکہ ایک ایسا جن ہے جس کی جان یہودی طوطے میں ہے۔ آیئے تاریخی تناظر میں اس امر کا جائزہ لیں کہ یہودی آخر امریکہ پر قابض کیسے ہوئے ہیں۔

ساڑھے تین سو برس سے اوپر ہوئے، چند یہودی خاندان امریکہ میں آباد ہوئے۔ یہ اولین آباد کار جنوبی امریکہ سے آئے تھے۔ اور نیو یارک میں (جس کا نام اس وقت نیو ایمسٹرڈیم تھا) سکونت اختیار کی۔ ان کا آبائی وطن سپین اور پرتگال تھا جہاں سے عیسائی حکمرانوں نے انہیں ملک بدر کردیا تھا سپین اور پرتگال کے باقی پورے کے پورے یہودی جن کی تعداد نوے ہزار سے اوپر تھی، جبراً عیسائی بنالئے گئے بہت تھوڑے ایسے تھے جنہوں نے تبدیلی مذہب پر جلاوطنی کو ترجیح دی۔ یہودیوں کے لئے یہ ابتلاء کا دور تھا۔

اس سے پہلے اسلامی دور میں جو پانچ سو سال پر محیط تھا، ہسپانوی یہودی پرامن اور عافیت کی زندگی گزار رہے تھے۔ عرب فاتحین کو اپنی رعایا کے مذہب میں دخل اندازی کا شوق نہ تھا اور جب تک وہ جزیہ ادا کرتے رہے، حکمران ان کی جان، مال و آبرو کے ذمے دار تھے۔ یہ وہ سنہرا دور تھا جس میں تین مذاہب، مسلمان، عیسائی اور یہودی۔ بیک وقت ایک ہی شاندار تہذیب کے خالق تھے اور ان کا تمدن، مذہب اور زبان اس میں کوئی رکاوٹ نہ تھی۔ اسلامی دور میں ہسپانیہ مغربی دنیا کا سب سے متمدن ملک بن کر ابھرا، جس کی شان و شوکت میں یہودیوں نے پورا پورا حصہ لیا۔ مسلمان حکمرانوں نے ان سے کوئی امتیاز روانہ رکھا اور انہیں حکومت، سفارت اور تجارت وغیرہ میں اعلیٰ عہدے اور نادر مواقع عطا کئے۔ اسی سنہرے دور میں یہودیوں میں، ادیب و شاعر، فلسفی، منطقی، نحوی اور سائنسدان پیدا ہوئے۔

آزادی فکر و اظہار کی اس فضا میں، جو اسلامی دور کا طرہ امتیاز تھی، یہودیوں نے عظیم الشان ترقی کی۔ مسلمان حکمرانوں کے ماتحت انہیں تبدیلی مذہب کا خوف نہ تھا۔

1250ء میں عیسائی پورے سپین پر پھر قابض ہو گئے۔ ابتداء میں تو یہودی صلیب کے تحت بھی اسی طرح زندگی گزارتے رہے جس طرح ہلال کے زیر نگیں، مگر رفتہ رفتہ پرانی نفرتیں جاگ اٹھیں۔ 1250ء میں عیسائیوں نے سپین کے تمام یہودیوں کو تبدیلی مذہب

مجبور کرنا شروع کیا۔ سرکاری اور غیر سرکاری دباؤ اتنا شدید تھا کہ خود عیسائی مورخ یہ کہنے پر مجبور ہو گئے کہ یہودیوں پر اتنا ظلم کبھی نہ ہوا تھا، جس کے نتیجے میں کم از کم دو لاکھ یہودی عیسائی بنالئے گئے۔

دراصل، پانچ سو سولہ اسلامی حکومت نے یہودیوں کو عیش و آرام کا عادی بنا دیا تھا اور اب اچانک انہیں فاقہ مستی اور جلاوطنی کے خدشات نے آن گھیرا۔ اس خوف سے بیشتر یہودی مذہب تبدیل کرنے پر تیار ہو گئے، لیکن یہ منافق یہودی، منافق اور عارضی عیسائی بن سکے۔ ان لوگوں پر ہمیشہ شک و شبہ کیا جاتا رہا، اور زندگی ان کے لئے تنگ رہی۔ انہیں بجبر یہودی سے عیسائی بنایا گیا اور بجبر ہی عیسائی رکھا گیا، لیکن ان کے دل نہ جیتے جا سکے، اور اکثر یہ ہوتا کہ بظاہر "نئے عیسائی" مسیحی رسوم و تقریبات میں شرکت کرتے، لیکن بباطن یہودیت پر قائم رہتے۔

ان سے ان کے ہم مذہب یہودی بھی نفرت کرتے اور عیسائی بھی۔ البتہ اتنا ہوا کہ ان کے "عیسائی" بچوں پر تعلیمی اداروں، فوج، عدالتوں اور گرجاؤں کے دروازے کھل گئے، اور یہودی ہونے کے باعث، ان پر جو قانونی، معاشرتی اور مذہبی پابندیاں اور رکاوٹیں تھی وہ دور ہو گئیں۔

مسلمان سپین میں یہودیوں نے یہودی رہتے ہوئے ترقی کی منازل طے کیں، لیکن عیسائی سپین میں صرف عیسائی ہونے کی صورت میں انہیں زندہ رہنے کا حق حاصل تھا۔ یہودی قوم ہمیشہ سے ابن الوقت رہی، اس لئے اب انہوں نے عیسائیت کا خول چڑھا کر، اصلی اور نسلی عیسائیوں کو ہر مقام پر پیچھے چھوڑ دیا، جو اپنی پسماندگی کا اظہار "نئے عیسائیوں" کو "سور" کا لقب دے کر کرتے تھے۔

جب یہ نئے عیسائی، ہسپانوی معاشرے میں اپنے قدم مضبوط کرنے پر قادر ہو گئے تو ان کے خلاف پھر نفرت کا طوفان اٹھا اور پرانے عیسائیوں نے الزام تراشی کی۔ یہ لوگ مذہب سے مخلص نہیں اور انہوں نے احتجاج کیا کہ محض قابلیت ہی منصب کے حصول کے لئے کافی نہیں ہونی چاہئے بلکہ "اعلیٰ خون" کو بھی مدنظر رکھنا چاہئے۔ "خون کی صفائی" کے اس

نظریئے نے، جو 1449ء میں ٹالیڈو (طلیطلہ) میں پیش کیا گیا، بعد میں دنیا کو "نسلی امتیازات" کی لعنت میں مبتلا کر دیا۔ پرانے عیسائیوں نے وہ شور و غوغا کیا کہ پوپ کو مجبور ہو کر مذہبی عدالتیں قائم کرنا پڑیں۔ جہاں نئے عیسائیوں اور قدیم مسلمانوں پر "بے دینی" کے فتوے لگا کر پھانسی کے احکام جاری کروائے گئے۔ ان لوگوں کے ہاتھ سے دنیا بھی گئی اور آخرت بھی، کیونکہ جو لوگ یہودیت اور اسلام پر قائم رہے، ان سے کوئی تعرض نہ کیا گیا، لیکن بعد میں تمام یہودیوں اور مسلمانوں کو حکم دیا گیا کہ وہ عیسائی ہو جائیں یا ملک چھوڑ دیں۔

پچاس ہزار یہودی فوراً عیسائی ہو گئے، مگر ان سے پانچ گنا تعداد شمالی افریقہ اور یورپ کے دوسرے ممالک میں پناہ لینے پر مجبور ہو گئی۔ یہی حال مسلمانوں کا ہوا جو یہودیوں سے کہیں زیادہ بڑی تعداد میں جلا وطن کر دئے گئے۔ 1507ء میں سپین غیر عیسائی عناصر سے پاک ہو گیا۔ ان یہودیوں کی اولاد بعد میں امریکہ پہنچی۔ سپین کے یہ یہودی خاصے خوشحال لوگ تھے جنہیں تجارت کے گر آتے تھے اور جن کی معاشرتی حمیت بھی پختہ تھی۔ البتہ جہاں ان کے پاس دولت کی فراوانی تھی، وہاں دین اور تقویٰ کا خانہ خالی تھا۔ سولھویں صدی کے آغاز ہی میں چند یہودی متمول خاندان جنوبی امریکہ جا پہنچے اور ڈیڑھ سو برس کے اندر اندر انہوں نے برازیل، سوری نام، باربیڈوس، جمیکا اور جزائر غرب الہند میں اپنی بستیاں بسا لیں اور چینی، تمباکو، کافی اور چائے کی تجارت پر تقریباً مکمل کنٹرول حاصل کر لیا، لیکن یہاں بھی یہود دشمن عناصر ان کی تاک میں رہے، مگر یہودی اپنی دولت و ثروت کے بل بوتے پر ایک جگہ سے دوسری جگہ منتقل ہو کر انہیں چکمہ دیتے رہے۔

سترھویں صدی عیسوی میں جب ولندیزیوں نے ہسپانویوں کو شکست دے کر "نئی دنیا" کے کئی اہم مقامات میں قدم جما لئے تو یہودیوں کو بھی سکھ کا سانس ملا۔ اور ان لوگوں نے ولندیزیوں کے ساتھ مل کر ہسپانویوں کو شکست دی اور روامے درمے ہر طرح ان کی مدد کی۔ اب انہیں ہسپانوی حکمرانوں سے بدلہ لینے کا موقع ملا تھا، جس سے یہودیوں نے (اپنی چار ہزار سالہ پرانی روایات کے عین مطابق) پورا پورا فائدہ اٹھایا۔

ولندیزی جب شمالی امریکہ میں پہنچے تو یہودی ان کے ہم رکاب تھے اور وہ "نیوایمسٹرڈم" میں (جسے انگریزوں نے فتح کر کے "نیویارک کا [illegible]" پاؤں جمانے میں کامیاب ہو گئے۔

یہ یہودی جو شمالی امریکہ پہنچے، مذہب کی تبلیغ کے لئے نہیں گئے تھے بلکہ ان کا مقصد پہلے تو اپنی جان بچانا اور پھر دولت کمانا تھا جب یہ لوگ امریکی نو آبادیوں میں پہنچے تو ان کا واسطہ کٹر عیسائیوں سے پڑا جو حضرت عیسیٰؑ کے پیروکار تو تھے ہی لیکن ساتھ "عہد نامہ قدیم" (یا توریت) پر بھی ایمان رکھتے تھے۔ یہ عیسائی انگلستان سے امریکہ آنے کو بھی مذہبی درجہ دیتے اور "ہجرت" قرار دیتے تھے۔ اپنی بستیوں میں یہ بنی اسرائیل کا قانون چلاتے تھے اور یہودیوں سے بڑھ کر "یوم السبت" کے قائل تھے، لیکن اس کا مطلب یہ ہرگز نہ تھا کہ وہ یہودیوں کو پسند کرتے تھے۔ جس انگلستان سے نکل کر وہ امریکہ پہنچے تھے۔

وہاں رومن کیتھولک مذہب کو رد کر کے، پروٹسٹنٹ عقائد اختیار کئے جا چکے تھے، اور شمالی امریکہ میں بسنے والے یہ انگریز عیسائی انہی عقائد کے حامل تھے اور اپنے آپ کو دوسرے تمام عیسائی فرقوں سے زیادہ "معتبر" عیسائی گردانتے تھے۔ یہودیوں کے شمالی امریکہ میں قدم جمانے میں چار "اتفاقات" نے اہم حصہ لیا، انگریز عیسائیوں کا موسوی عقائد کی طرف رجحان، انگریزوں کا یہ نظریہ کہ حکومت افراد میں معاہدے پر مبنی ہے، مختلف افراد کو اپنی جاگیروں پر اپنا قانون نافذ کرنے کا اختیار، اور ملک چھوڑنے کی فراخدلانہ پالیسی، جس کا مذہب سے کوئی تعلق نہ تھا۔ سترھویں صدی میں جب یہودی امریکی نو آبادیوں میں پہنچے تو انہیں یہ دیکھ کر خوشگوار حیرت ہوئی کہ "موسوی قانون" ان سے پہلے وہاں موجود تھا۔

1654ء ستمبر کے ایک دن، سپین اور پرتگال سے نکالے ہوئے یہودیوں کی نسل سے 23 افراد "نیوایمسٹرڈم" پہنچتے ہیں، جس کی کل آبادی اس وقت ساڑھے ساتھ سو نفوس تھی! یہ مختصری تاجر پیشہ آبادی اٹھارہ زبانیں بولتی تھی، لیکن عبرانی ان میں شامل نہیں تھی۔

یہ لوگ جنوبی امریکہ میں پرتگالی حکام کی چیرہ دستیوں سے تنگ آ کر ہالینڈ جا رہے تھے کہ راستے میں قزاقوں نے ان کے جہاز کو گھیر لیا اور ان کی پائی پائی چھین لی۔ یہ 23 افراد کسی طرح اپنی جانیں بچا کر "نیوایمسٹرڈم" پہنچ گئے جو قریب ترین بندرگاہ تھی۔ "نیوایمسٹرڈم" کا ولندیزی گورنر متعصب عیسائی تھا اور اسے اتنی بڑی تعداد میں یہودی "فقراء" کو اپنی رعایا

کر قطعاً خوشی نہ ہوئی۔ اسے تو پروٹسٹنٹ عیسائیوں کے سوا کوئی اور فرقہ گوارا نہ تھا۔

اس نے حکام بالا کو ان کے بارے میں اطلاع دی اور التجا کی کہ اس دھوکے باز قوم کو جلا وطن کرنے کی اجازت دی جائے ورنہ یہ اس نئی آبادی کو خراب و تباہ کر دیں گے۔ اس کے خیال میں "مسیح کے دشمنوں" کو قیام کی اجازت دینے سے سب کا اخلاق خراب ہونے کا اندیشہ تھا۔ بدقسمتی سے ڈچ ویسٹ انڈیا کمپنی کے اہم عہدیدار خود یہودی تھے۔

اس بات کا ان 23 پناہ گزینوں کو علم تھا، چنانچہ انہوں نے ان کے نام ایک عرضی روانہ کی اور یہودی قوم کے مالی اثاثوں کا حوالہ دیتے ہوئے جن کی بدولت یہ کمپنی مستحکم تھی، قیام کی اجازت طلب کی، اور ساتھ ہی دبی دبی دھمکی دی کہ اگر انہیں ملک بدر کیا گیا تو وہ اپنا تجربہ اور کاروبار ان کے مخالفوں (یعنی فرانسیسیوں اور انگریزوں) کو پیش کر دیں گے جہاں رہنے سہنے پر کوئی پابندی نہیں۔

کمپنی کے ڈائریکٹروں پر اس کا خاطر خواہ اثر ہوا اور ولندیزی گورنر کو ان یہودیوں کے خلاف کاروائی کرنے سے روک دیا گیا، اس حکم نے امریکہ میں یہودیوں کا قیام آسان بنا دیا اور یوں ان کی تاریخ کا پہلا باب شروع ہوا۔ ان کے بعد مزید یہودی امریکہ پہنچنے لگے ان لوگوں کو اپنا قبرستان مخصوص کرنے کا حق تو مل گیا، لیکن الگ معبد بنانے کی اجازت نہ ملی۔ ولندیزی گورنر ان کی آمد سے خوش نہ تھا، اس لئے اس نے یہودیوں کو اپنی "توہم پرستانہ" رسومات اپنے اپنے گھروں میں ادا کرنے کا حکم دیا۔

1664ء میں امریکہ میں انگریزوں کے قدم پہنچے، مگر اس سے پہلے یہودیوں کو ایک اور فتح حاصل ہوئی اور انہیں شہری معاملات میں شریک کر لیا گیا۔ اسی کی بنا پر چند یہودیوں کو امریکی شہریت بھی حاصل ہو گئی۔ اس کے بعد انہیں تجارت و سفر کی آزادی اور ملکیت کا حق بھی مل گیا۔ انگریزوں نے اپنی آمد کے بعد یہودیوں سے چشم پوشی کی اور انہیں اپنے عبادت خانے بنانے کی اجازت دے دی۔ 1730ء میں نیویارک کی مشہور وال سٹریٹ پر یہودیوں کا پہلا معبد تعمیر ہوا۔ یہودیوں کے لئے آزادی اور خوشحالی کا دور شروع ہوا چکا تھا، تاہم یہودی انگریزوں کو اپنے مقابلے میں "وحشی" شمار کرتے تھے اور اپنے آپ کو انگریزوں سے زیادہ مہذب

سمجھتے تھے۔ کیونکہ ان کے گھروں میں اعلیٰ فرنیچر، عمدہ ایشیائی قالین اور تصویریں تھیں جن کی وجہ سے یہ لوگ اپنے آپ کو برتر خیال کرتے تھے۔

بعض امریکی نو آبادیوں میں عوام کو زیادہ حقوق و مراعات حاصل تھیں۔ مثلاً روڈ آئی لینڈ میں یہ عقیدہ راسخ تھا کہ حکومت کو صرف قانون سازی اور جرائم کی بیخ کنی پر توجہ دینی چاہئے اور مذہبی، سیاسی امور اس کے دائرہ اختیار سے باہر ہیں۔ اٹھارہویں صدی کی "روشن خیالی" امریکہ میں جڑ پکڑ رہی تھی۔ انصاف، مساوات اور آزادی کے نئے نئے تصورات ذہنوں پر دستک دے رہے تھے۔

یہودیوں نے اس کا پورا پورا فائدہ اٹھایا، اور رفتہ رفتہ انہیں ووٹ کا حق اور ملازمت کی رعایت بھی حاصل ہو گئی۔ ان عقائد پر، یا ان کی تبلیغ پر پہلے ہی کئی نو آبادیوں میں پابندی اٹھ چکی تھی۔ چند ایک شہروں اور ریاستوں میں یہودیوں پر پابندیاں برقرار تھیں۔ مثلاً میری لینڈ ورجینا میں یہودیوں کو مساوی حقوق حاصل نہ تھے اور عیسائیت کے سوا کسی اور عقیدے کی تبلیغ کی اجازت نہ تھی اس کی وجہ سے کئی یہودی خاندان عیسائی ہو گئے۔

دلچسپ بات یہ ہے کہ یہودیوں کے بجائے یہودیت نو آبادیاتی نظام پر اثر انداز ہوئی۔ یہاں آباد ہونے والے یہودی اپنے مذہب سے محض "زبانی تعلق" اور اپنے عیسائی ہمسایوں کی اجتماعی زندگی سے متاثر تھے۔ اس وجہ سے امریکی یہودیت، یورپی یہودیت سے خاصی مختلف شکل اختیار کر گئی۔ پہلی وجہ امتیاز تو یہ تھی کہ یورپ کے یہودی غریب تھے اور گھٹیا بستیوں میں رہتے تھے۔ ان کے مقابلے میں سپین اور پرتگال سے آنے والے یہودی اس بود و باش سے ناآشنا تھے اور اسی لئے ان کی ذہنیت مختلف تھی۔

امریکی یہودی شکل و شباہت اور رہن سہن میں اپنے ہم وطن عیسائیوں سے مختلف نظر نہ آتے تھے۔ اس کے علاوہ یہ یہودی قدامت پسند نہ تھے، اور بعض اپنے مذہب کی خاطر اپنی خوش حال زندگی ترک کرنے کو تیار نہ تھے۔ سپین میں مسلمانوں اور پھر عیسائیوں کے ماتحت رہ کر، یہ یہودی خاصے "دنیادار" ہو چکے تھے اور اپنے مذہب سے واجبی لگاؤ رکھتے تھے۔

دوسری وجہ یہ تھی کہ ان نو آبادیوں میں عیسائیت کے جو فرقے آباد تھے ان کی زندگی کی

اساس توریت اور یہودی قانون تھے۔ خود امریکی آئین کا تصور توریت سے اخذ کردہ ہے۔ اس لحاظ سے یہودیوں کے امریکہ آنے سے پہلے ہی "یہودیت" وہاں مقبول ہو چکی تھی اور خود یہودیوں کو جو بعد میں آئے، یہ دیکھ کر حیرت ناک مسرت ہوئی کہ امریکی عیسائی ذہنی طور پر ان سے قریب تھے۔

تیسری وجہ یہ تھی کہ امریکہ میں کبھی جاگیردارانہ نظام قائم نہ ہوا۔ یورپ سے آنے والے اگرچہ جاگیرداری نظام کے پروردہ تھے، تاہم امریکی سرزمین پر یہ پودا پھل پھول نہ سکا۔ امریکہ میں جاگیروں کی سرحدیں متعین نہ ہو سکیں اور لوگ زمین آباد کرنے میں دلچسپی لینے کے بجائے تجارت اور دولت کمانے کے دوسرے طریقوں کو اپنانے میں مصروف ہو گئے یہودی ابتداء ہی سے تاجر پیشہ تھے، اس لئے وہ امریکی نظام میں آسانی سے فٹ ہو گئے اور اس کے تانے بانے کا قدرتی حصہ بن گئے۔ ان میں زراعت پیشہ یا مزدور پیشہ لوگ نہیں تھے۔ اسی طرح دماغی کام کرنے والے بھی کم تھے۔ ابتداء میں طب، قانون، ہندسہ اور معماری میں بہت کم یہودی نظر آئے تھے۔ جنگ آزادی کے موقع پر پچاس فیصد امریکی غلام تھے، لیکن یہودی اس لعنت سے بچے ہوئے تھے۔ اکثریت دکاندار تھی اور ان میں کافی، تمباکو، چینی وغیرہ کے بڑے بڑے تاجر تھے یا بردہ فروش۔ وہ دوسرے امریکیوں کی طرح ٹیکس ادا کرتے اور انہی کی طرح تمام سہولتیں حاصل تھیں۔

چوتھی وجہ یہ تھی کہ نو آبادیاتی امریکہ میں یہودیوں کو اپنا مخصوص سیاسی نظام رائج کرنے کی ضرورت پیش نہ آئی۔ امریکی عدالتیں ان سے انصاف کرتی تھیں اس لئے انہیں اپنے فرقے کے جج وغیرہ مقرر کرنے کی ضرورت پیش نہ آئی۔ مروجہ قوانین میں بھی یہودی اور غیر یہودی میں کوئی امتیاز نہ برتا جاتا تھا۔

اس وجہ سے قدیم ادارے اور روایات امریکہ میں ختم ہوتی چلی گئیں۔ اور وہ رشتے جو یہودیوں کو یہودی بناتے تھے ٹوٹتے چلے گئے۔ امریکہ میں صرف چند مظاہر باقی رہ گئے جن میں ان کے عبادت خانے اور قبرستان نمایاں تھے۔

آخری سبب یہ تھا کہ 1840ء تک امریکہ میں کوئی یہودی "ربی" یا مستند مذہبی رہنما

موجود نہ تھا! دراصل کسی مذہبی رہنما نے امریکہ کو قابل اعتناء ہی نہ سمجھا۔ ان کے خیال میں امریکہ "ناپاک سرزمین" تھی جہاں مذہب، بالخصوص یہودیت کے پہنچنے کی کوئی گنجائش نہ تھی۔ اس وجہ سے امریکہ میں یہودیوں کا باقاعدہ مذہبی نظام قائم نہ ہو سکا اور جب یہ مذہبی رہنما امریکہ میں وارد ہوئے تو سیاسی اور مذہبی معاملات اتنے آگے بڑھ چکے تھے کہ یہ رہنما ان پر مطلقاً اثر انداز نہ ہو سکے۔

ان اسباب کی بنا پر امریکی یہودیوں میں "تقدس اور تقویٰ" جنم نہ لے سکا جو یورپی یہودیوں میں موجود تھا۔ انہیں یہودیت سے 'مذہبی لحاظ سے' کوئی رغبت نہ تھی۔ اگر انہیں کوئی مسئلہ پیش آتا تو اس کا حل وہ تالمود وغیرہ میں ڈھونڈتے بلکہ اپنے ماحول سے تلاش کرتے، اور اگر تالمود ان کی راہ میں حائل ہوتی تو وہ مقامی قانون کو ترجیح دیتے۔

ان کی معاشرتی اور اجتماعی زندگی میں یہودی رسم و رواج شریعت، قوانین وغیرہ کا کوئی حوالہ شاذ و نادر ہی ملتا۔ وہ امریکی زندگی اور ماحول میں اس طرح ضم ہو گئے تھے کہ اپنا مذہب فراموش کر چکے تھے۔ اس کے علاوہ یہودیوں اور عیسائیوں کی باہم شادیوں نے بھی حد بندیاں نرم کر دیں۔ علوم معاشرت کے ماہرین یہاں تک کہنے پر مجبور ہو گئے کہ اگر اسی طرح یہ شادیاں ہوتی رہیں تو چند برسوں بعد امریکی یہودی خواب و خیال ہو جائیں گے، لیکن اس کے برعکس ہوا یہ کہ جنگ آزادی کے بعد امریکی یہودیوں کی تعداد میں تیزی سے اضافہ ہونے لگا۔ جنگ آزادی میں بیشتر یہودیوں نے انگریزوں کے خلاف جارج واشنگٹن کا ساتھ دیا۔ بہرحال اپنی پرانی عادت اور فطرت کے مطابق یہودی درپردہ "امن اور صلح" کے لئے کوشاں رہے کیونکہ وہ اپنے دنیاوی اثاثوں اور عیش و آرام سے محروم نہ ہونا چاہتے تھے۔ یہ لوگ محب وطن بھی نہ تھے۔ انہیں ہمیشہ کی طرح صرف اپنا مفاد عزیز تھا جب انگریز نکل گئے اور امریکہ "آزاد" ہو گیا تو ان لوگوں نے مجبوراً امریکی حکومت سے وفاداری کا اعلان کیا۔ اس کا صلہ انہیں یہ ملا کہ امریکی آئین نے مذہبی آزادی کو بنیادی اصول قرار دیا۔

یورپ میں آباد یودی 1500ء سے 1800ء تک انتہائی پسماندہ اور رسوا کن زندگی گزارتے رہے۔ انہیں ہر شخص نفرت کی نگاہ سے دیکھتا اور انہیں "خدا کی بدترین مخلوق"

سمجھا جاتا – "یہودی" کا لفظ ساری دنیا میں سود خور، کنجوس، کمینہ صفت اور رذیل کے معنوں میں مستعمل ہو گیا۔ اٹھارہویں صدی میں یہ حال تھا کہ بڑے بڑے دانشور بھی یہودیوں سے نفرت کرنے لگے۔ مثلاً والٹیر نے انہیں "لالچی اور خود غرض قوم" کہا۔

گوئٹے کے نزدیک یہ لوگ "گھٹیا اور ذلیل انسان" تھے کئی سیاست دان انہیں جلا وطن کرنے کی تجویز پیش کرتے رہے۔ تنگ و تاریک مکانوں اور بستیوں میں رہنے والے یہودی فطرتاً بھی کینے اور تنگ ذہن بن گئے، اور ان کا اس "بنی اسرائیل" سے کوئی تعلق نہ تھا جن پر پیغمبر آئے اور جن میں بے مثال دانشور وغیرہ پیدا ہوئے، نہ ان میں وہ لوگ ملتے تھے جنہیں اسلامی عہد میں عروج حاصل ہوا اور وہ اعلیٰ مراتب تک پہنچے۔ عیسائیوں نے ہر طرح سے یہودیوں کی تذلیل کی اور انہیں اچھوت قرار دے کر اپنے "صاف ستھرے" علاقوں سے باہر نکال دیا۔ اس کا ایک واضح نتیجہ ضرور نکلا کہ عیسائیوں سے الگ تھلگ رہنے والے یہودی "نئی تہذیب" کے اثرات سے بچے رہے اور اندر ہی اندر اپنے مذہب اور رسم و رواج پر کاربند رہے۔

یہ ایک طرح کا فرار بھی تھا جسے وہ دنیا کی رسوائیوں اور ذلتوں کے خلاف ڈھال بنا لیتے تھے اور عبادتوں اور ریاضتوں میں غرق ہو کر بھول جاتے کہ دنیا ان کے بارے میں کیا رائے رکھتی ہے۔ مذہب سے وابستگی نے ان کا حوصلہ بلند رکھا، اور ان کی بے رنگ بے کیف زندگی کو گوارا بنا دیا۔

یہودیوں اور غیر یہودیوں کے درمیان کھنچی ہوئی امتیازات کی دیوار جب گری تو یہودیوں سے گویا اچانک آسمان اٹھ گیا، اور انہیں نئے چیلنج درپیش ہوئے، اور اپنی قوم کو فنا ہونے سے بچانے کے لئے باصلاحیت یہودیوں کو اصلاحات کے لئے پروگرام کے ساتھ میدان میں آنا پڑا۔

ایک "اصلاح" تو یہ تھی کہ یہودیوں نے اپنی روایتی عیاری سے کام لیتے ہوئے عیسائی ذہنوں میں تشکیک اور الحاد کے بیج بوئے، یہاں تک کہ کلیسا کے خلاف بغاوت کا طوفان اٹھ کھڑا ہوا، اور کلیسا کے عہدے داروں کو سنجیدگی سے سوچنا پڑا کہ اس تمام شرارت کی جڑ

یہودی ہیں اور عیسائیت کی فلاح اسی میں ہے کہ یہودیوں کو نکال دیا جائے۔

رومن کیتھولک عقائد کے خلاف، احتجاج اور پھر بغاوت میں یہودیوں کا ہاتھ نمایاں تھا اور یہ تحریک رفتہ رفتہ پروٹسٹنٹ فرقے کی ابتداء بنی۔ خود لوتھر نے 1523ء میں یہودیوں کی ہمدردیاں حاصل کرنے کی کوشش کی کہ پروٹسٹنٹ ازم دراصل صحیح یہودیت کی طرف مراجعت ہے۔ لیکن یہودی عیسائیت کو ہر شکل میں "بیمار" قرار دیتے تھے، اور کسی کے ساتھ شامل نہ ہوئے۔ لوتھر نے یہودیوں کا انکار دیکھا تو دیوانہ وار ان کے خلاف ہو گیا۔ اس کے شور و غوغا کے باعث یہودیوں کو حقارت سے الگ کر کے عیسائی آبادی سے نکال دیا گیا۔

اٹھارویں صدی کے آخر اور انیسویں صدی کے شروع میں، یہودیوں کو ایک نیا نجات دہندہ مل گیا جس کا نام نپولین بوناپارٹ تھا۔ جس نے یہودی بستیوں کی دیواریں گرا دیں۔ انقلاب فرانس کے موقع پر فرانس میں تقریباً پچاس ہزار یہودی تھے۔ ان میں بڑے بڑے تاجر اور پیشہ ور لوگ تھے، لیکن عیسائی طبقوں میں ان سے نفرت بہرحال موجود تھی۔ سپین اور پرتگال سے آ کر بسنے والے یہودی علم و دانش میں باکمال تھے۔ اس لئے فرانسیسیوں نے انہیں سب سے پہلے برابری کا موقعہ دیا، اور پھر خاص جدوجہد کے بعد چند برس میں یہودیوں کو شہری حقوق مل گئے تاہم اندر ہی اندر یہودیوں کے خلاف لاوا پکتا رہا، اور رجعت پسند عناصر یہودیوں کو ملک بدر کرنے پر مصر رہے۔

نپولین کا خیال تھا کہ جب تک یہودی تنگ و تاریک بستیوں میں اچھوتوں کی طرح رہیں گے، فرانس ترقی یافتہ اور مہذب ملک نہیں کہلا سکتا۔ اس نے یہودیوں سے صاف صاف کہہ دیا کہ بطور فرانسیسی یہودیوں کو تمام مراعات حاصل رہیں گی، لیکن بطور یہودی انہیں کچھ نہیں ملے گا۔

1806ء میں نپولین نے یہودی اور دوسرے علماء کی کانفرنس طلب کی جس میں وہ معاملات طے کرنے کے لئے رکھے گئے جن میں مذہب اور ریاست کا تعلق غیر واضح تھا، مثلاً تعدد ازدواج، طلاق، عیسائیوں سے برتاؤ، یہودی مذہبی رہنماؤں کے اختیارات اور ملکی عدالتوں اور قوانین کی حیثیت۔ یہودیوں نے تمام معاملات میں ریاست کی برتری تسلیم کر لی،

سود سورن سرم سرزرپاہی اور یہودیوں کے لئے تمام ملازمتوں کے دروازے کھل گئے۔

امریکیوں نے انگریزوں کے خلاف جنگ تو جیت لی لیکن مالی حالات دگرگوں ہو گئے۔ یہودی سیاسی طور پر محفوظ ہو گئے مگر مالی لحاظ سے کنگال ہو گئے۔ جنگ آزادی کی انہیں بھاری قیمت ادا کرنا پڑی۔ امریکہ اب انگلستان کے زیر نگیں نہ تھا، جس کے نتیجے میں غیر ملکی مارکیٹیں ختم ہو گئیں۔ درآمد برآمد کی تجارت تقریباً صفر رہ گئی۔ اور بڑے بڑے یہودی ساہوکار دیوالیہ ہو گئے، کیونکہ غیر ملکی تجارت زیادہ تر ان کے پاس تھی۔ اب انہوں نے ملازمتوں کا رخ کیا یا سمور اور زمین کی خرید و فروخت پر توجہ دی۔ بہت کم یہودی پرچون فروش یا زراعت پیشہ تھے۔ اس کے ساتھ ساتھ، جرمن اور روسی یہودی بڑی تعداد میں امریکہ پہنچنے لگے۔

ان لوگوں کے اطوار اور طرز بود و باش پرانے یہودیوں سے یکسر مختلف تھے اور پرانے یہودی ذہنی اور ثقافتی لحاظ سے نئے آنے والوں سے برتر تھے۔ بہرحال اتنے وسیع ملک میں یہ لوگ آسانی سے کھپ گئے۔ پرانے یہودی مشرقی علاقوں میں آباد تھے۔ نئے آنے والے اندرون ملک یا مغرب کی طرف سفر کر گئے اور ان لوگوں نے نئے نئے شہر آباد کئے جہاں انہوں نے یہودی رسم و رواج اور روایات کو جاری کیا اور اپنی مخصوص عبادت کے لئے جماعت تیار کی۔ البتہ ان کے عقائد میں وہ سختی نہ رہ سکی جو یورپ میں تھی۔ ان کا مذہب صرف اتنا تھا کہ سور یا گھوڑے کا گوشت نہ کھایا جائے۔ باقی معاملات میں توریت کی تفسیری و تشریح یہ لوگ اپنی فطرت کے مطابق، حسب ضرورت خود ہی کر لیتے تھے! ان یہودیوں نے اتنی عیسائی عورتوں سے شادیاں کر لی تھیں کہ توریت کا یہ "حکم" کہ بچہ ماں سے پہچانا جائے گا، ترک کر دیا گیا۔ اس کے علاوہ حبشی عورتوں سے شادیوں میں بھی کمی نہ کی تھی، جن سے اولاد یہودیوں کے ترکے کی وارث تھی (اگرچہ مذہباً ایسا ممنوع تھا)

سپین اور پرتگال سے آنے والے یہودی، جرمنی اور روسی یہودیوں سے بالا خرمات کھا گئے، اور آنے والی تین دہائیوں میں ان کی برتری، بالکل ختم ہو گئی۔ وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ، جوں جوں جرمن اور روسی یہودیوں کی تعداد اور طاقت میں اضافہ ہوا، قدامت پسندی

واپس آ گئی، جبکہ سپین اور پرتگال کے یہودی عبادت کو ڈھکوسلا اور بکواس کہنے لگے۔

امریکی خانہ جنگی سے پہلے امریکی یہودیوں کے حالات خاصے دگرگوں تھے۔ 1840 سے 1880ء کے درمیان وقوع پذیر ہونے والی معاشرتی اور معاشی تبدیلیوں نے امریکہ اور امریکی یہودیوں دونوں پر گہرے اثرات مرتب کئے۔ اس دور میں امریکہ میں یہودی آبادی پچاس ہزار سے بڑھ کر ڈھائی لاکھ ہو گئی۔

اس کا بڑا سبب وہ لوگ تھے جو یورپ سے بھاگ کر امریکہ پہنچ رہے تھے۔ امریکہ کو افرادی قوت کی ضرورت تھی تاکہ زرعی معاشرے کو صنعتی معاشرہ بنایا جا سکے۔ عیسائی پناہ گزین عموماً زراعت پیشہ تھے۔ ان کے مقابلے میں یہودی "سرمایہ دار" تھے اور صنعتی میدان میں سرمایہ کاری کے لئے تیار تھے، اس وجہ سے امریکہ میں جہاں جہاں آباد ہوئے، شہری فرائض، بنکاری اور صنعت میں پیش پیش تھے۔ وہ محبت کے عادی تھے، سادہ زندگی گزارتے تھے اور سب سے بڑی بات یہ تھی کہ ہمیشہ سے "کنجوس" تھے اور روپیہ پس انداز کرنا خوب جانتے تھے۔

سب سے پہلے انہوں نے ٹھیلوں اور خچروں پر مال لاد کر بستی بستی، قریہ قریہ بیچنا شروع کیا۔ پھر "ڈیپارٹمنٹ سٹور" کا تصور بھی انہوں نے امریکہ کو دیا۔ ڈاک کے ذریعے خرید و فروخت قسطوں پر خریداری کے طریقے بھی انہی کی ایجاد تھے۔ اس کے علاوہ صنعت و حرفت میں بھی انہوں نے نئی نئی راہیں کھولیں، مثلاً پیتل یا تانبے کی کیلوں والی "ڈینم" پتلونیں یا "جینز" سب سے پہلے ایک یہودی لیوی سٹراس نے مزدوروں اور کسانوں کے لئے تیار کی اور آج تک مقبول چلی آ رہی ہے۔

خانہ جنگی کے بعد فولاد، تیل، ریلوے، جہاز رانی، کوئلہ اور کیمیادی مادوں میں بڑی بڑی کمپنیاں یہودیوں نے قائم کیں لیکن ان سب سے پسندیدہ میدان بنکاری اور پرچون فروشی تھا۔ انہوں نے خیراتی ادارے بھی قائم کئے اور فنون لطیفہ کو سرپرستی بھی کی۔ اسی طرح انہوں نے (عرب روایات کی پیروی کرتے ہوئے) علم و ادب اور سائنسی تحقیق میں بھی دل کھول کر حصہ لیا۔

یہودی اس دور میں امریکی تمدن میں پوری طرح جذب ہو گئے یہ لوگ خاصے مہذب، متمول اور علم پرور ثابت ہوئے۔ ان کی زندگی آسائش سے گزرتی تھی۔ کام کاج کے لئے نوکر تھے اور رہنے کو بڑے بڑے بنگلے۔ امریکہ میں اب ان سے کوئی مذہبی یا نسلی امتیاز نہیں برتا جاتا تھا۔ جس پیشے یا ملازمت کے اہل ہوتے کسی رکاوٹ کے بغیر اسے اختیار کر سکتے تھے۔

خانہ جنگی کے دوران اور بعد میں، سیاسی معاملات میں یہودی اختلاف رائے رکھتے تھے۔ جو یہودی جنوب کی ریاستوں میں آباد تھے وہ فطری طور پر الگ ملک چاہتے تھے۔ شمال میں رہنے والے یہودی امریکہ کو ایک ملک دیکھنا چاہتے تھے۔ ایک وقت ایسا آیا کہ 1862ء میں جنرل گرانٹ نے عیسائی دباؤ کے تحت یہودیوں کو چوبیس گھنٹے کے اندر اندر تمام علاقے خالی کرنے کا حکم دے دیا! لیکن صدر امریکہ ابراہم لنکن کو اس حکم کا علم ہوا تو اس نے اسے منسوخ کر دیا۔

ایک بات خاصی حیرت کا باعث ہے کہ اگرچہ یہودی علم و ادب وغیرہ کی سرپرستی کرتے تھے، تاہم خود اس معاملے میں خاصے بانجھ تھے اور ان میں محقق، دانشور، سیاست دان یا سائنسدان شاذو نادر ہی پیدا ہوئے۔ مذہب سے ان کا تعلق بھی رفتہ رفتہ تحلیل ہو گیا۔ انیسویں صدی میں مذہب کے خلاف ویسے ہی بغاوت کے رجحانات پیدا ہو رہے تھے۔ اور سائنس اس کی سب سے بڑی حریف تھی۔

1859ء میں چارلس ڈارون نے اپنی مشہور زمانہ تصنیف "انواع کے آغاز کے بارے میں" (On the Origin of Species) شائع کی جس سے انسانی تخلیق کے قدیم اور اسطوری نظریے کو شدید زک پہنچی۔ عیسائی حلقوں میں اس بات پر بہت بحث چل نکلی کہ انجیل واقعی خدا کا کلام ہے یا نہیں؟ اور توریت کو حضرت موسیٰؑ نے لکھا تھا یا کسی نے؟ یہودی بھی اس رو میں بہنے لگے، لیکن اس میں چند مصلح ایسے پیدا ہوئے جنہوں نے اپنی قوم کو بتایا کہ سائنس اپنی جگہ، لیکن کسی کو یہ حق نہیں پہنچتا کہ وہ آسمانی صحیفوں سے مذاق کرے یا ان کا مذاق اڑائے۔

انہوں نے محض عقل پر انحصار کو لغو قرار دیا اور بتایا کہ توریت خدا کا کلام ہونے کی وجہ سے

تمام انسانی ضرورتوں کو پورا کرتی ہے۔ (اگرچہ ہماری نظر میں وہ تحریف شدہ ہے)۔ بہرحال چند مذہب پرست یہودیوں نے سائنس کی یلغار کا مقابلہ کیا اور امریکی "روشن خیالوں" کو جو سائنسی دریافتوں کی وجہ سے مذہب سے برگشتہ ہو رہے تھے، جتلا دیا کہ مذہب کی ضرورت ہمیشہ رہے گی، اور محض عقل سے انسانی فلاح و بہبود کا کامل حصول ناممکن ہے۔

یہ وہ زمانہ ہے کہ روسی یہودیوں نے امریکہ کو اپنی آماجگاہ بنایا اور پہلے سے بسنے والے ڈھائی لاکھ یہودیوں کے مقابلے میں تیس لاکھ روسی یہودی امریکہ میں وارد ہو گئے۔

عجیب بات یہ ہے کہ 1700ء تک روسی یہودیوں نے کوئی قابل ذکر کارنامہ سرانجام دیا نہ ان میں کوئی اہم ہستی پیدا ہوئی، لیکن بعد کی تین صدیوں میں ان میں وائزمین، جو اسرائیل کا صدر بنا، بن گورین (جو اسرائیل کا وزیر اعظم رہا) ٹراٹسکی وغیرہ پیدا ہوئے، اور جب یہ یہودی انیسویں صدی کے آخر میں امریکہ میں پہنچے تو وہاں "روشن خیالی" کا ایک نیا دور شروع ہوا۔

روس میں بسنے والے یہودیوں نے ایسے رسم و رواج "ایجاد" کئے جن کا تعلق توریت سے قطعاً نہ تھا۔ توریت کی پانچ کتابوں میں 613 احکام میں سے 265 "نہی عن المنکر" پر مبنی ہیں (جیسے کہ "کسی کی جان نہ لو")، باقی 348 "امر بالمعروف" کے بارے میں ہیں (جیسے کہ "اپنے والدین کی عزت کرو")، لیکن روسی یہودیوں نے ان 613 احکام سے ہزاروں احکام بنا لئے جن کا کوئی تعلق توریت سے نہ تھا بلکہ وہ مضحکہ خیز اور لغو نظر آتے ہیں۔ مثلاً توریت ماتم کرنے کے بارے میں زیادہ نہیں کہتی، لیکن نئے احکام میں درج تھا کہ ماتم کرنے والے پہلے تین دن کسی سے بات کریں گے نہ ان سے کوئی بات کرے گا۔ چوتھے سے ساتویں دن تک کسی کو سلام نہیں کریں گے، مگر سلام کا جواب دے سکیں گے۔

آٹھویں سے تیرھویں دن تک سلام کریں گے، مگر جواب نہیں دیں گے سوگ منانے والے ایک سال تک اپنے بال نہیں تراشیں گے نہ ایک ماہ تک غسل کریں گے نہ اپنے ہاتھ پاؤں گرم پانی سے دھوئیں گے۔ ان "احکام" کا توریت میں کہیں ذکر نہیں، لیکن یہودی مذہبی رہنما انہیں "آسمانی" احکام قرار دیتے رہے۔

روس میں رہتے ہوئے ان یہودیوں پر موت و حیات کے کئی دور آئے کبھی انہیں پابند

سلاسل کیا گیا، کبھی جلا وطن ہوئے اور کبھی تمام شہری حقوق حاصل ہو گئے۔ کبھی تلوا بل پر ان کی داڑھیاں صاف کی گئیں اور عبائیں چھوٹی کر دی گئیں۔ کبھی قلم کے زور پر انہیں "تعلیم یافتہ" اور "مہذب" شہری بنانے کی کوشش کی گئی۔ زار الیگزینڈر ثانی (دور حکومت 1855ء - 1881ء) اور زار الیگزینڈر ثالث (دور حکومت 1881ء - 1894ء) کے عہد میں قوم اور نسل پرستی انتہا کو پہنچ گئی اور روس نے مغربی ممالک سے تعلقات رکھنے کے بجائے، مشرق میں اپنے "قومی ورثے" کی تلاش شروع کی، ان کا نعرہ تھا "ایک مذہب، ایک زار، ایک وطن!"

اس نعرے کے نتیجے میں روسی یہودیوں پر ایک بار پھر ظلم و ستم شروع ہو گیا اور انہیں نہ صرف ملازمتوں وغیرہ سے بے دخل کیا گیا بلکہ ملک سے نکالنے کی پر زور کوششیں کی گئیں۔ زار نکولاس ثانی (دور حکومت 1894ء - 1917) کا عہد روسیوں کے لئے بالعموم، اور روسی یہودیوں کے لئے بالخصوص، تباہ کن ثابت ہوا، اس غلط پالیسی کے نتیجے میں روس میں بالشویک انقلاب اور کمیونزم کی جڑیں مضبوط ہوئیں۔ اس انقلاب کے بعد روسی یہودی دو گروہوں میں بٹ گئے۔

ایک گروہ نے یہودیت (بلکہ صیہونیت) کو اپنایا اور "اسرائیلی ریاست" کے لئے جدوجہد شروع کی۔ دوسرے گروہ نے یہودیت کو ترک کر کے اشتراکیت کو اپنا لیا، اور یہودیوں کے ایک طبقے کو اس نئی اور آمرانہ "غلام ساز ریاست" کے پنجے میں جکڑ دیا۔

اس کا احساس ان یہودیوں کو بہت دیر سے ہوا کہ انہوں نے اشتراکیت کو تو مضبوط کیا لیکن اشتراکیوں نے اپنی مذہب دشمنی کی بنا پر انہیں تباہ کر دیا (جیسا کہ اب اس صدی میں، بعض مسلمان قومیتوں اور افراد کا حشر ہوا ہے)

1881ء میں یہودیوں کے روس سے فرار کا آغاز ہوا۔ اور پھر سیلاب آگیا۔ یہ لوگ فرداً فرداً نہیں، بلکہ اجتماعی طور پر روس سے فرار ہوئے۔ نہ صرف خاندان کے خاندان بلکہ گاؤں کے گاؤں ملک چھوڑ گئے اور اگلے بیس برسوں میں 35 ہزار افراد سالانہ کے حساب سے امریکہ پہنچتے رہے۔ 1918ء تک امریکہ میں 25 لاکھ روسی یہودی پہنچ چکے تھے جرمن یہودی جو

امریکہ میں پہلے سے آباد تھے اور اب زبان [illegible] و باش کے لحاظ سے "امریکی" بن چکے تھے، نئے آنے والوں سے تعداد میں کہیں کم تھے اور ان بھوکے ننگے اور تباہ حال یہودیوں کو دیکھ دیکھ کر حیران ہو رہے تھے۔

روسی یہودی خود اپنی جگہ پر ان ہم مذہبوں سے مل کر تذبذب میں تھے کہ یہ "اصلی" یہودی ہیں یا "کافر" ہو چکے ہیں؟ خوش حال اور قدیم یہودیوں کو یہ خطرہ تھا کہ نئے آنے والے کئی مسائل پیدا کریں گے، پرانی تنگ و تاریک بستیاں بسائیں گے۔ تعلیم و معاش میں مشکلات حائل ہوں گی۔

روسی یہودی انیسویں اور بیسویں صدی میں، پندرھویں اور سولھویں صدی کی تہذیب اور روایات لے کر امریکہ میں وارد ہوئے تھے۔ یہ روشن خیالی کے نام سے نا آشنا تھے اور "جمہوریت"، "ووٹ" اور "انسانی حقوق" جیسی اصطلاحات ان کے لئے یکسر اجنبی تھیں لیکن ان لوگوں نے جلد ہی اپنے آپ کو امریکی تمدن سے روشناس کرانا شروع کر دیا، اور کسی مدد کے بغیر تلاش معاش میں نکل کھڑے ہوئے روسی جبر و استبداد نے ان کی جو صلاحیتیں مفلوج کر دی تھیں وہ پھر صحت یاب اور توانا ہو گئیں۔

ان لوگوں نے ترقی کا گر تعلیم میں پالیا اور دھڑا دھڑ کالجوں اور یونیورسٹیوں میں داخل ہونے لگے اگرچہ ان کی تعداد ساڑھے آٹھ فیصد تھی، اور پیشہ ورانہ اداروں مثلاً طب، قانون، فارمیسی، دندان سازی وغیرہ) میں ان کی تعداد 13 سے 18 فیصد تھی۔

ان میں کوئی بھکاری تھا نہ جرائم پیشہ۔ یہ لوگ شراب خانوں میں جاتے نہ جوا خانوں میں، بلکہ گھروں میں شطرنج کھیلتے یا سیر و تفریح کرتے۔ صرف مزدور طبقے میں اشتراکی خیالات پروان چڑھ رہے تھے، جو اشتراکی اخبارات پڑھتے، ٹریڈ یونینوں میں بڑھ چڑھ کر حصہ لیتے اور اپنے مذہب سے بیزاری کا اظہار کرتے۔ اس کا بڑا سبب ان کی غربت اور گھٹیا علاقوں میں سکونت تھا، لیکن جمہوری ادارے اتنے توانا تھے کہ یہ لوگ اشتراکیت کو ترک کرنے پر مجبور ہو گئے اور اس طرح اشتراکی تحریک اپنی موت آپ مر گئی، اور رفتہ رفتہ "امریکی یہودی" نے جنم لیا، جس کے نزدیک نسلی اور عصبی تعلق بے معنی تھا اور امریکی ورثہ اہمیت رکھتا تھا۔

اسرائیل اور "عبرانی" کی اصطلاحات ختم ہو گئیں اور صرف "یہودی" باقی رہ گئی۔ قدامت پسند یہودی سبت کے دن کار چلانا، بجلی جلانا یا فون کرنا تک "حرام" سمجھتے تھے، کیونکہ سب "کام" تھے۔۔ اور سبت کے دن کام حرام ہے۔ امریکہ میں ان تمام باتوں کو کام کے بجائے "تفریح" قرار دیا گیا اور جو بات پہلے حرام تھی اب وہ فرض شمار ہونے لگی، کیونکہ خدا نے سبت کو آرام اور تفریح کا حکم دیا ہے"!

1921ء میں امریکہ میں پناہ ڈھونڈنے والوں پر پابندی لگا دی گئی اور 1924 میں یہ قانون نافذ ہو گیا کہ کسی سال میں پناہ گزینوں کی کل تعداد ایک لاکھ چونسٹھ ہزار سے زیادہ نہ ہو گی۔ صرف تین دفعہ اس قانون سے صرف نظر کیا گیا، پہلی بار 1933 سے 1939 کے درمیان، جب ہٹلر کی زیادتیوں سے گھبرا کر بھاگنے والے ایک لاکھ ستاون ہزار یہودیوں کو پناہ دی گئی۔ (ان میں آئن سٹائن جیسے کئی قابل لوگ تھے جنہوں نے کئی نوبل پرائز حاصل کیے)۔

دوسری بار 1944ء سے 1959ء کے درمیان اجازت دی گئی تاکہ یورپ اور جنگ میں دوسرے تباہ شدہ علاقوں سے ایک لاکھ بانوے ہزار یہودی کھپائے جا سکیں اور تیسری بار 1960ء اور 1970ء کے درمیان کیوبا اور عرب ممالک سے آنے والے تہتر ہزار یہودیوں کو بسانے کے لئے قانون میں نرمی پیدا کی گئی۔

1880ء میں امریکہ میں 270 یہودی معبد تھے جو دوسری جنگ عظیم میں بڑھ کر 3700 ہو گئے۔ معبدوں کی تعداد میں اضافے سے یہ ثابت نہیں ہوتا کہ یہودی زیادہ مذہب پسند اور خدا پرست ہو گئے تھے، بلکہ یہ کہنا مناسب ہو گا کہ جوں جوں عبادت گاہوں کی تعداد بڑھتی گئی، توں توں مذہب سے دوری ہوتی گئی! دوسری جنگ عظیم کے وقت امریکہ میں چالیس لاکھ یہودی آباد ہو چکے تھے۔ جن کی اکثریت کے نزدیک معبد وہ قبرستان تھے جن میں عبادتیں دفن تھیں اور کسی کو روح کی ظلمات دور کرنے سے غرض تھی نہ اس کی پروا اور فرصت، کیونکہ معاشی، معاشرتی اور تمدنی حالات اتنے تیز رفتار تھے کہ یہودیت ان کا ساتھ دینے سے قاصر تھی۔

یہ وہ دور ہے جس میں جدید سیاسی صیہونیت نے جنم لیا۔ 1897ء میں سوئٹزرلینڈ کے شہر

باسل میں پہلی صیہونی کانگرس کا اجلاس ہوا جس کی صدارت تھیوڈور ہرزل نے کی جو اس نظریے کا بانی تھا۔ اس کانگرس سے نصف صدی پہلے، صیہونی نظریہ پیدا ہو چکا تھا، لیکن اس کا کوئی مقصد تھا نہ نصب العین۔ ہرزل نے پہلی دفعہ "یہودی ریاست" کا تصور پیش کیا۔ اس تصور کے خالق تین اسباب تھے۔

نچلے طبقے کے یہودیوں میں فکری، انقلاب، یورپ میں قوم پرستی کا نیا تصور اور مغربی تہذیب میں یہودیوں سے نفرت کی تحریک، مذہبی اصطلاح میں صیہونیت اتنی ہی پرانی ہے جتنی یہودیوں کی تاریخ۔ بنی اسرائیل کے تمام انبیاء نے اپنی قوم کی بار بار جلاوطنی اور "واپسی" کا ذکر کیا اور انہیں اپنی وطن "صیہون" میں آباد ہونے کی بشارت دی۔ آخری بار 70ء عیسوی میں یہودیوں کو یروشلم سے دیس نکالا ملا، اور انہیں توقع تھی کہ ایک بار پھر کوئی "نجات دہندہ" آئے گا اور انہیں واپس یروشلم لے جائے گا، لیکن اس مرتبہ انہیں تقریباً دو ہزار سال انتظار کرنا پڑا۔ جب وہ اس نجات دہندہ کی آمد سے مایوس ہو گئے تو انہوں نے معاملات خود "سلجھانے" کا فیصلہ کیا۔

یوں ہرزل نے صیہونیت کو ڈرائینگ روم کی نظریاتی بحثوں سے نکال کر، سیاسی میدان میں لا ڈالا۔ اس شخص کو یہودیت کی ابجد کا بھی علم نہ تھا، لیکن قدرت نے اسے یہودیوں کا لیڈر بنا دیا۔ اپنی کتاب "یہودی ریاست" میں اس نے بڑی تفصیل سے مزعومہ ریاست کا نقشہ کھینچا اور جھنڈے تک کا ڈیزائن درج کر دیا! لوگوں نے اس کا خاصا مذاق اڑایا، لیکن وہ اس کی توقع رکھتا تھا اور اپنے ارادوں سے باز نہ آیا۔

اس نے یہودیوں کو عزلت، ذلت اور مسکنت سے نکال کر دوبارہ معزز اور جنگجو قوم بنانے کی پوری سعی۔ دراصل موجودہ سیاسی صیہونیت کا بانی یہی شخص ہے۔

اس کی موت اور پہلی جنگ عظیم نے یہودیوں کی امیدوں پر اوس ڈال دی، لیکن پھر انہیں دو حامی مل گئے، ایک یہودی کائم وائز مین اور دوسرا انگریز عیسائی وزیر اعظم ڈیوڈ لائڈ جارج دونوں کا مرکز نگاہ خطہ فلسطین ٹھہرا، اور دونوں کی ملی بھگت سے "اعلان بالفور" ظہور میں آیا جس نے فلسطین کو یہودیوں کی جھولی میں ڈال دیا۔

وائز مین 1874ء میں پیدا ہوا، جرمنی اور سوئٹزرلینڈ میں تعلیم پائی اور 1904ء میں مانچسٹر یونیورسٹی میں حیاتیاتی کیمیا کیمپ کا لیکچرار ہو گیا۔ 1914ء میں وہ صیہونی تحریک کا رکن بنا جس کے انگلستان میں صرف آٹھ ہزار اور امریکہ میں بارہ ہزار ارکان تھے۔ لائڈ جارج عیسائیوں سے زیادہ یہودیوں کا ہمدرد تھا۔ اس نے یہ عہد کر لیا کہ فلسطین کو ترکوں سے چھین کر یہودی ریاست بنا دیا جائے گا۔

مسلمانوں (بالخصوص عربوں) کی بدقسمتی حالات ان کے خلاف تھے اور پوری کی پوری برطانوی کابینہ درپردہ یہودی ذہن رکھتی تھی، یا عربوں کی دشمن تھی۔ 2 نومبر 1917ء کو "اعلان بالفور" دیکھ کر وائز مین نے کہا تھا۔ "میں یہودیوں کے نجات دہندہ کو دیکھ رہا ہوں" لیکن اس کی بدقسمتی کہ اختیار اور سیاسی رہنمائی اس سے چھن گئی۔

امریکی صیہونی اس سے زیادہ تیز نکلے۔ انہوں نے ایک روسی یہودی بن گوریان کو جو زیادہ جوشیلا اور متعصب تھا، اپنا "ہیرو" قرار دیا۔ یہ شخص روس سے فرار ہو کر 1906ء میں فلسطین پہنچ گیا، جہاں اس نے مارکسی بن کر مزدور تحریک کی بنیاد ڈالی اور حکم دیا کہ سب لوگ صرف عبرانی میں بات کریں گے۔ بن گوریان نے یہودیوں کو منظم کیا۔ ایسی پارٹی کی بنیاد رکھی جو آزادی کے وقت اختیارات سنبھالنے کو بالکل تیار ہو، دنیا بھر کے یہودیوں کو فلسطین میں آباد ہونے کی کھلی دعوت دی، یہودی فوج تیار کی اور ہر طرح سے یہودی ریاست قائم کرنے کی تیاریاں مکمل کر لیں۔

امریکی یہودیوں نے ابتداء میں "صیہونی تحریک" کا مذاق اڑایا اور اسے "خلل دماغ" قرار دیا، لیکن 1897ء تک کم از کم پانچ ہزار یہودی سنجیدگی سے اس نظریئے کے حامی ہو گئے لطف کی بات یہ ہے کہ اسی سال یہودیوں کی مذہبی رہنماؤں کی مرکزی تنظیم نے صیہونیت کی پرزور مذمت کی اور اس کے خلاف قرارداد پاس کی۔ ترقی پسند یہودی بھی اس تحریک کے خلاف تھے اور اسے رجعت پسندانہ کہتے تھے، لیکن ہٹلر کی یہودیوں کے خلاف کارروائی دیکھ کر یہ لوگ بالآخر صیہونیت کے حامی بن گئے۔ ان لوگوں کے دباؤ میں آ کر امریکی صدر ہیری ٹرومین نے سب سے پہلے "اسرائیل" کو نئی مملکت کے طور پر تسلیم کیا

صیہونیت جیت چکی تھی، اور اس نے دربدر پھرنے والے بے گھر اور بے یار و مددگار یہودیوں کو ایک مستقل وطن دے دیا تھا، جہاں یہ یہودی حاکم تھے، محکوم اور مظلوم نہیں، صیہونیت نے یہودیوں کو ان کا ماضی واپس دلا دیا تھا۔ عام طور پر یہودی انجمنیں اور افراد مذہبی، روحانی اور جذباتی لحاظ سے اسرائیل کے حامی تھے، لیکن امریکی یہودی، انسانی اور انصاف پسندانہ قدروں کی برتری چاہتے ہوئے اسرائیل کے حامی تھے، حالانکہ کسی امریکی یہودی کا فلسطین (یا اسرائیل) جا کر آباد ہونے کا کوئی ارادہ نہ تھا۔ اسرائیل کے قیام نے امریکی یہودیوں کے ساتھ باقی یہودیوں کے تمام اختلافات ختم کر دیئے اور ان کے مسائل حل کر کے انہیں متحد کر دیا۔

یورپی یہودیوں کے لئے اسرائیل ملجا اور مائن تھا، لیکن امریکی یہودیوں کے لئے اس سے محض جذباتی لگاؤ تھا۔ بہرحال اس سے تمام یہودیوں میں اتحاد کی فضا پیدا ہو گئی، جس میں ہر رنگ اور ہر طرز فکر کے یہودی شریک تھے امریکی یہودیوں نے عیسائی حلقوں کو بھی اپنے پروپیگنڈے سے متاثر کیا اور سیاسی فضا عربوں کے خلاف ہموار کرنے میں اہم کردار ادا کیا۔ یہی وجہ ہے کہ اب تک امریکہ کسی ایسی پالیسی کو اختیار کرنے پر آمادہ نہیں جو یہودیوں کے مفاد کو زک پہنچاتی ہو یا مشرق وسطیٰ میں پائیدار امن کی ضمانت دیتی ہو۔

1654ء میں "نیو ایمسٹرڈیم" میں پہنچنے والے 23 یہودی اب ساٹھ لاکھ سے اوپر ہو چکے ہیں، یہ تعداد کسی بھی ملک سے زیادہ ہے، اور اپنی ثروت، طاقت اور دباؤ کی وجہ سے ساری عالمی یہودیت کا مرکز ہے۔ انہی کے دباؤ کے باعث اسرائیل وجود میں آیا، اور ان ہی کی مالی اور اخلاقی امداد نے اسرائیل کو مضبوط بنایا۔ خود (عیسائی) امریکی حکومت پر یہودیوں کا بے پناہ اثر ہے اور اسی وجہ سے اسرائیل کو من مانی کرنے کا موقعہ مل رہا ہے۔

امریکہ کی چودہ پندرہ کروڑ کی آبادی میں ساٹھ لاکھ یہودی خاصی، حقیر اقلیت ہیں، لیکن دنیا میں شاید ہی کوئی اقلیت ایسی ہو جو پوری قوم کے معاشی، سیاسی اور معاشرتی حالات کو اپنے سانچے میں ڈھالنے کی طاقت رکھتی ہو۔ اس اقلیت کی مادی طاقت کا اندازہ اس سے لگایئے کہ جہاں اکثریت کے 19 فیصد لوگ ایسے ہیں جو دس ہزار ڈالر سالانہ کماتے ہیں، وہاں یہودیوں

میں یہ تعداد 33 فی صد ہے۔

اسی طرح تعلیمی اداروں میں ان کی تعداد، آبادی کے تناسب سے تین گنا ہے۔ قانون، طب، سیاست، سائنس، موسیقی، فنون لطیفہ، مصوری، ادب غرضیکہ ہر میدان میں یہودی نمایاں ہیں۔ سپریم کورٹ کے بعض جج یہودی ہیں، کئی گورنر سینیٹر یہودی ہیں، وزارت میں کئی یہودی ہیں۔ اس کے علاوہ کئی یہودیوں نے نوبل پرائز حاصل کیا ہے۔ کئی فلمساز، موسیقار، سنگ تراش وغیرہ یہودی ہیں۔

امریکی یہودیوں اور امریکی یہودیت کا مستقبل کیا ہے؟ کیا کوئی مورخ ماضی کی بنا پر مستقبل میں پیش آنے والے واقعات کی پیش گوئی کر سکتا ہے؟ سائنس دان تو ایسا کرتے رہے ہیں لیکن بعض تاریخ دان بھی "ماورائے تاریخ" میں جھانک کر ماضی کی تہذیبوں کے گہرے مطالعے کے بعد مستقبل کی تہذیبوں کے بارے میں نظریات پیش کرتے رہے ہیں۔ مثلاً 1918ء میں اوسوالڈ سپینگلر نے اپنی کتاب "مغرب کا زوال" میں یہ پیش گوئی کی تھی کہ مغربی تہذیب زوال پذیر ہے، جبکہ چینی اور روسی تہذیبیں ترقی کر رہی ہیں۔ اس وقت سپینگلر کا مذاق اڑایا گیا، لیکن اب اس کے نظریات پر سنجیدگی سے غور کیا جا رہا ہے۔

اگر ماضی کے ان واقعات اور تاریخ میں یہودیوں کے مشکوک اور سازشی کردار کو مدنظر رکھا جائے تو ان کا مستقبل زیادہ روشن نظر نہیں آتا۔ اسرائیل کی جغرافیائی حیثیت اور شرق اوسط میں اس کا ناروا سیاسی کردار، یہودیوں کو زیادہ پائداری اور استحکام کی نوید نہیں دیتا۔ اس کے علاوہ اس خلائی دور میں سرحدیں مٹتی نظر آتی ہیں۔

جدید اسرائیل ایک دوراہے پر کھڑا ہے۔ نہ یہ قدامت پسند بن سکتا ہے، نہ اس دور کا نیشنلزم اختیار کر سکتا ہے۔ اسرائیل 75 فیصد قوانین برطانوی قانون پر مبنی ہیں۔ بیس فیصد تالمود سے اخذ کردہ ہیں اور باقی پانچ فیصد اسلامی اور ترک قوانین سے لئے گئے ہیں۔ اسی سے نظر آتا ہے کہ خود یہودیوں کے نزدیک توریت اور تالمود اس دور کے تقاضے پورے کرنے سے قاصر ہیں۔

امریکہ میں ویسے ہی توریت اور تالمود خارج از عمل ہو چکے ہیں۔ اگر (بقول سپینگلر) مغربی

تہذیب زوال آمادہ ہے تو امریکی یہودیوں کا کیا بنے گا؟ کیا ان کا وہی حشر ہو گا جو اسلامی سلطنت کے ختم ہونے پر یہودیوں کا ہوا تھا؟ کیا یہ لوگ پھر منتشر ہو جائیں گے اور نئی ابھرتی ہوئی چینی اور روسی تہذیبوں میں ضم ہو جائیں گے؟

چینی اور روسی تہذیبیں اشتراکی تہذیبیں ہیں۔ روس نے ابتداء میں یہودیوں سے برابری کا سلوک کیا اور اسرائیل کو تسلیم کرنے والا دوسرا ملک تھا، لیکن بعد میں اس نے اپنی پالیسی پر نظرثانی کی۔ علاوہ ازیں کیونزم کسی "مذہبی ریاست" کی حمایت نہیں کر سکتا۔ یہی حال چین کا ہے، لیکن ممکن ہے کہ روس دشمنی میں آ کر چین یہودیوں کا "دوست" بن جائے۔ بہرحال قرائن سے نظر آتا ہے کہ بالآخر امریکہ ہی یہودیوں اور یہودیت کا مسکن اور مامن بنے گا۔ چار ہزار سالہ پرانی قوم اچانک تو شاید فنا نہ ہو سکے کیونکہ یہ انسانی تاریخ اور انسان کے اخلاقی اور تہذیبی ارتقاء کی داستان کا جزو ہے، لیکن اگر کوئی "نجات دہندہ" آنے والا ہے تو وہ اس دھارے کا رخ ضرور موڑ دے گا۔

امریکہ میں یہودیوں کی جدید تاریخ کا آغاز کرسٹوفر کولمبس سے ہوتا ہے۔ 2 اگست 1942ء کو سپین سے تین لاکھ یہودیوں کو جلا وطن کیا گیا اور اس سے دوسرے ہی دن یعنی 3 اگست کو کولمبس یہودیوں کے ایک گروہ کے ساتھ مغرب کی جانب روانہ ہو گیا۔ کولمبس خود کہتا ہے کہ یہودیوں سے اس کا بہت میل جول تھا۔ نئی سرزمین کی دریافت کے بعد اس نے جو پہلا خط لکھا وہ ایک یہودی کے نام تھا۔ فی الحقیقت اس کے بحری سفر کے لئے اخراجات کا انتظام بھی یہودیوں نے ہی کیا تھا۔ ملکہ ازبیلا کے جواہرات فروخت کر کے اس بحری سفر کے اخراجات برداشت کرنے کی روایت محض افسانہ ہے۔

دربار سپین میں تین یہودیوں کا بہت اثر تھا۔ انہوں نے ملکہ ازبیلا کو طرح طرح کے سبز باغ دکھائے انڈیز کی دریافت سے بہت سا سونا ہاتھ لگے گا۔ ملکہ نے اپنے جواہرات کی پیش کش ضرور کی مگر ان تینوں یہودیوں میں سے ایک نے اپنی طرف سے کئی ہزار پاؤنڈ کی پیش کش کر دی۔ اس بحری سفر میں کولمبس کے ساتھ کم از کم پانچ یہودی تھے۔ پہلا شخص جو ساحل پر اترا وہ ایک یہودی تھا۔ اسی نے تمباکو کا استعمال دریافت کیا۔ وہ کیوبا میں آباد ہوا اور اسی کی

جہ سے آج تمباکو کا سارا کاروبار یہودیوں کے قبضے میں ہے۔

شروع سے ہی یہودیوں نے امریکہ کو ارض موعود سمجھنا شروع کر دیا ہے۔ پہلے برازیل میں آباد ہوئے۔ لیکن بعد میں انہوں نے نیویارک کا رخ کیا جو ان دنوں ایک ولندیزی بستی تھی۔ گورنر کو ان کا وہاں آباد ہونا پسند نہ تھا۔ مگر ڈائرکٹروں نے اس بناء پر اس کی حمایت کی کہ انہوں نے کمپنی کے حصوں میں بہت سی رقم لگائی ہے پھر بھی انہیں پرچون کی دوکانیں کھولنے اور سرکاری ملازمتیں اختیار کرنے سے روک دیا گیا۔ مگر اس کا یہ نتیجہ نکلا کہ وہ غیر ملکی تجارت پہ چھا گئے۔ یہودیوں کی یہ عادت ہے کہ جب انہیں کسی ایک طرف سے روکا جاتا تو وہ دوسری طرف راستہ بنا لیتے ہیں۔ مثلاً جب انہیں نئے کپڑوں کی تجارت سے روکا گیا تو انہوں نے پرانے کپڑوں کا کاروبار شروع کر دیا۔ جب انہیں تجارتی سامان سے روکا گیا تو انہوں نے ردی کا کام شروع کر دیا۔

(1920ء) نیویارک دنیا کی یہودی آبادی کا بہت بڑا مرکز تھا۔ یہ وہ دروازہ ہے جہاں سے امریکہ کی ساری درآمدی تجارت گزرتی ہے۔ اس شہر کی ساری زمین یہودیوں کی ملکیت ہے۔ یہی وجہ ہے کہ یہودی امریکہ کو ارض موعود سمجھتے ہیں اور نیویارک کو نیا یروشلم۔ جارج واشنگٹن کے زمانے میں امریکہ کے اندر چار ہزار یہودی تھے۔ جن میں بیشتر متمول تاجر تھے۔ پچاس سال کے اندر یہودیوں کی تعداد تینتیس لاکھ ہو چکی تھی۔ آج کل نیویارک میں تجارت کے ساتھ تھیٹر، ڈرامہ دکھانا، بنکنگ پر بھی یہودی قابض ہیں۔ امریکی زندگی کے ہر شعبے میں یہودی پروپیگنڈا کار فرما ہے۔ کبھی تجارتی اشتہارات کی صورت میں اور کبھی براہ راست سیاسی ہدایات کی صورت ہیں۔ علاوہ ازیں فلمسازی، شکر سازی، تمباکو، گوشت ڈبوں میں بند کرنا، جوتے بنانا، زیورات، اناج، کپاس، تیل، لوہا، رسالے شائع کرنا، خبریں تقسیم کرنا، شراب کا کاروبار، قرضے دینے کا کاروبار یہ بھی بہت حد تک یہودیوں کے قبضے میں ہے۔ امریکن حیران ہیں کہ بیرونی ممالک میں جن اشخاص کو ہماری تجارت کے نمائندے سمجھا جاتا ہے ان سارے کی سارے یہودی ہیں۔ اس سے یہ بات واضح ہو جائے گی کہ جن تجارتی ہتھکنڈوں کی وجہ سے امریکی دنیا میں بدنام ہیں۔ ان کے اصل ذمہ دار کون ہیں۔

کہا جاتا ہے کہ امریکہ کا یہودی بہت خوشحال ہے۔ دراصل خوشحالی ثمرہ ہے محنت اور دور بینی کا۔ مگر یہود کی خوشحالی کا سبب یہ ہے کہ وہ کاروبار پر کنٹرول حاصل کر لیتے ہیں۔ وہ اپنے ملی تعصبات کے باعث مل کر کسی مقصد کے لئے سازش تیار کرتے ہیں۔ غیر یہود کو اس بات سے کچھ غرض نہیں کہ اس کا ساتھی کون ہے۔ مگر یہودی کے لئے یہ سب کچھ ہے کہ اس کے ساتھ والا یہودی ہے۔ امریکہ سے پہلے سپین، وینس، جرمنی اور برطانیہ یہودیوں کے ان ہتھکنڈوں کی وجہ سے رسوائی کما چکے ہیں اور آج امریکہ عالمی سطح پر رسوا ہو رہا ہے۔

صیہونیت

قدیم یروشلم میں صیہون نامی ایک پہاڑی ہے جسے یہودی مقدس سمجھتے ہیں۔ کیونکہ ان کے عقائد کے مطابق حضرت داؤد علیہ السلام نے وہاں ایک عبادت گاہ تعمیر کی تھی اکابر یہود نے اس صورت حال سے فائدہ اٹھاتے ہوئے یہودی ریاست کے قیام کے لئے صیہون ہی کو بطور علامت اپنا لیا اور اسی سے تحریک صیہونیت نے جنم لیا۔

یہودیوں کی دوسری علامت اژدہا ہے جس کا ذکر تیسرے صیہونی منشور کے آغاز میں ہے۔ اہل یہود اس علامت کو اپنی قوم سے تعبیر کرتے ہیں اور اقوام عالم کو اس کے حلقے میں جکڑ لینا چاہتے ہیں۔ وہ اپنے اس ناپاک مقصد میں اقوام متحدہ کے ادارہ کے ذریعہ کامیابی سے ہمکنار بھی ہو چکے ہیں۔ عالم اسلام بالخصوص ان کے ناپاک عزائم کا ہدف ہے۔ ان کی پارلیمان کے پیش نظر یہ مقولہ ہے۔

"اے اسرائیلیو! تمہاری سرحدیں فرات سے نیل تک پھیل ہوئی ہیں"

یہودیوں کا تیسرا نشان تکون ہے جسے آنکھ کہا جاتا ہے۔ تکون کی یہ صورت مادیت کے اظہار کے لئے ہے اس کی الٹی صورت روحانیت کی مظہر بن جاتی ہے۔ لیکن کون سی روحانیت؟ جو ان کی اپنی کج فہمی کا نتیجہ ہے۔ دونوں آنکھوں کو ملا کر یہودی ستارہ بنایا جاتا ہے جس کے چھ مخروط ہیں۔ یہ ملحوظ رہے کہ اسلامی ستارے کے صرف پانچ مخروط ہیں۔ اس علامت کے ذریعے اہل یہود، عالم اسلام پر اپنی قوم کی برتری ثابت کرنا چاہتے ہیں۔

بے شک ہماری بدبختیوں، ناسمجھیوں، نادانیوں اور عاقبت نااندیشی نے آج ہمیں یہ دن

دکھائے ہیں کہ اغیار کے ہاتھوں کم اور اپنوں کے ہاتھوں عالم اسلام زیادہ رسوا ہوا ہے ا
مٹھی بھر یہودی مسلمانوں کی بقا کے لئے مسئلہ بنے ہوئے ہیں۔

لیکن —!!

یہودی ہوں یا ہنود۔

عیسائی ہوں یا مسلمان یا دنیا کی کوئی بھی اور قوم۔

جس قوم نے اپنے اسلاف کے اصولوں کو فراموش کر دیا۔ گمراہی کا راستہ اپنایا۔ اس ۔
ذلالت اور بدنامی کمائی۔ بد بخت کہلائی۔

یہودیوں کو سرخاب کا کوئی ایسا پر نہیں لگا کہ وہ دنیا پر حکمرانی کرنے لگ جاتے۔ اس کا سبب ا
کی سالوں کی وہ مسلسل ریاضت اور بھلے برے مقاصد ہی کے لئے سہی مقصد سے لگن ـ
انہیں آج یہ مقام دلایا ہے کہ اپنی ریشہ دوانیوں اور حرامکاریوں کے سبب وہ نہ صرف
مسلمانوں بلکہ باقی ماندہ اقوام عالم کے لئے بھی ایک کبھی نہ ختم ہونے والا خطرہ بن گئے ہیں۔

یہ سب کیسے ہوا؟

کس طرح ایک رسوائے زمانہ اور انتہائی گھٹیا درجے کی قوم نے دنیا سے اپنی برتری منوالی
اس کے پس پردہ ایک زبردست کہانی ہے۔

سنسنی خیز—

تحیر سے بھرپور۔

مکاری، بے ایمانی، دغابازی اور مکروفریب کی چالوں سے لبریز ایک داستان۔

کہا جاتا ہے کہ مسلسل ذلالت نے جب یہودی اقوام کو کسی قابل نہ چھوڑا تو اس کے
سیانے سر جوڑ کر بیٹھے کہ ایک مرتبہ پھر وہ دنیا کی نمبرون قوم کیسے بن سکتے ہیں۔

1897ء سے 1905ء تک اپنے مفادات اور مستقبل میں دنیا پر حکمرانی کرنے کے منصوبے
یہودی مفکرین بناتے رہے اس مقصد کے حصول کے لئے انہوں نے متعدد خفیہ کانفرنسیں
کیں طویل بحث و تمحیص کے بعد بالآخر صیہونیت کے فلسفہ اور لائحہ عمل کو مسودے کی شکل
دی گئی جس پر یہودی قائدین نے مہر تصدیق ثبت کی اور 24 سیاسی دستاویزات پر مشتمل ایک

شیطانی منصوبہ تیار کیا جسے ساری دنیا "پراٹوکول" کے نام سے جانتی ہے۔

یہ شیطانی منصوبہ کبھی طشت ازبام نہ ہوتا اور یہودیوں کے منصوبے کے مطابق اس کی
تفصیلات خفیہ ہی رہتیں لیکن ایک یہودی عورت نے جس کے دل میں ابھی انسانیت کی رمق
باقی تھی عالمی تباہی کے اس گھناؤنے منصوبے سے دنیا کو باخبر کرنا ضروری سمجھا اور فری میسن
اور صیہونی تحریک سے وابستہ اس عورت نے (جس کا نام دنیا کو معلوم نہیں ہو سکا) اس کی
ایک کاپی چرا کر اس یہودی سازش کو بے نقاب کر دیا۔

190ء میں روسی پادری سرجائی نائلس نے اس پراٹوکول کو پہلی مرتبہ کتابی صورت میں شائع
کیا۔

191ء میں امریکہ میں اس کا انگریزی ترجمہ چھپا۔

193ء میں اس کا ترجمہ برطانیہ میں شائع ہوا۔

اس کے بعد سے ساری دنیا میں قریباً دنیا کی ہر زبان میں اس بدنام زمانہ دستاویز کی اشاعت ہو
چکی ہے اور کروڑوں کی تعداد میں اس کی کاپیاں فروخت ہو چکی ہیں۔ مگر کمال یہ ہے کہ یہ
ہمیشہ نایاب رہی ہے۔

دنیا کا تو ہر یہودی اسے حرز جاں سے عزیز سمجھتا ہے۔ اس پر عمل کرنا ایک مذہبی فریضہ خیال
کرتا ہے۔ اس منشور میں اول یہودیت کا یہ مقصد قرار دیا گیا ہے کہ تمام دنیا میں یہودیوں کا
غلبہ اور ان کی بالادستی کو قائم کیا جائے۔ اس کے حصول کے لئے دنیا بھر میں یہودی حکومت
کی بنیاد رکھنا لازمی امر قرار دیا گیا ہے۔ بالفاظ دیگر یہودی غلبہ اور یہودی حکومت جزو لاینفک
ہیں یا یہ کہہ لیجئے کہ یہ دونوں لازم و ملزوم ہیں۔ اس کتاب کے مطالعہ سے یہ بالکل واضح ہو
جاتا ہے کہ یہودی تمام مذاہب عالم کو پامال کرنے پر تلے ہوئے ہیں۔ صدہا سال سے ان کا یہ
عمل جاری ہے۔ جہاں کہیں کوئی حکومت مذہب کی بنا پر قائم ہوئی۔ یہودی سازشیں وہاں
فوراً شروع ہو جاتی ہیں۔ یہودی سر توڑ کوشش کرتے ہیں کہ اس حکومت کا تختہ الٹ دیا
جائے۔ چنانچہ سلطان عبد الحمید کے زمانہ میں ترکی یہودیوں کی خفیہ اور سنگین سازشوں کی
آماجگاہ بنا رہا۔ حتیٰ کہ خلافت اسلامیہ کو ختم کر کے چھوڑا۔

مصر میں بھی یہی عالم رہا۔ شاہ فاروق کو نکلوایا عبد الجمال ناصر کو آلہ کار بنا کر اخوان المسلمین کا استیصال کروایا اور فراعنہ مصر کی یاد کو تازہ کروایا۔

مصریوں کا خیال ہے مشرقی پاکستان کا علیحدہ ہونا اور بنگلہ دیش کا قائم ہونا یہودیوں کی خفیہ کارروائیوں کا نتیجہ ہے۔ یہ حقیقت الم نشرح ہے کہ مسز اندرا گاندھی اور اسرائیل کا گہرا جوڑ تھا۔ پاکستان کی بنیاد اسلام ہے اس لئے پاکستان یہود و ہنود کی آنکھ میں کانٹے کی طرح کھٹکتا ہے اور یہ بات پایہ ثبوت کو پہنچ گئی ہے کہ پاکستان کو دولخت کرنے میں دونوں نے ایک دوسرے کی ہر ممکن مدد کی۔

آج پاکستان کی ایٹمی تنصیبات کو جتنا خطرہ بھارت سے ہے اتنا ہی اسرائیل سے ہے۔

یہودیوں نے پاکستان کو خاص طور پر اپنی سازشوں کا مرکز بنایا ہے ان کے زعما کی ذیل کی تقریر پر پیرس کے ساربون یونیورسٹی میں 1967ء میں کی گئی قابل ذکر ہے۔

"بین الاقوامی یہودی تحریک کو کسی طرح بھی پاکستان کے متعلق غلط فہمی کا شکار نہیں رہنا چاہئے۔ پاکستان دراصل ہمارا اصل اور حقیقی نظریاتی جواب ہے۔ پاکستان کا ذہنی و فکری سرمایہ اور عسکری قوت آگے چل کر ہمارے لئے کسی وقت بھی مصیبت کا باعث بن سکتا ہے۔ ہمیں اس کا حل سوچنا چاہئے۔ ہندوستان سے دوستی ہمارے لئے نہ صرف ضروری ہے بلکہ ہمیں اس تاریخی دشمنی سے فائدہ اٹھانا چاہئے جو کہ ہندو، پاکستان اور اس میں بسنے والے مسلمانوں کے خلاف رکھتا ہے۔ یہ تاریخی عناد ہمارا (یہودیوں کا) سرمایہ ہے"

(یروشلم پوسٹ 9 اگست 1967)

حال ہی میں کولمبیا یونیورسٹی کے یہودی پروفیسر جے۔ سی ہیرویئز نے مڈل ایسٹ پالیٹکس اینڈ ملٹری نامی کتاب شائع کی وہ اس میں اس طرح رقم طراز ہے:۔

"پاکستانی مسلح افواج نظریہ پاکستان اور اس کے اتحاد اور سالمیت اور استقلال کی پاسبان بنی ہوئی ہیں جب کہ ملک کی سول انتظامیہ مغرب زدہ ہے اور نظریہ پاکستان پر یقین نہیں رکھتی۔"

یہودی اسلامی ممالک میں آئے دن دھماکے کرواتے رہتے ہیں۔ پاکستان میں یہودیوں کے کارندے تخریبی کارروائیوں میں مصروف ہیں جو پاکستان کو تباہ کرنے پر تلے ہوئے ہیں۔ تخریب کاروں اور ان کی رہنمائی کو یہودی خفیہ تنظیموں کی طرف سے بے شمار روپیہ مل رہا ہے۔

ایک طرف دشمن کے عزائم ہیں اور دوسری طرف ہم ہیں جو اپنے ہر عمل سے دشمن کے گھناؤنے منصوبوں کی لئے آسانیاں پیدا کر رہے ہیں۔ صورت حال کی سنگینی پر بحث کرنے سے پہلے آئیے پراٹوکول کا جائزہ لے لیں۔

پراٹوکول

یہودیوں کا تصور حق

یہ امر قابل توجہ ہے کہ دنیا میں صالح اور باکردار انسانوں کی نسبت بدکار افراد کی تعداد کہیں زیادہ ہے۔ لہٰذا ان پر حکمرانی کے دوران بہترین نتائج کا حصول دانشورانہ اور علمی بحث و مباحثہ میں الجھنے کی بجائے دہشت گردی اور ظلم و تشدد کے حربوں کو اپنانے ہی سے ممکن ہے۔ چونکہ ہر فرد کا مطمع نظر اقتدار ہی ہوتا ہے لہٰذا بس چلے تو ہر شخص آمر بننے کو ترجیح دے گا۔ دنیا میں ایسے لوگوں کی تعداد بہت کم ہے جو اجتماعی مفادات کو اپنے ذاتی مفاد پر قربان کرنے کے لئے تیار نہ ہو جائیں۔

پہلے ہم اس امر کا تجزیہ کریں کہ آخر وہ کون سی طاقت ہے جو انسان کے نام سے موسوم کئے جانے والے درندوں کو قابو میں رکھے ہوئے ہے؟ اب تک کس قوت نے ان کی رہنمائی کے فرائض سرانجام دیئے ہیں؟

تاریخ شاہد ہے کہ انسانی معاشرے کے ابتدائی مراحل میں تو حضرت انسان کو وحشیانہ ظلم و تشدد اور جبر و استبداد ہی سے زیر کیا گیا۔ بعد ازاں قانون کی حکمرانی کا چرچا ہوا مگر جابر اور استبدادی قوتوں نے نیا لبادہ اوڑھ لیا۔ ظلم و تشدد کے چہرے نے اپنے اوپر قانون کا چہرہ چڑھا لیا۔ لہٰذا ہم یہ نتیجہ اخذ کرنے میں قطعاً حق بجانب ہوں گے کہ قانون فطرت کے مطابق استحقاق (حق) جبر و طاقت ہی میں پوشیدہ ہے۔

سیاسی آزادی

سیاسی آزادی کی اصطلاح کا حقیقت کی دنیا سے کوئی واسطہ نہیں۔ یہ محض ایک تصور ہے۔ ہر شخص کو معلوم ہونا چاہئے کہ ضرورت پڑنے پر وہ کس طرح اس کا نعرہ بلند کرکے اپنا

حاصل کر سکتا ہے اور ارباب اختیار کو اقتدار سے محروم کرنے انہیں کچلنے پر عوام الناس اپنی جماعت کی طرف راغب کرنے کے لئے کس طرح اس نعرے کو ذریعہ حرص و ہوس بنا تا ہے؟ یہ کام اس وقت اور بھی آسان ہو جاتا ہے جب مخالف فریق خود بھی آزادی کے تصور یعنی نام نہاد حریت پسندی اور روشن خیالی کا شکار ہو چکا ہو اور اس تصور کی خاطر کچھ اختیارات سے دست بردار ہونے کو تیار ہو جائے بس یہی وہ مقام ہے جہاں ہمارے نظریات بلندی سے ہمکنار ہوتے ہیں۔ عنان حکومت پر ایک ہاتھ کی گرفت ڈھیلی پڑتی ہے تو قانون فطرت کے تحت ایک نیا ہاتھ اس پر قابض ہو جاتا ہے۔ کیونکہ اندھا دھند طاقت کی مالک قوم کا کسی قسم کی رہنمائی کے بغیر ایک دن بھی زندہ رہنا محال ہے۔ اس طرح نئی حکومت پہلے ہی سے حریت پسندوں کے ہاتھوں کمزور شدہ حکومت کی جگہ لے لیتی ہے۔

دولت

ہمارے زمانے میں حریت پسند حکمرانوں کی جگہ جس نئی طاقت نے لے لی ہے وہ زر ہے۔ ایک وہ دور تھا جب ایمان کی حکمرانی تھی لیکن اب تو یہ قصہ پارینہ ہے۔ جہاں تک آزادی کے تصور کا تعلق ہے اسے حقیقت کا لباس پہنانا اس لئے بھی ناممکن ہے کہ کوئی شخص بھی تو اسے میانہ روی سے استعمال میں لانے کے طریقے سے آگاہ نہیں بلکہ کسی قوم کو ایک غیر منظم گروہ میں تبدیل کرنے کے لئے کچھ عرصہ کے لئے اسے حق خود ارادیت سونپ دیجئے۔ آپ دیکھیں گے کہ انتقال اختیارات کے لمحہ ہی سے ہلاکت خیز جھگڑوں اور تنازعات کا آغاز ہو جاتا ہے جو بالآخر عوامی انتشار اور طبقاتی جنگ و جدل کا رنگ اختیار کرتے ہوئے سلطنتوں کی تباہی و بربادی کے موجب بنتے ہیں اور ان ریاستوں کی اہمیت محض راکھ کے ڈھیر سے زیادہ نہیں رہتی یہ یاد رکھیئے کہ اگر کوئی ریاست اپنے ہی اندرونی بحران کا شکار ہو کر رہ جائے یا اس کا داخلی خلفشار بیرونی دشمنوں کو اس پر مسلط کر دے تو دونوں ہی صورتوں میں اسے ناقابل تلافی نقصان پہنچتا ہے اور وہ بالآخر ہمارے دائرہ اختیار میں آ جاتی ہے کیونکہ سرمایہ جو ڈوبتے کو تنکے کا سہارا بنتا ہے کے استبدادی نظام پر ہم قابض ہیں ایسی ریاست کو اپنی بقا کی خاطر اپنا وجود برقرار رکھنے کی غرض سے بخوشی یا بہ امر مجبوری ہمارے سامنے دست سوال دراز کرنا پڑتا

ہے۔ اس تنکے (سونے) کی طرف ہاتھ بڑھانا پڑتا ہے جو ہمارے قبضے میں ہے ورنہ تباہی و بربادی اس کا مقدر بن جاتی ہیاگر کسی آزاد خیال اور وسیع النظر فرد کے ذہن میں یہ خیال ابھرے کہ اس قسم کا طرز فکر اخلاقی اقدار کے منافی ہے تو میں اس سے ایک سوال پوچھتا ہوں کہ فرض کیجئے کسی مملکت کے دو دشمن ہیں۔ خارجی اور داخی۔ اگر خارجی دشمن کے مقابلے میں جنگ و جدل کے ہر حربے اور تربیر کو جائز سمجھا جاتا ہے مثلاً دشمن کو حملوں اور دفاع کے منصوبوں سے بے خبر رکھنا، شب خون مارنا حملے کے وقت زیادہ سے زیادہ افرادی قوت سے کام لینا تو آخیر کس منطق کی رو سے انسای معاشرے اور اجتماعی فلاح و بہبود کی تباہی کے درپے بدترین دشمن کے خلاف ایسی کارروائیوں کا عمل میں لانا ناجائز اور اخلاقی اقدار کے منافی ہے کیا کوئی صحت منداور منطقی ذہن کا حامل فرد محض اپنے معقول مشوروں اور فصیح و بلیغ دلائل سے عوامی ہجوم کی رہنمائی کرنے میں کامیابی کی توقع کر سکتا ہے۔ جب کہ ہر معملے پر انتہائی غیر معقولی، احمقانہ اور متضاد نوعیت کے اعتراضات کئے جا سکتے ہیں جنہیں عوام کے سطحی اذہان جلد قبول بھی کرلیتے ہیں؟ اکثر عوام اور ان کے نام نہاد نمائندے ادنی نوعیت کے عقائد، حقیر قسم کے جذبات بے ہودہ رسوم و روایات اور جذباتی نظریات کے زیر اثر جماعتی اختلاف و انتشار کے شکار ہو جاتے ہیں اور پھر ان کا کسی معقول ترین فیصلے پر متفق ہونا محال ہو جاتا ہے۔ بعض اوقات اگر عوامی مجمع میں کوئی قرارداد منظور ہو جاتی ہے تو اس کی قسمت کا انحصار محض حسن اتفاق یا مجتمع عوام کی اکثریت پر ہوتا ہے۔ لہٰذا سیاسی اسرار و رموز سے یہ ناواقف، بے خبر اور جاہل عوام اکثر ایک ایسی مضحکہ خیز قرارداد بھی منظور کرلیتے ہیں جو انتظامیہ میں طوائف الملوکی، انتشار اور بدنظمی کے بیج بو دیتی ہے۔

اخلاق اور سیاست

سیاسیات اور اخلاقیات میں قطعاً کوئی قدر مشترک نہیں۔ اخلاقی قدروں کا پاسبان حکمرانی کبھی بھی ایک ماہر سیاست دان کے درجے کو نہیں پہنچ سکتا۔ اس کے اقتدار کو کبھی بھی استحکام و استقلال نصیب نہیں ہو سکتا۔ حکومت کے خواہش مند شخص کے لئے لازمی ہے کہ وہ مکر و فریب، ظاہرداری اور بناوٹ کے حربوں کو انتہائی چالاکی سے استعمال میں لا سکے۔ اعلیٰ

ذہنی کردار، دیانت و امانت اور حق گوئی جیسی اخلاقی اقدار کا میدان سیاست میں کوئی مقام نہیں بلکہ ان کی حیثیت بدترین قسم کے عیوب کی سی ہے۔ ان اقدار کو اختیار کرنے والے حکمرانوں کا تنزل و ادبار لازمی ہوتا ہے وہ ایسی تباہی کو دعوت دیتے ہیں جو کسی طاقت ور دشمن کے ہاتھوں بھی ممکن نہیں۔ ہاں ان اوصاف و محاسن کو یہودی مملکتوں میں پروان چڑھنے دیجئے البتہ ہمارا ان کے ساتھ قطعاً کوئی واسطہ نہیں ہونا چاہئے۔

ہمارا حق محض قوت و طاقت میں پوشیدہ ہے لفظ حق یا استحقاق ایک مجرد خیال کو پیش کرتا ہے۔ جن کا تعین کرنا ممکن نہیں۔ زیادہ سے زیادہ اس کی توضیح اس انداز سے کی جا سکتی ہے۔ مجھے وہ دے دیجئے جو میں چاہتا ہوں تاکہ میں یہ ثابت کر سکوں کہ میں آپ سے زیادہ طاقت ور ہوں۔

استحقاق کی حدود کہاں سے شروع ہوتی ہیں اور ان کا اختتام کہاں ہوتا ہے؟

ہر اس مملکت میں جس کا نظام حکومت کمزور و ناقص ہو، جس کے قوانین اور حکمران حریت پسندوں کے مطالبوں کے زیر اثر دن بدن بڑھتے ہوئے حقوق کے سیلاب میں اپنی شخصیت سے ہاتھ دھو بیٹھے ہوں اور ان کا وجود برائے نام رہ گیا ہو۔ میں نے ایک نیا حق دریافت کیا ہے اور وہ ہے طاقت ور ہونے کی حیثیت سے دھاوا بولنے کا حق پہلے سے موجود قوانین اور نظم و ضبط برقرار رکھنے والی تمام قوتوں کو درہم برہم کرنے اور تاخت و تاراج کر دینے کا حق تاکہ تمام اداروں کو اپنی منشا کے مطابق از سر نو منظم کر کے ان لوگوں کا حکمران اعلیٰ بن سکوں جنہوں نے حریت پسندی کے جنون میں اپنے حکمرانی کے حقوق سے برضا و رغبت ہمارے حق میں دست برداری اختیار کرلی ہو۔

عصر حاضر میں حکومتوں کی تمام لڑکھڑاتی صورتوں کے مقابلے میں ہماری طاقت ناقابل تسخیر ہوگی۔ کیونکہ یہ اس وقت تک پردہ راز میں رہے گی جب تک یہ اتنی مضبوط قوت نہ بن جائے کہ کوئی عیار سے عیار دشمن بھی اسے نقصان پہنچانے سے قاصر رہے۔

یہ یاد رکھیے! کہ شر کے عارضی دور سے بالآخر مستحکم و غیر متزلزل حکومت کی خوبیاں وجود پذیر ہوں گی۔ جو حریت پسندوں کے ہاتھوں قومی زندگی کے مفلوج نظام کو بحال کریں گی۔

دراصل نتائج ہی تو ذرائع کو حق بجانب ٹھہراتے ہیں لہٰذا اپنے منصوبوں کو عملی جامہ پہناتے ہوئے ہمیں اخلاقی قدروں سے بے نیاز ہو کر صرف اور صرف یہ دیکھنا چاہئے کہ ہمارے عزائم کی تکمیل کے لئے کون سا طریق کار مفید اور ضروری ہے۔

ہمارے پیش نظر ایک مخصوص منصوبہ ہے۔ جس کا لائحہ عمل انتہائی حکمت عملی سے تیار کیا گیا ہے۔ لہٰذا متیعنہ حدود سے منحرف ہونا صدیوں کی محنت شاقہ کی تباہی کا خطرہ مول لینے کے مترادف ہو گا۔

دراصل عوام میں کچھ کمزوریاں فطری طور پر پائی جاتی ہیں۔ لہٰذا کسی بھی لائحہ عمل کی اطمینان بخش صورت کی تفصیلات طے کرنے کے لئے ان کی ذہنیت سستی و کاہلی، متلون مزاجی ان کا خود اپنی زندگی کی کیفیات کے احترام سے نہ صرف گریز بلکہ انہیں سمجھنے کی صلاحیتوں سے عاری ہونا، نیز اپنی فلاح و بہبود تک سے پہلو تہی کرنا وغیرہ جیسی کمزوریوں کو مدنظر رکھنا پڑے گا۔

یہ واضح طور پر ذہن نشین کر لینا چاہئے کہ عوامی قوت اندھی اور بے سمجھ ہوتی ہے۔ یہ ایک ایسی غیر معقول طاقت ہوتی ہے جو دوسروں کے اشاروں پر ناچتی ہے۔ لیکن ذرا سوچئے تو سہی کہ ایک اندھا دوسرے اندھے کی رہنمائی کے فرائض کیسے سرانجام دے سکتا ہے؟ وہ تو یقیناً اسے تباہی کے غار ہی میں دھکیلے گا۔ لہٰذا عوام میں سے جو بھی شخصیت ابھرے گی خواہ وہ عقل و خرد کے لحاظ سے کتنی ہی ذہین کیوں نہ ہو، سیاسی امور سے ناواقفیت کے باعث عوام کے قائد کی حیثیت سے سامنے نہیں آ سکتی۔ اس کا یہ کردار اختیار کرنا ساری قوم کے لئے موجب تباہی بنے گا۔ لہٰذا صرف وہی افراد جن کو بچپن ہی سے خود مختار حکمران بننے کی تربیت دی گئی ہو۔ ان اصلاحوں کو سمجھ سکتے ہیں جو سیاسی ابجد کے حروف سے مرتب کی گئیں ہیں۔

اگر کسی قوم کو اپنی من مانی کرنے کی اجازت مل جائے یعنی اس کی زمام اقتدار نو آموز سیاست دانوں کے ہاتھوں میں چلی جائے تو وہ جاہ و حشم کے حصول کی دوڑ کے نتیجہ میں جنم لینے والی بد نظمی اور جماعتی انتشار کا شکار ہو جاتی ہے اور تباہی اس کا مقصد بن جاتی ہے۔ سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ کیا عوام کے لئے کسی قسم کی بدگمانیوں اور رقابتوں کو ہوا دیئے بغیر پرسکون طریقے سے صحیح فیصلوں پر پہنچنا اور ذاتی مفادات سے بالاتر رہ کر ملکی امور سے نپٹنا

ملن ہے؟ کیا بیرونی دشمنوں کے مقابلے میں وہ اپنی مدافعت کر سکتے ہیں؟ درحقیقت یہ امر نطعی طور پر ناقابل تصور اور محال ہے۔ کیونکہ اگر کسی منصوبے کو عوام الناس۔ ن کی نداد کے برابر کے حصوں میں تقسیم کر دیا جائے تو اس کی یکسانی میں دراڑ پڑ جاتے ہیں بلکہ امل منصوبے کی صورت ہی مسخ ہو کر رہ جاتی ہے اور وہ ناقابل فہم اور ناقابل عمل بن کر رہ جاتا ہے۔

مختلف منصوبوں کو جامع صورت عطا کرنا اور ان میں سے ہر ایک کو پایہ تکمیل تک پہنچانے کے لئے مملکت کی مشینری کے مختلف حصوں میں مناسب انداز سے تقسیم کرنا، ایک مطلق العنان حکمران ہی کے لئے ممکن ہے۔ اس ساری بحث سے یہی نتیجہ اخذ ہوتا ہے کہ کسی ملک کے لئے صرف وہی طرز حکومت قابل اطمینان ہے جو کسی ایک فرد کے ہاتھوں میں مرتکز ہو۔ کامل مطلق العنانیت کے بغیر تہذیب کی بقا و دوام قطعاً ناممکن ہے۔ کسی قوم کی تہذیب میں زندگی کی روح عوام نہیں بلکہ ان کا قائد ہی پھونک سکتا ہے۔ اس سے غرض نہیں کہ وہ قائد کون ہے؟ عوام تو وحشیانہ فطرت کے مالک اور غیر متمدن ہوتے ہیں۔ وہ ہر موقع پر اپنی وحشت و بربریت کا مظاہرہ کرتے رہتے ہیں جس لمحہ عام کو آزادی نصیب ہوتی ہے اور عنان اقتدار ان کے ہاتھوں میں پہنچتی ہے۔ اسی لمحہ انتشار اور طوائف الملوکی کا دور دورہ شروع ہو جاتا ہے جو بذات خود وحشت و بربریت کا نکتہ عروج ہے۔

کبھی الکوحل پلائے جانوروں کی حالت تو دیکھئے! کہ کس طرح وہ نشے سے بدمست ہو جاتے ہیں؟ آزادی سے بہرہ ور ہوتے ہی لوگوں کو منشیات کے آزادانہ استعمال کا حق بھی مل جاتا ہے۔ اگرچہ یہ حق ہمارے لئے نہیں ہے نہ ہی ان راہوں سے ہمارا کوئی تعلق ہے۔ لیکن غیر یہود اقوام ان الکوحل ملے مشروبات سے بدمست ہو چکی ہیں۔ ان کے نوجوان کلاسیکی ادب (یونانی و لاطینی ادب) کے زیر اثر ہوش و خرد سے عاری ہو چکے ہیں۔ ہمارے مخصوص کارندے انہیں اوائل عمر ہی سے بدکاری و گمراہی کی طرف مائل کرنا شروع کر دیتے ہیں۔ یہ کارندے اہل دولت و ثروت کے ہاں کبھی اتالیق اور گورنسوں (معلمات) کے روپ میں جا پہنچتے ہیں اور کبھی کلرکوں اور خادموں کا کردار اختیار کر لیتے ہیں۔ ہماری عورتیں عصمت

فروشی و بدکاری کے اڈوں پر غیر یہود کو گمراہ کرنے کے لئے موجود رہتی ہیں جہاں وہ اکثر ہوس پرستی اور عیاشی کے لئے چکر لگاتے رہتے ہیں۔ اس آخری زمرے میں نام نہاد شوقین خواتین بھی ہیں جو فحاشی و عیاشی میں از خود دوسروں کی تقلید کرتی ہیں۔

ہم قوت و طاقت کے بھرپور استعمال اور دوسروں کو الو بنانے میں مکمل طور پر اعتقاد رکھتے ہیں۔ سیاسی امور میں صرف طاقت ہی ایک موثر اور کارگر حربہ ہے بالخصوص اگر اسے ان صلاحیتوں کے دبیز پردوں میں چھپا لیا جائے جو ایک سیاست دان کے لئے ضروری ہیں۔ ان حکمرانوں کے لئے جو اپنے شاہی تاج کو کسی نئی طاقت کے ایجنٹوں کے قدموں میں نہیں ڈال دینا چاہتے دہشت و بربریت اور مکر و ریا کے اصولوں کو اپنانا لازمی ہے۔ انہیں دوسروں کو دغا دینے اور بیوقوف بنانے میں بھی کوئی ہچکچاہٹ محسوس نہیں کرنی چاہئے۔ اگرچہ یہ حربہ سراسر شر ہے لیکن اصل مقصد خیر کے حصول کے لئے صرف یہی طریق کارگر ہے۔ لہٰذا اگر رشوت دغا و فریب نیز غداری و بے وفائی کے حربوں کے ذریعے ہمارے مقصد کے حصول میں کامیابی ممکن ہو تو ان کے استعمال سے بھی قطعاً گریز نہیں کرنا چاہئے۔ اگر کسی کی جائداد چھین کر اسے طاعت و فرنبرداری پر مجبور کیا جا سکتا ہے اور اقتدار اعلیٰ پر قبضہ کیا جا سکتا ہے تو پس و پیش کئے بغیر اس حربے کے استعمال سے واقف ہونا چاہیے۔

پرامن فتوحات کے راستے پر گامزن ہماری ریاست کو یہ حق حاصل ہو گا کہ جنگ کی ہولناکیوں کی جگہ اس قسم کی سزائے موت کو رواج دے جو کم سے کم نمایاں لیکن زیادہ طمانیت بخش ہو۔ یہ اس وحشت و خوف کی فضا قائم کرنے کے لئے ضروری ہے جو لوگوں کو ہماری اندھادھند طاعت و فرمانبرداری پر مجبور کر دے۔

تشدد کرو بہمیت اپناؤ!

سا کسی ریاست کی عدل و انصاف پر مبنی لیکن رحم و کرم سے عاری سخت گیری کی پالیسی ہی اس کی قوت و طاقت کا ایک اہم عنصر ہوتی ہے۔ ہمیں صرف اپنے مفادات کی خاطر کے لئے ہی نہیں بلکہ فتح و کامیابی کے حصول کے لئے بھی فرائض منصبی کی آڑ میں بھی تشدد اور دغا و فریب کے پروگرام پر عمل در آمد کرتے رہنا چاہئے۔ بدلہ چکانے کا اصول ان ذرائع کی مانند ہی موثر اور کارگر ہے جن کو وہ استعمال میں لاتا ہے۔ لہٰذا فتح و کامرانی ذرائع سے نہیں بلکہ بے رحمی اور سخت گیری کے اصول کے تحت حاصل ہو گی۔ یہی سخت گیری اور تشدد کا اصول تمام حکومتوں کو ہماری سپر حکومت کی طاعت و فرمانبرداری پر مجبور کر دے گا۔ ان کے لئے اتنا جاننا ہی کافی ہو گا کہ ہم ہر قسم کی نافرمانی و سرکشی کو کچلنے کے لئے انتہائی بے رحم واقع ہوئے ہیں۔

آزادی اور مساوات کا فریب

بہت عرصہ قبل زمانہ قدیم میں سب سے پہلے ہم نے ہی آزادی، مساوات اور اخوت کا نعرہ بلند کیا تھا اس وقت سے اب تک ان بے معنی اور کھوکھلے الفاظ کو غیر یہودی بیوقوف میاں مٹھو جو چاروں طرف سے ان ترغیبات پر ٹوٹ پڑے بار بار دہرا رہے ہیں۔ اسی کے زیر اثر انہوں نے دنیا کو اس کی فلاح و بہبود اور فرد کو اس کی حقیقی آزادی سے محروم کر رکھا ہے۔ وہی آزادی جس کا قبل ازیں عوام کے جبر کے خلاف خوب تحفظ کیا جاتا رہا ہے۔ غیر یہود کے ذہین افراد اور دانشور بھی ان الفاظ کی پیچیدگیوں سے کوئی معانی اخذ کرنے سے قاصر رہے۔ وہ ان کے باہمی تعلق اور ان کے مفہوم کے تضاد کو بھی نہ سمجھ سکے۔ وہ تو یہ بھی نہ دیکھ سکے کہ خود کارخانہ فطرت میں نہ تو کوئی مساوات ہے اور نہ آزادی۔ بلکہ فطرت نے تو مختلف افراد کے اذہان، کردار اور صلاحیتوں میں عدم مساوات کو برقرار رکھا ہے اور ان میں کوئی تغیر واقع نہیں ہوا۔ انہوں نے کبھی لحہ بھر کے لئے بھی یہ نہیں سوچا کہ عوام عقل و شعور سے عاری ہوتے ہیں۔ ان سے حکمرانی کے لئے جن نئے چہروں کو منتخب کیا جائے گا وہ میدان سیاست میں عوام ہی کی طرح بے شعور ہوں گے اور حکمرانی کے نااہل۔ الرعنان حکومت کسی ماہر سیاست دان کے ہاتھوں میں ہو تو وہ خواہ کتنا ہی احمق اور غبی ہو کاروبار مملکت احسن طریقے سے چلا سکتا ہے لیکن ایک غیر ماہر خواہ وہ کتنا ہی عاقل و دانا، ذہین و فطین ہو سیاست کی ا جبد سے بھی آشنا نہیں ہو سکتا۔ ان امور کی طرف غیر یہود نے قطعاً کوئی توجہ نہیں۔ حالانکہ یہی وہ اصول تھے جن کے باعث شاہی خاندانوں کی حکومتیں مستحکم رہیں۔ کیونکہ باپ اپنے بیٹے کو سیاسی

امور کی تعلیم اس انداز سے دیتا کہ شاہی خاندان کے اپنے قریبی افراد کے علاوہ رعایا میں سے کسی کے کان میں بھنک تک نہ پڑتی اور ان اسرار و رموز کو افشا کرنے کی کسی کو مجال نہ ہوتی۔

امتداد زمانہ کے ساتھ شاہی خاندان کا سیاسی امور سے متعلق صحیح تجزیے اور رموز مملکت کے انتقال کے عمل کا مفہوم ختم ہو کر رہ گیا اور یہ امر ہمارے دامے کی کامیابی میں معاون ثابت ہوا۔ ہمارے عقل و شعور سے عاری کارندے شکریہ کے مستحق ہیں کہ ان کی کوششوں سے کرہ ارض کے ہر گوشے سے آزادی، مساوات اور اخوت کے دلکش الفاظ سے مسحور ہو کر انبوہ کے انبوہ انتہائی جوش و خروش سے ہمارے پرچم تلے اکٹھے ہو گئے ہیں۔ ہر دور میں یہ خوشنما الفاظ دیمک کے کیڑے کا کردار ادا کرتے ہوئے غیر یہود کی فلاح و بہود کے ہر منصوبے کو چاٹتے رہے ہیں۔ انہوں نے ہر جگہ ان کی مملکتوں کے امن و امان، اطمینان و سکون اور استحکام کو نیست و نابود کر رکھ ہے اور جیسا کہ آپ پر بعد میں منکشف ہو گا یہ صورت حال آئندہ بھی ہمارے لئے معاون ثابت ہو گی۔ دیگر امور کے علاوہ اس دلکش نعرے نے ہمارے لئے ثمرات کے حصول کے امکان میں اضافہ کر دیا ہے۔ اس نے مراعات یافتہ طبقے کا خاتمہ کر دیا ہے۔

دوسرے الفاظ میں یوں کہہ لیجئے کہ غیر یہود کے طبقہ شرفاء کے وجود ہی کا قلع قمع کر دیا ہے۔ حالانکہ یہی ہو طبقہ تھا جو ہمارے خلاف اپنی قوموں اور مملکتوں کا تحفظ کر سکتا تھا۔ غیر یہود کے اس اصل اور طبعی طبقہ شرفاء کے کھنڈرات پر ہم نے اپنے تعلیم یافتہ طبقے کو بطور خواص تیار کیا ہے جس کی سربراہی کے فرائض امیر و کبیر افراد کے گروہ کے سپرد کر دی گئی ہے۔ اس موخر الذکر طبقہ اشراف کے لئے ہم نے سرمایے اور مال و دولت کو مشروط کر دیا ہے۔ جس کے حصول کا دارومدار ہم یہود پر ہے یہ اس علم پر جس کے لئے ہمارے فاضل دانشور محرک طاقت مہیا کرتے ہیں۔

ہماری فتح و کامرانی اس لئے بھی آسان ہو گئی ہے کہ جن لوگوں کو ہم خریدنا چاہتے ہیں۔ ان سے روابط بڑھاتے ہوئے ہم نے ہمیشہ انسانی ذہن کے احساسات کو برانگیختہ کیا ہے۔ نقد مال و دولت کی حرص، حسن پرستی، مادی ضروریات متلون مزاجی جیسی انسانی کمزوریوں میں سے

کسی ایک سے علیحدہ طور پر فائدہ اٹھایا جائے تو وہ متعلقہ فرد کی جدت طرازی اور صلاحیتوں کو مفلوج کرنے کے لئے کافی ہوتی ہے۔ کیونکہ اس سے انسان کی قوت ارادی اور خود اعتمادی اس خریدار کے ہاتھوں میں چلی جاتی ہے جس نے ان کی قیمت ادا کی ہو۔ آزادی کے تصور کی رتی پیچیدگیوں نے ہمیں تمام ممالک کے عوام کو اس امر کی یقین دہانی کے قابل بنا دیا ہے کہ ان کے حکمرانوں کی کوئی اہمیت نہیں۔ ان کی حیثیت عوام جو کسی ملک کے حقیقی مالک ہوتے ہیں کی طرف سے محض منتظمین کی سی ہوتی ہے جن کو پھٹے پرانے اور فرسودہ دستانوں کی مانند کسی وقت بھی اتار کر پھینکا جا سکتا ہے۔ عوامی نمائندوں میں بار بار تبدیلی کے امکان سے یہ تمام حکمران ہمارے دائرہ اختیار میں آگئے ہیں اور اس طرح ان کے تقرر کے اختیارات بھی ہمیں ہی منتقل ہو گئے ہیں۔

عالمی اقتصادی غلبہ!

ہمارے اغراض و مقاصد کی کامیابی کے لئے ناگزیر ہے کہ جہاں تک ممکن ہو کسی بھی جنگ کے نتائج علاقائی فتوحات کی صورت میں نمودار نہ ہونے پائیں تاکہ جنگ کی نوعیت محض اقتصادی بن کر رہ جائے اور دنیا بھر کی اقوام ہماری مدد اعانت کی ضرورت و اہمیت نیز ہمارے غلبے اور بالا دستی کی طاقت کو محسوس کئے بغیر نہ رہیں۔ اس طرح متحارب فریق ہمارے بین الاقوامی کارندوں کے رحم و کرم پر ہوں گے جو لاکھوں کی تعداد میں واقعات عالم کا بنظر غائر مطالعہ کرنے میں مصروف رہتے ہیں اور جن پر دنیا کے کسی خطے میں بھی کوئی پابندی عائد نہیں ہے۔ ہمارے بین الاقوامی حقوق لفظ "حق" کی صحیح ترجمانی کرتے ہوئے قومی حقوق کو مٹا کر ان کی جگہ لے لیں گے۔ ان کے تحت اقوام عالم پر اسی طرح فرماں روائی کی جائے گی جس طرح ریاستیں اپنے قومی قوانین کے ذریعے اپنے عوام پر حکمرانی کرتی ہیں۔ اور ان کے تعلقات کو باہم مربوط رکھتی ہیں۔

کسی ملک پر حکمرانی کے لئے ہم وہاں کے عوام ہی میں سے آداب فرمانروائی سے ناآشنا اور غلامانہ ذہنیت کے مالک حکمران منتخب کریں گے۔ ایسے لوگ بہ آسانی ہمارے منصوبے اور

ہمارے ذہین ماہرین جوان کے مشیران خصوصی کے فرائض سرانجام دیں گے اور جنہیں بچپن ہی سے امور جہانبانی میں مخصوص تربیت دی جائے گی کے الہ کار بن سکیں گے۔

ہمارے یہ ماہرین کامیاب حکمران بننے کے لئے اپنی ضروریات کے مطابق ہمہ وقت ہمارے سیاسی منصوبوں سے معلومات اور رہنمائی حاصل کرتے رہتے ہیں تاریخ کے اوراق سے سبق سیکھتے ہیں اور کرہ ارض پر وقوع پزیر ہونے والے تمام واقعات کا مشاہدہ بھی کرتے ہیں۔ دوسری طرف غیر یہود تاریخ کا بے لاگ اور غیر متعصبانہ مطالعہ کرنے سے قاصر رہتے ہیں۔ وہ نتائج و عواقب سے بے نیاز نظریاتی دنیا ہی میں قیاس آرائیاں کرنے میں مصروف رہتے ہیں۔ لہٰذا ہمیں ان کی فکر کرنے کی قطعاً ضرورت نہیں۔ انہیں مقررہ وقت کے آنے تک لہو ولعب میں غرق رہنے دیجئے۔ انہیں اسلاف کی عظمت کے ترانے گانے دیجئے۔

سائنس کے نام پر ہمارے مہیا کردہ مخصوص نظریات کو اپنا کردار ادا کرنے دیجئے! اسی مقصد کو پیش نظر رکھتے ہوئے ہم مسلسل اپنے پریس کے ذیعے ان نظریات پر غیر یہود کا اندھا دھند اعتماد حاصل کرنے میں کوشاں ہیں۔ لطف کی بات تو یہ ہے کہ غیر یہودی دانش ور مدبرین ان نظریاتی علوم کو حاصل کر کے فخر سے پھولے نہیں سماتے۔

یہ لکیر کے فقیر ان سائنسی معلومات کو تحقیق و تدقیق کی کسوٹی پر پرکھے بغیر عملی جامہ پہنانے کی کوشش کرتے ہیں۔ حالانکہ کرہ ارض کے ہر خطے میں پھیلے ہوئے ہمارے ایجنٹ ماہرین نے انہیں نہایت عیاری سے اس انداز سے ترتیب دیا ہے کہ غیر یہودیوں کے ذہنوں کی تربیت ہمارے مقاصد کے عین مقاصد ہو سکے۔

آپ ایک لمحہ بھر کے لئے بھی یہ ذہن میں نہ لائیے کہ یہ بیانات محض لفاظی ہیں بلکہ ان کامیابیوں پر نظر ڈالئے وڈارون، مارکس اور نیٹشے کے نظریات کے ذریعے ہم نے حاصل کی ہیں۔ نیز اہل یہود کو یہ امر پیش نظر رکھنا چاہئے کہ ان نظریات کے اہم اثرات ہی کا تو یہ کرشمہ ہے کہ آج غیر یہودیوں کے قلوب واذہان، نفاق و انتشار کا شکار بن کر رہ گئے ہیں۔

سیاسی اور انتظامی امور میں مختلف قسم کی غلطیوں اور فروگزاشتوں سیچنے کے لئے ہمارے لئے یہ لازمی ہے کہ اقوام عالم کے خیالات و کردار اور رجحانات کا مسلسل جائزہ لیتے

رہیں۔ کیونکہ اگر ہم نے اپنے نظام کی دنیا بھر میں پھیلی ہوئی مشینری کے کل پرزوں کو اپنے رجحانات کی بجائے متعلقہ ممالک کے باشندوں کے میلانات کو ملحوظ رکھتے ہوئے نیز ماضی کے تجربات اور حالات حاضرہ کی روشنی میں عملی طور پر نہ چلایا تو اس کی کامیابی کو ناکامی کا منہ دیکھنا پڑے گا۔

آج کل کے دور میں تمام ریاستوں کے پاس پریس کی قوت ایک ایسی قوت ہے جو لوگوں کے خیالات میں تحریک پیدا کرتی ہے۔ اس کا اصل کردار ناگزیر ضروریات کی نشان دہی کرنا، عوام کی شکایات کو زبان دینا، بے اطمینانی اور بے چینی کی فضا پیدا کرنا اور پھر اس کی تشہیر کرنا ہے۔ یہ پریس ہی تو ہے جس کے ذریعے آزادی تقریر کا عملی اظہار ہوتا ہے۔ چونکہ غیر یہودی ریاستیں اس طاقت در حربے کے استعمال سے ناآشنا ہیں لہٰا اب یہ طاقت کلی طور پر ہمارے ہاتھوں میں آچکی ہے۔ خود پس پردہ رہتے ہوئی پریس کے ذریعے ہم نے دوسروں پر اثر انداز ہونے کی قوت حاصل کر لی ہے۔ پریس ہی کے ذریعے آج ہم سونے جیسی قیمتی دھات پر قابض ہو چکے ہیں۔ یہ درست ہے کہ اس کے حصول کے لئے ہمیں خون اور آنسوؤں کے سمندروں سے گزرنا پڑا ہے۔ اور ہم نے اپنے بہت سے عزیزوں کی قربانی بھی دی ہے۔ لیکن اس کا ہمیں بے بہا فائدہ بھی پہنچا ہے۔ یہ یاد رکھئے! کہ ہمارا ہر فرد جو ظلم و ستم کا نشانہ بنا ہے۔ خدا کی نظر میں ہزار غیر یہودیوں کے برابر ہے۔

فری میسن کا بھیانک کردار

ہمارے خواب جلدی حقیقت کا روپ دھارنے والے ہیں۔ بنی اسرائیل کے عظیم فرزند و مسافت طے ہو گئی۔ اب ہم منزل پر پہنچنے والے ہیں۔ ہمارے علامتی اژدہا جس سے ہم اپنی قوم کو تعبیر کرتے ہیں، کا حلقہ مکمل ہونے والا ہے۔ جس دن یہ حلقہ پایہ تکمیل کو پہنچ گیا یورپ کی تمام ریاستیں اس کی کنڈلی میں شکنجے کی مانند پھنس کر رہ جائیں گی۔ آج کے دستوری میزان جلد ہی ختم ہو جائیں گے کیونکہ ان کی تشکیل کے دوران ہم نے ان میں توازن کی ایسی خامیاں بھر دی ہیں کہ وہ مسلسل متحرک رہیں اور آخیر کار گھس پٹ کر اپنے محور

سے جدا ہو جائیں۔

غیر یہودی اس خوش فہمی میں مبتلا ہیں کہ انہوں نے اپنے دساتیر کو ٹھوس بنیادوں پر استوار کر لیا ہے لہٰذا وہ یہ غلط توقعات وابستہ کئے بیٹھے ہیں کہ آخیرکار یہ میزان متوازن صورت اختیار کر لیں گے ان کے اپنے محور ان کی مملکتوں کے تاجدار بے لگام طاقت کے نشے میں پاگل ہو رہے ہوتے ہیں اور قوم کے ایسے نمائندوں میں گھرے رہتے ہیں جو محض مسخرے کا کردار ادا کر رہے ہوتے ہیں۔ دراصل بادشاہوں کی یہ طاقت محلات میں جنم لینے والی دہشت گردی اور ظلم و تشدد کی مرہون منت ہوتی ہے۔ چونکہ ان کے پاس عوام کے ساتھ گھل مل جانے اور رابطہ قائم کرنے کے ذرائع مفقود ہوتے ہیں۔ لہٰذا ان کے باہم تعلقات سدھرنے کا بھی کوئی امکان نہیں ہوتا۔ یہی وجہ ہے کہ تاجدار، اقتدار کے بھوکے لوگوں کے خلاف اپنی طاقت کو مضبوط کرنے میں ناکام رہتے ہیں۔ ہم نے ہر دور اندیش مقتدر اعلیٰ اور عوام کی بے لگام طاقت کے درمیان ایک ایسی خلیج حائل کر دی ہے کہ دونوں ہی اپنا مفہوم کھو چکے ہیں اور اپنے اغراض و مقاصد سے دور جا چکے ہیں۔ ان کی کیفیت بینائی سے محروم انسان اور اس کی لاٹھی کی مانند ہے جو ایک دوسرے سے علیحدگی کی صورت میں کمزوری و بے بسی کا منظر پیش کرتے ہیں۔ اقتدار کے بھوکوں میں طاقت و قوت کے غلط استعمال کے رجحان کو فروغ دینے کے لئے ہم نے تمام گروہوں کو ایک دوسرے کے مقابل لا کھڑا کیا ہے۔ اسی طرح حصول آزادی کے لئے ان کے تمام حریت پسندانہ رجحانات کو تباہ کر دیا ہے۔ اس مقصد کی تکمیل کے لئے ہم نے ہر قسم کی مہم شروع کر رکھی ہے۔ ہم نے تمام جماعتوں کو مسلح کر دیا ہے اور اقتدار ہی کو ہر جاہ طلب کا مقصود و مطلوب بنا کر رکھ دیا ہے۔ ریاستوں کو سینکڑوں متنازع مسائل کا اکھاڑہ بنا دیا ہے۔ لہٰذا بہت جلدی ہی ہر جگہ انتشار، بدنظمی اور دیوالیہ پن کا دور دورہ ہو گا۔

اب صورت حالات یہ ہے کہ پارلیمانی اور انتظامی بورڈ کی نشستیں انتہائی درجے کے بازی گو مقرروں کے تقریری مقابلوں میں تبدیل ہو چکی ہیں بے باک صحافی اور بے ایمان قسم کے پمفلٹ باز ہر روز انتظامی افسروں کی دھجیاں اڑاتے رہتے ہیں۔ طاقت کا غلط استعمال تمام

اداروں کو تہ و بالا کرنے کے سلسلہ میں آخری ضرب کا کام دے گا اور بالآخر پاگل عوامی ہجوم کے حملوں کی تاب نہ لاتے ہوئے ہر چیز ٹکڑے ٹکڑے ہو کر فضا میں بکھر جائے گی۔ آج کل لوگ غربت و افلاس کے ہاتھوں بھاری مشقت کی زنجیروں میں اس طرح جکڑے ہوئے ہیں کہ اسکی گرفت دور غلامی بلکہ زرعی غلامی کے تحت بھی اتنی مضبوط نہ تھی۔ ممکن ہے وہ ان زنجیروں سے تو کسی نہ کسی طرح نجات حاصل کر لیں لیکن احتیاجات اور ضروریات زندگی سے تو چھٹکارا پانا ممکن نہیں۔

ہم نے دستور میں ایسے حقوق شامل کر رکھے ہیں جن کی حیثیت عوام کے لئے محض فرضی ہے۔ ان کا اصل حقوق سے کوئی تعلق نہیں۔ ان نام نہاد عوامی حقوق کا وجود صرف تصورات کی دنیا میں ممکن ہے۔ یہ ایسا خواب ہے جو عملی زندگی میں شرمندہ تعبیر نہیں ہو سکتا۔ ایک محنت کش کو جس کی کمر بھاری محنت و مشقت کے باعث دوہری ہو رہی ہو جو زندگی میں اپنی تقدیر کے ہاتھوں بری طرح ستایا ہوا ہو اس امر سے کیا فائدہ پہنچ سکتا اگر چند باتوں کو یا وہ گوئی کا حق مل جائے یا صحافیوں کو کچھ اچھے مواد کے ساتھ لغویات لکھنے کی بھی اجازت مل جائے۔

یہ یاد رکھیئے کہ کسی بھی دستور کے تحت کس بھی محنت کش کو کچھ فائدہ نہیں پہنچتا سوائے ایسے لوگوں کو جنہیں ہم بر سر اقتدار لانا چاہتے ہیں اور جو ہمارے کارندوں کے خادم ہیں، ووٹ دینے کے عوض ہمارے دسترخوان سے چند بچے کھچے ٹکڑے ان کی طرف پھینک دیئے جاتے ہیں۔ ایک غریب آدمی کے لئے جمہوری حقوق کی حقیقت ایک شدید طنز کے سوا کچھ نہیں۔ کیونکہ وہ تقریباً دن بھر محنت و مشقت کے جوئے تلے دبے رہنے پر مجبور ہے۔ اسے ان حقوق کے استعمال کی فرصت ہی کہاں؟ وہ تو ساتھیوں کی ہڑتالوں اور مالکوں کی تالہ بندیوں کے باعث ایک باقاعدہ اور یقینی اجرت کی ضمانت سے بھی محروم ہو گیا ہے۔ عوام نے ہماری رہنمائی میں طبقہ شرفاء کا قلع قمع کر دیا ہے۔ جو ان کا واحد تحفظ تھا۔ دراصل یہ طبقہ اپنے مفادات کے پیش نظر عوام کے لئے رضاعی ماں کا سا کردار ادا کرتا تھا۔ کیونکہ دونوں کے مفادات مشترک تھے۔

آج کل طبقہ شرفاء کے خاتمے کے ساتھ ہی عوام سرمایہ ٹبورنے والے بے رحم اور ظالم لوگوں کے شکنجے میں آچکے ہیں جنہوں نے محنت کشوں کو جور و ظلم سے نجات دلانے کے لئے نجات دہندہ کے روپ میں آگے بڑھتے ہیں اور انہیں اپنی عساکرانہ تنظیموں مثلاً سوشلسٹوں انارکسٹوں اور کیمونسٹوں کی صفوں میں شامل ہونے کی ترغیب دیتے ہیں۔ ان تنظیموں کو ہم اپنی اجتماعی تحریک فری میسن کے برادرانہ قانون (حقوق انسانی کے حمایت کرنے والوں کو مستحکم کیا جائے) کے تحت ہر قسم کی مدد دیتے ہیں۔

دراصل طبقہ شرفاء قانونی طور پر محنت کشوں کی مزدوری سے فائدہ اٹھانے کا مجاز ہونے کے باوجود انہیں اچھی غذا مہیا کرتا، ان کی صحت و تندرستی کا خاص خیال رکھتا اور انہیں تنومند حالت میں دیکھنا چاہتا تھا۔ ہمارا نظریہ اس کے بالکل برعکس ہے۔ ہم غیر یہود کی جسمانی صحت کو خوراک میں کمی کے ذریعے تباہ و برباد کرکے انہیں صفحہ ہستی سے مٹا دینا چاہتے ہیں۔ ہماری قوت خوراک کی شدید کمی اور محنت کشوں کی جسمانی کمزوری میں ہے۔ کیونکہ پیٹ کی آگ ہی انہیں ہمارا غلام بننے پر مجبور کرسکتی ہے اور ان کے اپنے حکمرانوں میں ہماری منشاء کے خلاف کوئی قدم اٹھانے کی طاقت کہاں سے آئے گی؟ بھوک سرمایے کو محنت کشوں پر حکمرانی کا حق عطا کرتی ہے جو اس بادشاہوں کی قانونی حکومت کے زیر اثر طبقہ شرفا ملتا تھا۔

اس کے نتیجہ میں جنم لینے والی احتیاجات، رشک و رقابت، نفرت و دشمنی کے جذبات کے ذریعے ہم عوام کو اس طرح بھڑکائیں گے کہ وہ ان تمام لوگوں کا خاتمہ کردیں گے جو ہماری حکمرانی کے راستے کو مسدود کئے ہوئے ہیں جب دنیا بھر کے مقتدر اعلیٰ ہمارے حکمران کی تاجپوشی کا وقت آئے گا یہی ہاتھ راستے کا ہر رکاوٹ کا خاتمہ کردیں گے۔

غیر یہود نے غور و فکر اور سوچ و بچار کی عادت کو ترک کردیا ہے۔ ان کے ذہن میں اگر کبھی کوئی تجویز ابھرتی بھی ہے تو وہ ہمارے ماہرین کے اشاروں ہی کی مرہون منت ہوتی ہے۔ وہ اس شدید ضرورت کی اہمیت کو محسوس ہی نہیں کرتے جسے ہم برسراقتدار آتے ہی فوری طور پر پورا کریں گے اور وہ ہے قومی درس گاہوں میں علم کی ایک سادہ سی حقیقت کو واضح کرنا جو حقیقت سارے علم کی اساس ہے حیات انسانی کے ڈھانچے کا علم، سماجی نظام کا علم جس میں

تقسیم کار کے اصول کا بہت دخل ہے اور جس کے نتیجہ میں انسانوں کو مختلف طبقات اور حالات میں تقسیم کیا جاتا ہے۔

یہ امر سب لوگوں کو ذہن نشین کرلینا چاہئے کہ مختلف انسانوں کی سرگرمیوں کے محور بھی مختلف ہوتے ہیں۔ ایک فرد جو اپنے افعال سے کسی گروہ کو پریشانی میں مبتلا کردیتا ہے، قانون کی نظر میں ہرگز اس شخص کے برابر نہیں ہوسکتا جس کے اعمال کسی اور کو نہیں بلکہ صرف اس کی اپنی عزت و شہرت پر اثر انداز ہوتے ہیں۔

سماجی و معاشرتی نظام کا صحیح علم جس کے اسرار و رموز میں ہم غیر یہود کو شریک نہیں کرتے یہ ظاہر کرے گا کہ مختلف قسم کے مراتب و فرائض مخصوص دائروں ہی میں رہنے چاہیں اور انہیں انسانی آلام و مصائب کا باعث نہیں بننا چاہئے جو اس غلط تعلیم کے نتیجے کے طور پر جنم لیتے ہیں، جس کی قطعاً ان فرائض سے کوئی مطابقت نہیں ہوتی جو انہیں زندگی میں سرانجام دینے پڑتے ہیں۔ اس علم کے عمیق مطالعہ کے بعد لوگ از خود حکومت کے سامنے سر تسلیم خم کردیں گے اور ان عہدوں پر قانع ہو جائیں گے جن پر ریاست کی طرف سے ان کا تقرر ہو گا۔

علم کی موجودہ صورت حال اور اس کی ترقی کے لئے لوگوں کو مطبوعہ مواد پر اندھا دھند یقین کرنے کی جس راہ پر ہم نے ڈال رکھا ہے اس عمل کے زیر اثر وہ ان تمام حالات و کیفیات سے اندھا دھند متنفر ہیں جنہیں وہ اپنی دسترس سے باہر سمجھتے ہیں اس کے لئے ان کی اپنی جہالت اور وہ ترغیبات و تحریصات شکریہ کی مستحق ہیں جو ان کی گمراہی کا باعث بنی ہیں۔ درحقیقت وہ انسانی طبقات و حالات کا کوئی ادراک ہی نہیں رکھتے۔

یاد رکھیئے کہ تبادلہ زر اور صنعت کاری کے عمل کو جامد کرنے والے اقتصادی بحران کے نتائج سے اس نفرت میں مزید شدت پیدا ہوگی۔ یہ تمام زیر زمین اور خفیہ حربوں سے جو ہمارے لئے کھلے ہوئے ہیں اور زر کی مدد سے جو سب کا سب ہمارے ہاتھوں میں ہے، ایک عالمی معاشی بحران پیدا کردیں گے۔ اس کے ساتھ ساتھ یورپ کے تمام ممالک میں بیک وقت ہی محنت کشوں کو سڑکوں پر لے آئیں گے اور پھر یہ بے قابو عوامی ہجوم اپنی سادہ لوحی اور کم

ہمی کے باعث خوشی خوشی ان لوگوں کا خون بہا دیں گے جنہیں وہ آغوش مادر ہی سے رشک کی نگاہوں سے دیکھا کرتے تھے۔ وہ اسی پر اکتفا نہیں کریں گے بلکہ ان کی املاک کو بھی لوٹ کھسوٹ کا نشانہ بنائیں گے۔ لیکن ہماری املاک کی طرف یہ آنکھ اٹھا کر نہیں دیکھ سکیں گے۔ کیونکہ ہم ان کے حملے کے لمحہ سے پہلے ہی سے آگاہ ہوں گے۔ اس وقت تک ہم اپنی املاک کے تحفظ کے لئے مناسب اقدامات کر چکے ہوں گے۔

ہم یہ تو پہلے ہی واضح کر چکے ہیں کہ ترقی تمام غیر یہود کو عقل و دلائل کے اقتدار اعلیٰ تلے لا کھڑا کرے گی۔ ہماری مطلق العنانیت کا راز دانش مندانہ سخت گیری سے بے چینی و بدنظمی کا قلع قمع کرنے اور تمام اداروں سے حریت پسندی اور روشن خیالی کو ختم کرنے میں مضمر ہو گا۔

جب عوام اس امر سے آگاہ ہو جاتے ہیں کہ انہیں ہر قسم کی مراعات اور حقوق، آزادی کے نام پر حاصل ہوئے وہ اپنے آپ کو مقتدر اعلیٰ تصور کرتے ہوئے شورش و ہنگامہ برپا کر کے اقتدار پر قابض ہو جاتے ہیں۔ لیکن ہر کور چشم کی مانند ان کے راستے میں بھی بہت سی رکاوٹیں آتی ہیں تو یہ کسی رہنما کی تلاش میں نکل پڑتے ہیں۔ لیکن ان میں یہ شعور ہی نہیں ہوتا کہ وہ اپنے سابقہ نظام مملکت کی طرف لوٹ جائیں گویا یہ اپنے لامحدود اختیارات ہمارے قدموں میں لا ڈالتے ہیں۔

فرانسیسی انقلاب کو ذہن میں لائیے! ہم نے ہی اسے عظیم کا خطاب بخشا ہے۔ اس کے تمام انتظامات اور اسرار و رموز سے ہم بخوبی آگاہ ہیں کیونکہ وہ ہماری ہی کارستانیوں کا نتیجہ تھا۔ اسی وقت سے ہم مختلف اقوام کو سبز باغ دکھا رہے ہیں۔ انہیں ایک سحر سے دوسرے سحر کی طرف لے کر جاتے ہیں۔ یہاں تک کہ بالآخر وہ ہم سے بھی منہ موڑ کر ہمارے مطلق العنان بادشاہ کی طاعت قبول کرلیں گے جس کا تعلق صیہونی خون سے ہے اور جسے دنیا بھر کی حکمرانی کے لئے تیار کر رہے ہیں۔

ہم ناقابل تسخیر ہیں!

موجودہ دور میں اپنی بین الاقوامی قوت و حیثیت کے باعث ہم ناقابل تسخیر بن چکے ہیں۔

...کہ اگر کوئی طاقت ہم پر حملہ آور ہونے کی جرات کرتی ہے تو دیگر تمام مملکتوں کی ہمیں ...ت حاصل ہوتی ہے۔ یہ غیر یہود اقوام کی شیطنیت اور بد معاشی کی انتہا ہے کہ قوت و ...ت کے سامنے وہ ایسا عجز و انکسار اختیار کر لیتے ہیں کہ پیٹ کے بل بھی رینگنے لگ جاتے ... لیکن کمزوروں کے لئے بے رحم اور جابر واقع ہوئے ہیں۔ معمولی معمولی فروگزاشتوں کو تو ...ف نہیں کرتے لیکن بڑے بڑے جرائم سے درگذر کر جاتے ہیں۔

آزادی معاشرتی نظام کے تضادات کو برداشت نہیں کرتے لیکن ایک نڈر مطلق العنان ...ران کے جبر و استبداد کو شہادت سمجھ کر سہ جاتے ہیں۔ ان کی یہی خصوصیات آزادی کے ...ول میں ہماری معاون ہیں۔ موجودہ دور کے بڑے بڑے آمروں کے ہاتھوں یہ غیر یہود ...ام ایسے ایسے مظالم نہایت صبر و استقامت سے برداشت کر رہی ہیں کہ اس سے کہیں کم ...ائب پر انہوں نے بیسیوں تاجداروں کے سر اڑا دیئے ہوتے۔

اس عجیب و غریب طرز کی آخر توضیح کیا ہے؟ ایک ہی نوعیت کے حالات کے لئے عوام کا ...یہ اس قدر متضاد کیوں ہے؟

اس کی توضیح یوں کی جاتی ہے کہ یہ آمر اپنے کارندوں کے ذریعے اپنے اپنے عوام کے کانوں میں یہ بات پھونک دیتے ہیں کہ مملکتوں کو یہ مصائب و آلام ایک عظیم مقصد یعنی عوام کی فلاح و بہبود نیز عالمی برادری کے قیام اور مساوی حقوق کے حصول کے لئے اٹھانے پڑ رہے ہیں۔ ظاہر ہے کہ وہ اپنے عوام کو یہ بتانے سے قاصر رہتے ہیں کہ ایسا اتحاد تو صرف ہمارے ...ی اقتدار اعلیٰ کے تحت وجود میں آسکتا ہے۔ لہٰذا عوام دیانت داروں کی مذمت کرتے ہیں اور مجرموں کو جرم سے بری قرار دیتے ہیں انہیں اس امر کا مکمل یقین ہوتا ہے کہ وہ جو چاہئے کر سکتے ہیں یہ صورت حال شکریہ کی مستحق ہے کہ عوام قدم قدم پر انتشار و بدنظمی کی فضا پھیلا کر ہر قسم کے استحکام کو خود تباہی سے ہمکنار کر رہے ہیں۔

لفظ "آزادی" عوام کے مختلف طبقات کو ہر قسم کی قوت و طاقت کے خلاف، ہر قسم کے اقتدار کے خلاف جنگ و جدل کی ترغیب دیتا ہے۔ یہاں تک کہ خود خدا اور قوانین فطرت کے خلاف بھی اکساتا ہے۔ اسی لئے جب ہم اپنی سلطنت کا اقتدار سنبھالیں گے تو اس لفظ کو

جو عوام کو خون کے پیاسے درندوں میں تبدیل کرنے والے بے رحم و ظالمانہ جبر و استبداد کے اصول کی دلالت کرتا ہے، زندگی کی لغت ہی سے خارج کر دیں گے۔ یہ بھی درست ہے کہ یہ درندے خون کی پیاس بجھا لینے کے بعد ہر بار غفلت کی نیند سو جاتے ہیں۔ لہٰذا ایسے مواقع پر انہیں آسانی سے پابہ زنجیر کیا جا سکتا ہے۔ لیکن خون پیئے بغیر ان پر غفلت طاری نہیں ہوتی اور وہ جدوجہد میں مصروف رہتے ہیں۔

خفیہ ہتھکنڈے

ہر جمہوریہ کو مختلف مرحلوں میں سے گزرنا پڑتا ہے۔ اس کا پہلا مرحلہ وہ ابتدائی دور ہوتا ہے جس میں ناعاقبت اندیش انبوہ مغلوب الغضب ہو کر ادھر ادھر شورش و فتنہ برپا کرتا ہے۔

دوسرے مرحلے میں فتنہ انگیز خطابت انتشار کو جنم دیتی ہے جس کے نتیجہ میں لازمی طور پر ایسی مطلق العانیت وجود پذیر ہوتی ہے جو اگرچہ غیر قانونی اور غیر ذمہ دار ہوتی ہے لیکن کسی غیر مرئی اور پوشیدہ طاقت کے سامنے جواب دہ ہوتی ہے اور کوئی شخص بھی یہ محسوس کئے بغیر نہیں رہتا کہ یہ استبدادی طاقت کسی خفیہ تنظیم یا کسی ایسی قوت کے ہاتھ میں کھیل رہی ہے۔

جس کی سرگرمیاں پس پردہ ہونے کی باعث بالعموم مکر و فریب اور بددیانتی ہی پر مبنی ہوتی ہیں۔ اور ہر قسم کے کارندوں کی آڑ میں ہمہ وقت جاری و ساری رہتی ہیں۔ وقتاً فوقتاً کارندوں میں ردوبدل اس خفیہ طاقت کو کسی قسم کا نقصان پہنچانے کی بجائے درحقیقت اس کی اعانت و معاونت کا باعث بنتی ہیں۔ کیونکہ اس طرح وہ ان کی طویل خدمات کے صلے میں معاوضہ دینے اور اپنے وسائل کے ضیاع سے بچ جاتی ہے۔

کون ہے جو اس غیر مرئی طاقت کا تختہ الٹ سکے؟

یہ خفیہ طاقت ہماری طاقت ہے اور غیر یہودی مشینری اندھا دھند ہمارے عزائم کے لئے آڑ کا کام دے رہی ہے۔ ہماری قوت کا لائحہ عمل اور ہماری سرگرمیوں کا اصل مقام دنیا کے لئے ایک معمے کی صورت اختیار کئے ہوئے ہے۔

یاد رکھئے! کہ آزادی بے ضرر ہو سکتی ہے اور عوامی فلاح و بہبود کو کسی قسم کا نقصان پہنچائے بغیر ملکی معیشت کی جگہ پا سکتی ہے، اگر اس کی اساس اللہ تعالیٰ پر ایمان اور انسانی بھائی چارے پر رکھی گئی ہو ایسا بھائی چارہ جو اصول تخلیق کے منافی فلسفہ مساوات سے کوئی تعلق نہ رکھتا ہو۔ کیونکہ فطرت کا اصول تخلیق انسانوں میں درجہ بندی اور محکومیت کے تصور کا علمبردار ہے۔ مذکورہ اعتقاد کے تحت حکومت کے لئے عوام کو مذہبی حلقوں میں تقسیم کیا جا سکتا ہے۔ اور وہ اللہ تعالیٰ کی رضا پر سر تسلیم خم کرتے ہوئے روحانی پیشواؤں کی راہنمائی میں قناعت اور استغنا عجز و انکساری سے نہایت مطمئن زندگی گزار سکتے ہیں۔

اسی لئے تو ہمارے مقاصد کی تکمیل کے لئے لازمی ہے کہ تمام مذاہب کی اہمیت کو ختم کر کے غیر یہودیوں کے اذہان سے الوہیت اور روحانیت کے تصور کی بیخ کنی کر دی جائے اور انہیں مادی ضروریات نیز حسابی اعداد و شمار کے چکر میں الجھا کر رکھ دیا جائے۔

غیر یہودیوں کو صنعت و تجارت کے چکر میں ایسا پھنسا جائے کہ انہیں غور و فکر اور سوچ بچار کے لئے کوئی وقت ہی نہ مل سکے۔ اس طرح تمام اقوام حب زر اور منفعت بازی کے تعاقب میں خود ہی اپنے پاؤں پر کلہاڑا مار لیں گے۔ اس دوڑ میں ہمہ تن منہمک ہونے کے باعث وہ اپنے مشترکہ دشمن کی طرف کسی قسم کی توجہ نہیں دے سکیں گے۔ یہ امر ملحوظ رہے کہ غیر یہود اقوام کی آزادی کو ان کی دائمی تباہی و بربادی کا سامان بنانے کے لئے صنعت کو سٹے کی بنیادوں پر استوار کرنا ضروری ہے۔ اس کا نتیجہ یہ ہو کہ اراضی سے جو کچھ صنعت کے ذریعے حاصل ہو گا۔ وہ مختلف ہاتھوں سے نکلتے ہوئے سٹے کے بازاروں میں پہنچ کر بالآخر ہماری ہی قوم کو منتقل ہو جائے گا۔ برتر حیثیت اور اعلیٰ مناصب کے حصول کے لئے شدید قسم کی جدوجہد اور عوام کی معاشی زندگی پر پے در پے جھٹکوں سے ضمیر فروش، بے حس اور بے رحم فرقے جنم لیں گے بلکہ حقیقت تو یہ ہے کہ وہ پہلے ہی وجود میں آ چکے ہیں۔

اس قسم کے فرقے، اعلیٰ درجے کی سیاست، سیاسی نظام اور مذہب سے شدید طور پر متنفر ہوں گے۔ ان کا ایک ہی دیوتا ہو گا اور وہ ہے منفعت بازی۔ زر اور زر ہی ان کا مذہب و مسلک ہو گا۔ کیونکہ مادی مسرتوں اور راحتوں کا حصول صرف اسی کے ذریعے ممکن ہے۔

.. پر وہ وقت آئے گا جب کسی نیک مقصد کے پیش نظر نہیں نہ ہی مال و دولت کے حصول کے لئے بلکہ اجارہ داری کے خلاف شدید نفرت کے باعث غیر یہودی اقام کے نچلے طبقے ہماری اشاروں پر اپنے مفکرین' مدبرین اور قائدین' جو حصول طاقت کی دوڑ میں ہمارے حریف ہیں' کے خلاف اٹھ کھڑے ہوں گے۔

انٹیلی جنس

جب ہم محسوس کرنے لگیں کہ اپنی سلامتی کے متعلق خفیہ اقدامات کو مزید مستحکم کرنا ہے تو ہم معاشرے میں بھی دکھاوے کے طور پر افراتفری کا ماحول پیدا کریں گے۔ پھر ہمارے ایما ہی پر اعلیٰ قسم کے مقررین اس مصنوعی بے چینی کا برملا اظہار کریں گے۔ نتیجتہ ان مقررین کے گرد ایسے لوگ جمع ہو جائیں گے جو ان کے خیالات و نظریات سے متفاق ہوں گے۔

یہ طریق اختیار کرنے سے ہمیں لوگوں کی خانہ تلاشی کا جواز بھی مل جائے گا۔ تلاشی اور نگرانی کا کام ہم نے کاسہ لیس غیر یہودی پولیس کے ذریعے سرانجام دیا کریں گے۔

اکثر اوقات سازشیوں کی اکثریت محض تفنن طبع کے پیش نظر اور بعض اوقات ڈینگیں بگارنے کی خاطر اس قسم کا سوان بھر لیتی ہے۔ حالانکہ ان کا کسی سازش سے کوئی سرو کار نہیں ہوتا۔ اسی لئے جب تک وہ علانیہ طور پر ان سرگرمیوں میں حصہ نہ لیں گے ہم ان پر ہاتھ نہیں اٹھائیں گے۔ البتہ بعض عناصر کے ذریعے ان کی نگرانی شروع کر دی ج ائے گی۔ یہ امر ملحوظ رہے کہ اگر حکومت آئے دن اپنے خلاف سازشیں پکڑتی رہے تو اس کے جاہ و جلال و وقار میں کمی آجاتی ہے۔ بلکہ اس امر کی دلالت بھی ہوتی ہے کہ اسے خود اپنی کمزوریوں اور خامیوں بلکہ اس سے بھی بدتر کیفیت یعنی بے انصافیوں کا احساس ہے۔

یہ تو آپ کو پہلے ہی معلوم ہے کہ ہم نے اپنے کارندوں کے ذریعے غیر یہودی بادشاہوں پر بار بار کے قاتلانہ حملوں سے ان کا وقار خاک میں ملا دیا ہے۔ یہ کارندے ہمارے گلے کی اندھی بھیڑیں ہیں۔ جنہیں سیاسی رنگ میں رنگے ہوئے حریت و آزادی کے چند نعرے دے کر باآسانی ہر جرم پر آمادہ کیا جا سکتا ہے۔

ہم نے حکمرانوں کو اپنے تحفظ سے متعلق اقدامات کے اعلانیہ طور پر تشہیر کرنے اور نیز انہیں اپنی کمزوری کو تسلیم کرنے پر مجبور کر دیا ہے۔ اس طریق کار سے ہم نے ان کے تدار کو تباہی سے ہمکنار کر دیا ہے۔ ہمارے حکمران کی حفاظت خفیہ طور پر ایک غیر معروف فاظتی ہاتھ سے کی جائے گی۔ کیونکہ ہم اس تصور کو قبول کرنے کو تیار ہوں گے کہ اس کے ف کوئی ایسی بغاوت ہو سکتی ہے جس پر وہ قابو نہ پا سکے اور وہ اپنی حفاظت پر مجبور ہو۔ اگر ہم اس تصور کو قبول کر لیں جیسا کہ غیر یہودی کر چکے ہیں یا بعض ایک کر رہے ہیں تو اس کا واضح مطلب یہ ہو گا کہ ہم اگر اپنے حکمران کی نہیں تو زود یا بدیر ان کے خاندان کی موت کے کم نامے پر دستخط کر رہے ہیں۔

بظاہر سختی سے نافذ شدہ قوانین کے تحت ہمارا حکمران اپنے اختیارات کو قوم کی فلاح و بہبود کے لئے استعمال کرے گا اور کسی صورت بھی اپنے یا اپنے خاندان کے مفادات کو ترجیح نہیں دے گا۔ اس کی یہی شائستگی اس کے اقتدار کی قدر و منزلت کا باعث بنے گی بلکہ خود رعایا اس کی حفاظت پر کمربستہ رہے گی۔ اس کی مدح اس اعتراف میں مضمر ہو گی کہ ریاست کے ہر شہری کی فلاح و بہبود اسی کے اقتدار سے وابستہ ہے۔ کیونکہ عوامی زندگی کے تمام نظم و نسق اور امن عامہ کا انحصار اسی پر ہو گا۔ یہی مدح سرائی اس کی تقدیس کا باعث ہو گی۔

علانیہ حفاظتی اقدامات حکمران کی قوت و اقتدار کی تنظیم کی کمزوری پر دلالت کرتے ہیں۔ البتہ جب ہمارا حکمران عوام میں گھر ہو گا تو اس کے گرد اگلی صفوں میں زن و مرد کا ایسا ہجوم ہو گا۔ جو بظاہر مشتاق اور طالب دید دکھائے دے گا او یہ تاثر دے رہا ہو گا کہ وہ اتفاقیہ طور پر وہاں اکٹھا ہو گیا ہے۔ (حالانکہ وہ ہماری طرف سے متعین ہو گا) اس عمل سے دوسرے لوگ بادشاہ کی طرف احتراماً آگے نہیں بڑھیں گے جیسا کہ یہ اعلیٰ نظم و ضبط کے لئے بھی ضروری دکھائی دیتا ہے اس سے دوسروں کے لئے بھی ضبط نفس کی مثال قائم ہو گی۔ اگر کوئی دار خواہ بھیڑ چیر کر بادشاہ کو کوئی درخواست پیش کرتا ہوا دھائی دے گا تو اگلی صفوں کے لوگ متعلقہ درخواست کو لے کر سائل کی موجودگی ہی میں حکمران کے حوالے کر دیں گے۔ تاکہ سب کو معلوم ہو جائے کہ مذکورہ درخواست منزل مقصود پر پہنچ گئی ہے۔ اس سے لوگوں پر

واضح ہو جائے گا کہ تمام امور مملکت پر بادشاہ کا اپنا ہی کنٹرول ہے۔ تاج سلطانی کے قیام وبقا کے لئے ضروری ہے کہ عوام یہ کہتے ہوئے سنائی دیں "کہ اگر بادشاہ کو یہ معلوم ہوتا، یا بادشاہ تک یہ بات پہنچ کر رہے گی۔"

جیسا کہ قبل ازیں ذکر کیا جا چکا ہے کہ حکمران کے لئے سرکاری انتظامات کے باعث اقتدار کا پر اسرار وقار ختم ہو کر رہ جاتا ہے۔ نیز اگر کسی کی معمولی سی جسارت کو نظر انداز کر دیا جائے تو ہر شخص دلیری و بے باکی پر اتر آتا ہے اور باغیوں میں اپنی قوت و طاقت کا احساس پیدا ہو جاتا ہے اور اس لمحہ کے منتظر رہتے ہیں کہ موقع ملتے ہی اقتدار پر حملہ کر دیں۔ لیکن غیر یہود کو ہم اس کے برعکس تعلیم دیتے ہیں۔ تاہم انہیں کے تجربہ سے تو ہم نے سبق حاصل کیا ہے کہ علانیہ تحفظ کے اقدامات نے ان کا کیا حشر کر رکھا ہے۔

یاد رہے کہ شک و شبہ کا اولین معقول جواز ملتے ہی فوری طور پر ہم مجرموں کو گرفتار کر لیں گے۔ کیونکہ کسی امکانی غلطی کے خوف سے اس امر کی اجازت نہیں دی جا سکتی کہ سیاسی غلطیوں اور جرائم کے مرتکب یا مشتبہ افراد کو بچ نکلنے کا موقع دیا جائے۔ اس معاملے میں ہم قطعاً بے رحمی کا مظاہرہ کریں گے۔ بفرض محال کسی نکتے پر مزید قیاس آرائی کی راہیں اختیار کر بھی لی جائیں اور معمولی جرائم کے پس پشت محرکات پر دوبارہ غور و خوض کیا جائے تب بھی ہم ان لوگوں کو قطعاً معاف نہیں کریں گے۔ جنہوں نے ایسے امور میں دخل اندازی کی کوشش کی ہو جنہیں حکومت کے سوائی کوئی نہیں سمجھ سکتا اور حقیقت تو یہ ہے کہ صحیح پالیسی کو سمجھنا بھی ہر حکومت کے بس کا روگ نہیں ہوتا۔

غیر یہودیوں سے نمٹنے کے لئے

اگر ہم عوام کو سیاسی امور میں ملوث ہونے کی آزادی نہ بھی دیں، تاہم ان کی حالت بہتر بنانے کے لئے حکومت کے پاس درخواستوں اور عرضداشتوں کے ذریعے تجاویز پیش کرنے کی حوصلہ افزائی کی جائے گی۔ اس طریق کار سے ایک طرف تو مختلف خامیاں ہمارے علم میں رہیں گی اور دوسری طرف ہم رعایا کے خیالی منصوبوں سے آگاہ رہیں گے اور رد عمل کے طور

ہم یا تو ان تجاویز کو عملی جامعہ پہنا دیں گے یا نہایت دانش مندی سے انہیں غلط ثابت تے ہوئے مسترد کر دیں گے تاکہ غلط تجویز پیش کرنے والے پر اس کی کوتاہ اندیشی واضح ہو ئے۔

باغیانہ تقریریں کرنے والے کی حیثیت ہاتھی پر بھونکنے والے پالتو پلے سے زیادہ نہیں ہو ایک منظم حکومت، جس کے ہاتھ پولیس کے بل بوتے پر نہیں بلکہ عوامی قوت مضبوط ں کی نزدیک ان امور کی حیثیت ایسے ہی ہے جیسے کوئی گھریلو پلا اپنی طاقت اور مقام سے ے خبر ہاتھی پر بھونکنے کی کوشش کرے۔ دونوں کی اہمیت کا تناسب واضح کرنے کے لئے ب تنبیہہ کی ضرورت ہوگی اور یہ پہلے بھونکنا بند کر دیں گے بلکہ ہاتھی کو دیکھتے ہی شامدانہ انداز میں دم ہلانا شروع کر دیں گے۔

ہم سیاسی جرائم کو بھی چوری، قتل اور ہر قسم کے گھناونے جرائم کی فہرست میں شامل کر ے اخلاقی جرائم کی مانند عدالتی کاروائی کے تحت لے آئیں گے تاکہ ان کا ارتکاب کرنے لوں کو جانباز، بہادر اور اولوالعزم نہ تصور کی جائے بلکہ ان کا وقار خاک میں مل کر رہ جائے۔ ں طرح سیاسی اور دوسرے جرائم سے متعلق نکتہ نظر خلط ملط ہو جائے گا اور اول الذکر کو باعث ننگ سمجھا جانے لگے گا نیز عوام انہیں نفرت کی نگاہ سے دیکھنے لگیں گے۔

ہم نے اس امر کی بھرپور کوشش کی ہے اور میں یہ سمجھتا ہوں کہ ہم اس میں کامیاب ہو گئے ہیں کہ غیر یہود بغاوت انگیز تقریروں سے مقابلہ کرنے کے طریقے کو نہ اپنا سکیں۔ مقصد کے حصول کے لئے ہم نے پریس اور بالواسطہ تقریروں نیز نہایت ہوشیاری اور کی سے مرتب کی گئی تاریخ کی نصابی کتب کے ذریعے ایک ایسی شہادت و قربانی کے تصور تشہیر کی ہے جس کے متعلق کہا جاتا ہے کہ اسے باغیانہ تقریریں کرنے والے عوامی فلاح و کے پیش نظر قبول کر چکے ہیں۔ اس تصور کی تشہیر سے حریت پسندوں کی جماعت میں فہ ہو گیا ہے اور مزید ہزاروں غیر یہودی ڈھور ڈنگروں کی صفوں میں شامل ہو گئے ہیں۔

ئے عامہ کی گمراہی کیسے ممکن ہے؟

یہ بات اچھی طرح ذہن نشین کر لیجئے کہ آج کی حکومتیں اور عوام موجودہ سیاسی نظام کی

ظاہری ہیئت و ترکیب سے بالکل مطمئن ہیں۔ دراصل غیر یہود کے لئے واقعات و حالات کی تہہ تہ پہنچنا ممکن بھی کیسے ہو سکتا ہے جبکہ خود ان کے نمائندوں کی ساری طاقت و عیش و عشرت کے حصول میں صرف ہو رہی ہے؟ ہماری حکمت عملی کی کامیابی کے لئے انتہائی ضروری ہے کہ ہم تمام امور کی تفصیلات سے باخبر رہیں۔ کیونکہ تقسیم اختیارات، آزادی تقریر، آزادی پریس، آزادی مذہب، انجمن سازی کی آزادی، املاک کا تحفظ اور رہائشی ٹیکس اور بعض دیگر ٹیکس (خصوصاً ٹیکسوں کی چوری) قوانین کی داخلی ق وت جیسے مسائل پر غور و خوض کے وقت ان تفصیلات سے آگہی ہمارے لئے معاون ثابت ہوگی۔

یہ تمام مسائل ایسے ہیں کہ انہیں عوام کے سامنے براہ راست علانیہ طور پر زیر بحث نہیں لا جا سکتا اور اگر بالفرض کبھی ان کا چھیڑنا ناگزیر ہو جائے تو ان کا واضح طور پر نام نہ لیا جائے۔ تفصیلات میں الجھے بغیر اتنا اعلان ہی کافی ہے کہ ہم موجودہ قوانین کے تمام بنیادی اصولوں کو تسلیم کرتے ہیں۔ اس ضمن میں خاموشی ہمارے لئے اس لحاظ سے مفید ہوگی کہ کسی اصول کا نام لئے بغیر کام کرنے سے ہم ہر قسم کی کاروائی کے لئے آزاد ہوں گے۔ ہم لوگوں کو متوجہ کئے بغیر موقع محل کے مطابق کسی اصول کو اپنا کر اور کسی کو مسترد کر کے اپنے مقاصد کو پایہ تکمیل تک پہنچا سکیں گے لیکن ان اصولوں کا علیحدہ علیحدہ نام لینا ان کی توثیق کے مترادف ہوگا۔

یاد رکھئے! عوام سیاسی طاقت کے مالک ذہین افراد کے لئے بالعموم اپنے دل میں بے پناہ عزت و احترام کے جذبات رکھتے ہیں اور ان کی تمام جارحانہ کاروائیوں کو بھی بنظر تحسین دیکھتے ہیں۔ آپ انہیں اکثر الفاظ دہراتے ہوئے سنیں گے۔ ہاں ہاں یہ شیطنیت ہے، بھئی خوب! ہاں یہ بدمعاشی تو ہے لیکن اس میں ذہانت بھی ہے۔ تم اسے چال کہہ لو لیکن کتنی عیاری سے چلی گئی ہے؟ اس فریب میں کتنی خوبصورتی ہے کتنی دیدہ دلیری ہے؟ کتنی جسارت ہے؟۔

ہم تمام اقوام کو اپنے بنیادی ڈھانچے کی تعمیر کی طرف متوجہ کر لیں گے جس کا منصوبہ ہم نے تیار کر لیا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ سب سے پہلے ہمارے لئے یہ امر ناگزیر ہے کہ ہم اپنے

آپ کو مسلح کر لیں اور دلیری، بے باکی، جسارت، جوش و ولولہ اور ناقابل تسخیر قوت کا مجسمہ بن جائیں۔ انہی اوصاف کے باعث ہمارے سرگرم کارکن اپنے راستے کی تمام رکاوٹوں اور مزاحمتوں کو دور کر سکیں گے۔ ہم مختلف اقوام کو مخاطب کرتے ہوئے کہیں گے۔

"ہر معاملہ ابتری سے ہمکنار ہے۔ آلام و مصائب کے ہاتھوں سب بے حال ہو چکے ہیں۔ اب ہم آپ کے مصائب کے تمام اسباب یعنی قومیتوں، سرحدوں اور سکوں کے اختلافات کو ختم کر دیں گے آپ کو اختیار ہے کہ ہمیں سزاوار ٹھہرائیں لیکن کیا انصاف کیا کا تقاضا یہ نہیں کہ ہم جو کچھ آپ کو پیش کر رہے ہیں اس کو پہلے پرکھ تو لیں؟"

اس موقع پر عوام ہمارے گن گائیں گے۔ متفقہ طور پر امیدوں اور توقعات کا جشن مناتے ہوئے ہمیں اپنے کندھوں پر اٹھا لیں گے اور پھر رائے شماری جسے ہم بطور ایک حربہ استعمال کر رہے ہیں، ہمیں تمام دنیا کے تخت و تاج کا مالک بنا دے گی۔ یہ حربہ انسانی نسل کی چھوٹی سے چھوٹی اکائیوں کو مختلف مجالس کے ذریعے اور گروہوں کے مابین معاہدوں کے ذریعے رائے شماری کا طریقہ سکھائے گا۔ اس طرح بالآخر یہ اپنے مقصد کو پہنچ کر رہے گا۔ اس کا آخری کردار یہ ہوگا کہ لوگ ہمیں برا بھلا کہنے اور مورد الزام ٹھہرانے کی بجائے ہمارے ساتھ قریبی تعلقات استوار کرنے کے لئے بیک زبان اپنی خواہش کا اظہار کریں گے۔ اس مقصد کے لئے طبقات و تعلیمی قابلیت کے معیار کو ملحوظ رکھے بغیر ہر شخص کو رائے دہندگی کا حق دیا جائے گا۔ واضح اکثریت کے حصول کے لئے یہ لازمی ہے کیونکہ تعلیم یافتہ اور صاحب جائیداد رائے دہندگان سے ان اکثریت کی توقع عبث ہے۔ اس طرح ہم تمام غیر یہودیوں میں اپنی ذاتی اہمیت کا احساس کو بیدار کر کے خاندان کی اہمیت اور اس کی تعلیمی افادیت کا خاتمہ کر دیں گے علاوہ ازیں ہم اختلافات پیدا کرنے کی انفرادی کوششوں کے امکان کو بھی ختم کر دیں گے۔ کیونکہ ہم کو عوام الناس پر پورا اختیار حاصل ہوگا۔ وہ ہمارے ہاتھوں میں کھیل رہے ہوں گے اور وہ ایسے افراد کو نہ تو آگے بڑھنے دیں گے اور نہ ان کی کسی بات پر کان دھریں گے۔ وہ صرف ہماری باتیں سننے کے عادی ہوں گے کیونکہ اس فرماں برادری اور توجہ کی ہم انہیں قیمت ادا کریں گے اس طریق سے ہم ایک ایسی بے بصیرت، ناعاقبت اندیش

لیکن طاقت ور قوت پیدا کرنے میں کامیاب ہو جائیں گے جو ہمارے کارندوں کی رہنمائی کے بغیر کوئی بھی راہ اختیار کرنے سے قاصر رہے گی ان رہنماؤں کو ہم عوامی قائدین کی صورت میں پیش کریں گے۔ عوام بلا چوں چرا اس حکومت کے سامنے سر خم تسلیم کر دیں گے کیونکہ اس امر سے وہ اچھی طرح واقف ہوں گے کہ ان کا زور گاران کی اجرتیں اور باقی تمام قسم کے فوائد کا حصول انہی قائدین کی ذات سے وابستہ ہے۔

حکومت کا کوئی ایک منصوبہ ہمیشہ ایک اور صرف ایک ذہن کی پیداوار ہونا چاہئے کیونکہ کئی ایک اذہان کی تیار کردہ مختلف شقیں اور اجزاء نہ صرف جامعیت سے محروم رہتے ہیں بلکہ ان کی گرفت بھی مضبوط نہیں ہوتی لہٰذا اس منصوبے کو عملی جامعہ پہنانے سے متعلق طریق کار سے آگہی تو ہم حاصل کر سکتے ہیں لیکن اسے زیر بحث نہیں لا سکتے مبادا ہم اس میں پنہاں فریب کاریوں، اس کے مختلف حصوں کی باہمی ربط و انحصار، ہر شق کے خفیہ معانی کی عملی قوت کو نقصان پہنچانے کا باعث بن جائیں۔

اس قسم کے مشکل اور محنت طلب منصوبے کو زیر بحث لانا اور متعدد رائے شماریوں کے ذریعے اس میں ترمیم کرنا، اس پر ایسے دلائل اور غلط تعبیروں کو مہر لگانے کے مترادف ہو گا جو اس سکیم کی گہرائی اور وسعت کو نہ پہنچ سکے ہم چاہتے ہیں کہ ہماری سکیمیں موثر بھی ہوں اور خوب حزم و احتیاط سے تیار بھی کی گئی ہوں۔ اس لئے ہمیں اپنے ذہین و فہیم لوگوں کے کام کو عوام یا سلیکٹ کمیٹی کے زہریلے دانتوں کی نذر نہیں کرنا چاہئے۔

ہمارے منصوبے فوری طور پر موجودہ اداروں کو تلپٹ نہیں کریں گے بلکہ صرف ان کی معیشت و اقتصاد میں تبدیلیوں کا باعث بنیں گے اور بالآخر ان کی ترقی کی رفتار مجموعی طور پر متاثر ہو کر ہمارے منصوبوں کی متعینہ راہوں پر چل نکلے گی۔

اس وقت دنیا کے تمام ممالک میں مختلف ناموں کے تحت تقریباً ایک ہی قسم کا نظام موجود ہے نمائندگی، وزارت، سٹیٹ کونسل، مجلس قانون ساز جیسے ادارے ہر ملک میں موجود ہیں۔ ان اداروں کے باہمی تعلقات کی نوعیت بیان کرنے کی ضرورت محسوس نہیں کرتا کیونکہ آپ لوگ ان سے بخوبی واقف ہیں۔ آپ صرف اس امر کو پیش نظر رکھئے کہ ان میں سے ہر ادارہ

ملک کے کسی نہ کسی اہم کام کو سرانجام دینے کا ذمہ دار ہے اور میں یہ بھی واضح کر دوں کہ لفظ اہم میں نے ادارے کے لئے نہیں بلکہ کام کے لئے استعمال کیا ہے لہٰذا نتیجہ واضح ہے کہ ہمارے ان اداروں کو کوئی اہمیت نہیں دراصل وہ فرائض اہم ہیں جو یہ ادارے سرانجام دیتے ہیں ان اداروں نے اپنے درمیان حکومت کے تمام انتظامی، قانون ... کے فرائض کو تقسیم کر رکھا ہے۔

اس طرح یہ انسانی جسم کے اعضاء کی طرح مصروف کار ہیں۔ اگر ہم کسی مملکت کی مشینری کے کسی ایک حصے کو نقصان پہنچاتے ہیں تو انسانی جسم کی مانند مملکت بھی بیماری کا شکار ہو جاتی ہے اور نتیجتہ فنا ہو کر رہتی ہے۔

جب ہم نے ریاستوں کے نظام میں حریت پسندی کا زہر بھر دیا تو ان کا تمام سیاسی رنگ ہی تبدیل ہو کر رہ گیا اب ریاستیں ایک مہلک بیماری کا شکار ہو چکی ہیں۔ ان کے خون میں زہر پیدا ہو چکا ہے اب ہمیں صرف ان کے عالم نزع کا انتظار ہے۔ حریت پسندی کے نتیجے میں آئینی حکومتیں وجود میں آ چکی ہیں جنہوں نے غیر یہود کے واحد تحفظ مطلق العانیت کی جگہ لے لی ہے۔

آپ بکوبی جانتے ہیں کہ کسی بھی دستور کی حیثیت اختلافات، غلط فہمیوں، جھگڑوں، ناانصافیوں، بے ثمر جماعتی شورشوں، جماعتی ادہام کی درس گاہ کے ... کچھ نہیں ہوتی۔ یہ ہر اس چیز کا ملغوبہ ہوتا ہے جو ریاستی سرگرمیوں کی تمام خصوصیات کو ... رکھ دیتا ہے۔

باتونی افراد کے اس پلیٹ فارم نے بھی حکمرانوں کو مجبور و بے بس بنانے میں پریس سے بھی کوئی کم کردار ادا نہیں کیا ہے۔ لہٰذا بہت سے ممالک کے حکمران جب بے کار اور فاضل ہو کر رہ گئے تو انہیں اقتدار سے محروم کر دیا گیا۔ اس عمل کے بعد ہی جمہوریتوں کے دور کا حصول ممکن ہوا اور پھر ہم نے حقیقی حکمرانوں کی جگہ ان کے عوام ہی میں ایسے افراد جو ہماری غلامی کا دم بھرتے تھے اقتدار کی گدی پر بطور صدر لا بٹھائے۔ یہ کٹھ پتلی مخلوق متعلقہ حکومتوں کے لئے باعث تضحیک تھی۔ یہ ایک بارودی سرنگ کی بنیاد تھی۔ جو ہم نے غیر یہود بلکہ غیر یہودی اقوام کہنا چاہئے کے نیچے بچھا دی۔

مستقبل قریب میں صدر کے اختیارات کا بھی تعین کردیں گے اس وقت تک ہم اس قابل ہو جائیں گے کہ جن امور کے لئے ہمارا آلہ کار برائے نام حکمران ذمہ دار ہو گا۔ قانون کی ظاہری صورتوں کی پرواہ کئے بغیر انہیں پایہ تکمیل تک پہنچادیں۔ ہمیں اس کی ہرگز کوئی پرواہ نہیں اگر اقتدار کے بھوکوں کی صفوں میں کمی کی جائے یا صدارتی امیدواروں کا حصول ناممکن ہو جائے اور اس عمل کے رکنے سے بحران پیدا ہو جائے اور بالاخر متعلقہ ملک ہی ٹکڑے ٹکڑے ہو کر رہ جائے؟ اپنے منصوبے کو کامیاب بنانے کے لئے ہم ایسے صدارتی امیدواروں کے حق میں انتخابات کرائیں گے جن کا ماضی سیاہ ہو۔ جن کے دامن داغ دار ہوں۔ لیکن وہ ناپاک داغ پردہ اخفا میں ہوں۔ اسی صورت میں یہ لوگ ہمارے منصوبوں کی تکمیل کے لئے معتمد ایجنٹ ثابت ہو سکیں گے۔ کیونکہ ایک طرف تو انہیں اپنے راز کے افشا ہونے کا خطرہ دامن گیر رہے گا اور دوسری طرف اقتدار و اختیارات، مختلف مراعات و فوائد نیز صدارتی عہدے کے جاہ و حشمت سے چمٹے رہنے کی خواہش غالب ہو گی۔

ایوان نمائندگان کی حیثیت تو صدر کے لئے محض ایک آڑ کی سی ہو گی۔ وہ صدر کو منتخب ک رے گا اور اسے تحفظ مہیا کرے گا۔ لیکن ہم چیمبر کو نئے قوانین بنانے یا پہلے سے موجود قوانین میں ترامیم کرنے کے حق سے محروم کردیں گے اور یہ حق جواب وہ صدر کو تفویض کر دیں گے جس کی حیثیت ہما ے ہاتھوں میں کٹھ پتلی کی سی ہو گی۔ یہ قدرتی امر ہے کہ صدر کے اختیارات ہر ممکن تنقید کا نشانہ بن جائیں گے لیکن ہم اسے اپنے بچاؤ کے لئے عوام کے سامنے اپیل کرنے کا حق دیں گے۔

وہی ناعاقبت اندیش عوام جو ہمارے غلام ہیں۔ صدر کے حق میں ان کا فیصلہ اپنے نمائندوں سے بالا ہی ہو گا۔ چیمبر سے مشورہ کئے بغیر ہم صدر کو اعلان جنگ کرنے کا حق بھی دے دیں گے اور اس کا جواز اس طرح پیش کریں گے کہ ملک کی تمام فوج کے سربراہ کی حیثیت سے اسے صدر کے دائرہ اختیار ہی میں رہنا چاہئے تاکہ ضرورت پڑنے پر وہ نئے جمہوری دستور کے ذمہ دار نمائندے کی حیثیت سے ان کی حفاظت کر سکے۔ لہٰذا یہ سمجھنا آسان ہے کہ ان حالات کے تحت کزینے کی چابی ہمارے ہاتھ میں رہی گی اور ہمارے علاوہ کوئی اور طاقت قانون سازی کی قوت کو حرکت نہیں لا سکے گی۔

نئے جمہوری دستور کے نفاذ کے ساتھ ہی ایوان سے سیاسی رازداری کی آڑ، سرکاری اقدامات پر تفصیلات طلب کرنے اور سوالات کرنے کا حق واپس لے لیا جائے گا۔ نئے آئین کے تحت نمائندوں کی تعداد میں بھی خاصی کمی کردی جائے گی۔ اس طرح نسبتاً سیاسی جذبات اور سیاست کے لئے جوش و ولولے میں کمی آجائے گی۔ ان کے باوجود اگر ان کے جذبات شعلوں کی صورت میں بھڑک اٹھیں جس کی بہت کم امید ہے تو ہم عوام الناس کی اکثریت کے پاس پر زور اپیل لے کر جائیں گے اور انہیں کالعدم قرار دلوایں گے۔ صدر ہی چیمبر اور سینٹ کے پریذیڈنٹ اور روائس پریذیڈنٹ کا تقرر عمل میں لائے گا۔

پارلیمنٹ کے اجلاس متواتر منعقد کرنے کی بجائے صرف چند ماہ کی کاروائیوں تک محدود کردئے جائیں گے علاوہ ازیں، صدر انتظامیہ کے سربراہ کی حیثیت سے پارلیمنت کا اجلاس ب لا سکے گا۔ اور اسے منسوخ کر سکے گا۔ موخر الذکر صورت میں وہ نئی پارلیمانی اسمبلی کے انتخابات کروانے میں تاخیر بھی کر سکتا ہے۔ ہمارے منصوبے کی تکمیل سے پہلے ہی ہماری کاروائیوں کے نتائج کے ل ئے جو دراصل غیر قانونی ہوں گی صدر کو ذمہ دار نہ ٹھہرا لیا جائے۔ ہم وزراء اور انتظامیہ کے دیگر اعلیٰ افسروں کو اس امر پر اکسائیں گے کہ وہ صدر کے اختیارات کو تنقید سے بچانے کے لئے اپنے طور پر کچھ اقدامات کریں اس طرح صدر کی جگہ انہیں قربانی کا بکرا بنا دیا جائے گا۔

ہماری خواہش ہے کہ کسی ایک افسر کی بجائے یہ کام وزراء کونسل کے ذمہ لگایا جائے۔ جن قوانین کی کئی ایک تاویلیں کی جا سکتی ہیں۔ صدر ان کی وہی تاویل کرے گا جو ہماری حسب منشا ہو گی۔ صدر کو ہمارے اشارے پر قوانین کو منسوخ بھی کرنا پڑے گا۔ اسے مملکت کے اعلیٰ مفادات کی آڑ میں عارضی نوعیت کے نئے قوانین رائج کرنے اور آئین سے انحراف کا اختیار ہو گا۔ ان اقدامات سے بتدریج تمام مروجہ ادارے زیر و زبر ہو جائیں گے مختلف مملکتوں میں اختیارات حاصل کرنے کے بعد انہیں اس تغیر کے لئے تیار کرنے پر مجبور ہوتے ہیں کہ ہر قسم کے آئین کو غیر محسوس طریقے سے ختم کردیا جائے۔ اس طریق سے وہ

وقت بھی آپہنچے گا جب ہر مملکت ہماری مطلق العنان حکومت کے زیر نگیں ہو گی۔

آئین کی تباہی سے پیشتر بھی ہماری مطلق العنان حکومت کو تسلیم کیا جا سکتا ہے۔ یہ وہ اہم لمحہ ہو گا جب لوگ نااہل حکمرانوں کی بدعنوانیوں اور نااہلیوں، جو ہماری پیدا کردہ ہوں گی، سے تھک کر پکار اٹھیں گے "انہیں دور لے جایئے اور ہمیں اس کرہ ارض کے لئے ایک بادشاہ دے دیجئے جو ہمیں متحد کر دے اور اختلاف و انتشار کے تمام اسباب، تمام سرحدوں، سب قومیتوں، کل مذاہب اور ہر قسم کے ریاستی قرضوں سے نجات دلا دے۔ ہمارے دامن کو امن و سکون کی دولت سے بھر دے جو موجودہ حکمرانوں اور نمائندوں کے زیر سایہ مفقود ہے۔

لیکن آپ سب بخوبی جانتے ہیں کہ تمام اقوام کی طرف سے ایسی سب خواہشات کے اظہار کو ممکن بنانے کے لئے یہ امر ناگزیر ہے کہ سب ملکوں میں عوام کے تعلقات اپنی حکومتوں کے ساتھ اس حد تک بگاڑ دیئے جائیں کہ انسانیت انتشار و نفرت، کش مکش، حسد رقابت، جسمانی اذیت، فاقہ کشی، بیماریوں میں اضافے اور تنگی و عسرت کے ہاتھوں تھک کر بے حال ہو جائے اور تمام کے تمام غیر یہودی زر و مال اور دوسرے امور میں قطعی طور پر ہمارے اقتدار اعلیٰ کے سائے تلے پناہ لینے پر مجبور ہو جائیں۔

لیکن اگر ہم نے لوگوں کو دم لینے کی مہلت دی تو اس لمحے کا آنا ناممکن ہو گا جس کے ہم بے تابی سے منتظر ہیں۔

ابلیسی نظام کا احیاء

ایسی قوم کو کون سا طرز حکومت دیا جا سکتا ہے۔ جن کے رگ و ریشہ میں ہر قسم کی بدعنوانیاں اور خرابیاں سرایت کر چکی ہوں جو دغابازی اور فریب کاری کے حربوں سے مال و زر حاصل کرتی ہوں جن کے ہاں آوارگی اور بے راہ روی کا دور دورہ ہو اور اخلاقی اقدار کو دل سے قبول کرنے کے لئے کوئی شخص بھی رضاکارانہ طور پر تیار نہ ہو بلکہ ان اعلیٰ و ارفع اقدار کے نفاذ کے لئے تعزیزی ضابطوں اور بے رحم قوانین کی اعانت درکار ہو؟ جو وسیع

الٰہی کے احساسات پر ایمان رکھتے ہوئے حب الوطنی کے جذبات کو قربان کر دیں۔ ایسی اقوام کو سوائے مطلق العانیت کے جس کی ابھی میں وضاحت کروں گا اور کون سا نظام حکومت دیا جا سکتا ہے؟

عوام کی تمام قوتوں کو اپنے ہاتھوں میں رکھنے کے لئے ہم شدید مرکزیت کی حامی حکومت تشکیل کریں گے۔ اور نئے قوانین و ضوابط کے ذریعے اپنے محکوموں کی تمام سیاسی سرگرمیوں کو کٹھ پتلی کی حرکتوں کی مانند منضبط کریں گے۔ ان قوانین کے ذریعے تمام سہولتوں اور مراعات کو یکے بعد دیگرے سلب کر لیں گے جو غیر یہودی حکمرانوں نے انہیں بہم پہنچا رکھی ہیں۔ گویا ہماری سلطنت کا طرہ امتیاز اس کی حد سے بڑھی ہوئی مطلق العانیت ہو گا۔

جو کبھی بھی کسی مقام پر ہر اس غیر یہودی کو صفحہ ہستی سے مٹا دے گی جو اپنے کسی قول یا فعل سے ہماری مخالفت کے درپے ہو۔ ممکن ہے یہ اعتراض کیا جائے کہ ایسی مطلق العانیت جن کا میں ذکر کر رہا ہوں، دور حاضر کی رفتار سے مطابق نہیں رکھتی لیکن میں آپ پر اس کی حقانیت ثابت کئے دیتا ہوں۔

ایک زمانہ تھا کہ عوام اپنے بادشاہوں کو منشائے الٰہی کا مظہر سمجھتے تھے۔ وہ اپنے ان مطلق العنان حکمرانوں کے سامنے جنبش لب کئے بغیر سر تسلیم خم کر دیتے تھے لیکن جس دن سے ہم نے ان کے ذہنوں کو حقوق کے تصور سے پراگندہ کر دیا ہے۔ وہ پرشکوہ تخت و تاج اور جاہ و جلال کے مالک شاہوں کو محض اپنے جیسا فانی انسان سمجھنے لگے ہیں۔ ان کے ذہنوں سے یہ تصور غائب ہو چکا ہے کہ بادشاہوں کو خدا نے جو بپتسمہ دیا ہوتا ہے۔ اور جب ہم نے انہیں خدا پر ایمان کے تصور سے بھی محروم کر دیا تو اقتدار کی قوت عوامی ملکیت کے مقامات گلی کوچوں میں پہنچ گئی جس پر ہم نے باسانی قبضہ جما لیا ہے۔

اس کے علاوہ نہایت ہوشیاری اور چالاکی سے مرتب کئے ہوئے نظریات اور الفاظ کی بھر مار سے عوام کی رہنمائی، زندگی کے عام اصولوں کا انضباط اور تمام دوسرے ہتھکنڈوں کا استعمال جنہیں غیر یہودی سمجھنے سے قطعاً عاری ہیں ہمارے بہترین صلاحیتوں کے مالک دماغ ہی کرتے ہیں جو انتظامی امور میں ماہر ہیں۔ حالات کا جائزہ لینے مشاہدہ کرنے، تخمینوں اور

اندازوں کی باریکیوں اور نکات کو سمجھنے کے لئے ہماری مخصوص انداز سے تربیت کی جاتی ہے۔ اور جس طرح اس فن میں ہمارا کوئی حریف نہیں اسی طرح سیاسی سرگرمیوں اور اتحاد عمل سے متعلق منصوبے بنانے میں ہمارا کوئی ہمسرن ہیں۔

البتہ قدیم رومن کیتھولک فرقہ جسوئیٹ ہماری ہمسری کا دعویٰ کر سکتا تھا لیکن ہم اس کی اس انداز سے بیخ کنی کر چکے ہیں کہ ناعاقبت اندیش عوام کی نظروں میں بحیثیت ایک علانیہ تنظیم اس کی کوئی وقعت نہیں رہی۔ اس تمام کاروائی کے دوران ہماری خفیہ تنظیم پس پردہ رہی۔ غالبًا دنیا کو تو اس امر سے کوئی فرق نہیں پڑتا کہ ان پر حکمران مقتدر اعلیٰ کیتھولک چرچ کا سربراہ ہو یا صیہونی خون کا مطلق العنان۔ لیکن ہم خدا کی محبوب قوم ہیں ہمارے لئے اس معاملے میں کسی قسم کی لاپرواہی اور بے اعتنائی کی قطعًا کوئی گنجائش نہیں۔

اس امر کا بھی امکان ہے کہ شاید کچھ عرصے کے لئے دنیا بھر کے تمام غیر یہود کا مشترکہ محاذ ہمارا مقابلہ کرنے میں کامیاب ہو جائے۔ لیکن ان کے باہمی اختلافات و تنازعات کے باعث ہم اس خطرے سے بھی محفوظ ہیں۔ کیونکہ ان کے اختلافات و تنازعات کی جڑیں اتنی گہری ہو چکی ہیں کہ ان کا ختم ہونا ناممکن ہے۔ ہم نے غیر یہودیوں کو ذاتی اور قومی مفادات کے نام پر ایک دوسرے کے خلاف صف آرا کر دیا ہے۔

گذشتہ بیس صدیوں کے دوران ہم نے ان میں مذہبی اور نسلی عصبیتوں کو وسیع پیمانے پر فروغ دیا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ آج ساری دنیا میں ایک بھی ریاست نہیں کہ اگر اسے ہمارے خلاف نبرد آزما ہونے کا شوق چرائے تو کوئی دوسری طاقت اس کی پشت پناہی کی جرات کرے کیونکہ یہ ہر ایک کو معلوم ہے کہ کسی ایسے معاہدے میں شرکت خود اس کے مفادات کے منافی ہو گی۔ ہم بہت طاقتور ہیں ہماری طاقت سے کوئی نہیں بچ سکتا۔ آج اقوام عالم میں معمولی سے معمولی نوعیت کے درپردہ معاہدے بھی اس وقت تک طے نہیں پا سکتے جب تک ہمارا خفیہ ہاتھ ان میں کار فرمانہ ہو۔

"بادشاہ میرے ہی توسط سے حکمرانی کرتے ہیں۔"

پیغمبروں کے ارشادات کے مطابق کرہ ارض پر حکمرانی کے لئے ہمیں خود خدا نے منتخب

کیا ہے۔ اس نے ہمیں غیر معمولی ذہانت سے نواز رکھا ہے۔ تاکہ ہم اس عظیم فرض کو سرانجام دے سکیں۔ لیکن اگر ذہانت و فطانت و مخالفین کے مقدر میں آجائے تو انہیں ہمارے خلاف شدید جدوجہد کرنا ہو گی۔ کیونکہ کسی بھی میدان میں نوآمد افراد جہاں دیدہ اور تجربہ کار اشخاص کے ہمسر نہیں ہو سکے۔ لہٰذا ہمارے مابین جو کش مکش ہو گی وہ انتہائی سنگدلانہ نوعیت کی ہو گی ایسی کش مکش جو قبل ازیں دنیا نے کبھی نہ دیکھی ہو۔ یہ یاد رکھئے ان کی طرف ذہانت دیر سے پہنچنے کے باعث بہت کار آمد نہیں ہو گی۔ تمام مملکتوں کی مشینری کے سب پہیے انجن کی طاقت سے حرکت میں آتے ہیں۔ جو ہمارے ہاتھوں میں ہے۔ زر جو سلطنتوں کی مشینری کا انجن ہے۔ سیاسی معیشت کی سائنسی کی ایجاد کا سہارا ہمارے بزرگ مفکرین کے سر ہے۔ اسی کے باعث عرصہ دراز سے سرمائے کو شاہانہ شہرت و سطوت نصیب ہے۔

اگر کسی پابندی کے بغیر مشترکہ بنیادوں پر کام کرنا ہو تو سرمائے کو صنعت و تجارت کی اجارہ داری قائم کرنے کے لئے آزاد ہونا چاہئے۔ بلکہ دنیا کے ہر خطے میں پہلے ہی ایک غیر مرئی ہاتھ اس پالیسی پر عمل درآمد کرانے میں مصروف ہے۔ اس آزادی سے صنعت کاروں کو سیاسی قوت حاصل ہو گی۔ جس کے بل بوتے پر وہ عوام کو آسانی سے کچل سکیں گے آج کے دور میں عوام جو جنگ میں جھونکنے کی نسبت انہیں غیر مسلح کرنا ضروری ہے۔ اس سے بھی زیادہ ضروری یہ امر ہے کہ ان کے شعلوں میں بھڑکتے ہوئے جذبات کی آگ کو سرد کرنے کی نسبت اسے اپنے مفادات کے لئے استعمال میں لایا جائے۔ بلکہ سب سے زیادہ اہمیت اس امر کو دینی چاہئے کہ دوسروں کے تصورات اور نظریات کو مسترد کرنے کی بجائے انہیں ایسے معانی پہنائے جائیں جو ہمارے اغراض و مقاصد کے مطابق ہوں۔ ہماری نظامت کا اصل مطمع نظر اس پالیسی میں مضمر ہے کہ ہم تنقید کے ذریعے عوام کے ذہنوں کو اتنا پست کر دیں کہ وہ سنجیدہ قسم کی سوچ بچار کی صلاحیتوں سے محروم ہو کر مزاحمت کے قابل نہ رہیں۔ ان کی ذہنی قوتوں کو ایسا پراگندہ کر دیا جائے کہ وہ محض فصاحت و خطابت کی مصنوعی جنگوں میں الجھی رہیں۔

ہر دور میں دنیا کے عوام نے اجتماعی اور انفرادی سطح پر زبانی دعوؤں کو اصل کارناموں پر ترجیح دی ہے۔ وہ عوامی اکھاڑے میں ظاہری نمود و نمائش پر قانع ہو جاتے ہیں اور شاذونادر ہی یہ سوچنے کی تکلیف گوارہ کرتے ہیں کہ زبانی وعدوں نے کبھی حقیقت کا روپ بھی دھارا ہے یا نہیں لہٰذا ہم بھی نمائشی ادارے قائم کریں گے۔ جو ترقی کے میدان میں اپنی افادیت کا منہ بولتا ثبوت ہوں گے۔

ہمیں تمام جماعتوں کے خدوخال کا غیر منصفانہ جائزہ لینا ہو گا۔

تمام جماعتوں کی آزادنہ ہیئت و ساخت کی ذمہ داری ہم خود اٹھائیں گے ان کے مقاصد اور نصب العین کا تعین بھی ہم ہی کریں گے۔ جماعتوں کی ہیئت و ساخت کو مقررین کے ذریعے آواز بھی عطا کریں گے۔ جو اتنا بولیں گے، اتنی تقریریں کریں گے کہ سامعین ان کے نعروں اور دعوؤں کو سن سن کر عاجز آجائیں گے۔ اس طرح فن خطابت کے خلاف بھی ان کے دلوں میں نفرت بھر جائے گی۔

رائے عامہ کو اپنے ہاتھ میں لینے کے لئے ہمیں بے اطمینانی اور پریشانی کی فضا قائم کرنا ہو گی۔ اس کا طریقہ کار یہ ہو گا کہ ہم ہر سمت سے ان گنت اور متضاد خیالات و آراء کا اظہار کریں گے۔ یہ عمل اس وقت تک جاری رہے گا۔ جب تک غیر یہودی بھول بھلیوں میں گم ہو کر خود یہ تسلیم نہ کرلیں کہ سیاسی امور میں کسی قسم کی رائے قائم کرنا کوئی مسلک یا نظریہ اپنانا خلاف عقل و دانش ہے اور یہ معاملات عوام کی سمجھ سے بالاتر ہوتے ہیں۔ اور انہیں صرف وہی شخص سمجھ سکتا ہے جو عوام کی رہنمائی کے فرائض سرانجام دے سکتا ہے۔ یہ ہماری کامیابی کا پہلا راز ہو گا۔

ہماری حکومت کی کامیابی کا دوسرا راز مندرجہ ذیل پالیسیوں میں مضمر ہے۔ قومی سطح کی ناکامیوں، لوگوں کے عادات و اطوار، جذبات اور شہری زندگی کے تمام حالات کو اس کثرت سے مجتمع کر دیا جائے کہ اس کے نتیجے میں پیدا ہونے والی بدامنی اور انتشار کی فضا میں ہر شخص کو اپنا مقام پہچاننا دشوار ہو جائے بلکہ عوام ایک دوسرے کو سمجھنے سے بھی قاصر ہو جائیں۔

یہ طریق کار ہمارے لئے اس لحاظ سے بھی مفید ہو گا کہ ہم مختلف جماعتوں میں اختلاف و نفرت کے بیج بو سکیں گے۔ اور ان اجتماعی قوتوں، جو اب تک ہماری اطاعت کو قبول کرنے سے گریزاں ہے، تتر بتر کر دیں گے۔ علاوہ ازیں ہم اس فرد کے مخصی اقدامات اور کوشش کا قلع قمع کر سکیں گے جو ہمارے سد راہ ہو گا۔ یاد رہے کہ ہمارے لئے ذاتی اور مخصی اقدامات سب سے زیادہ خطرناک ثابت ہو سکتے ہیں۔ ان کے پس پردہ کوئی ذہین و فطین شخصیت کار فرما ہو۔ تو وہ ان لاکھوں آدمیوں سے جن کے درمیان ہم نے انتشار و افتراق پیدا کر رکھا ہو، زیادہ نقصان دہ ثابت ہو سکتا ہے۔

تعلیمی معاملات میں ہمیں غیر یہود اقوام کی راہنمائی اس انداز سے کرنی چاہیئے کہ جب بھی وہ کسی معاملے میں پیش قدمی کرنا چاہیں تو وہ اہم مسائل کا حل نہ ڈھونڈ سکیں اور ہمت ہار کر بیٹھ جائیں آزادی عمل کے نتیجے میں پیدا ہونے والے تناؤ کا ٹکراؤ جب دوسروں کی آزادی سے ہوتا ہے تو یہ تمام طاقتیں کھوکھلی ہو کر رہ جاتی ہیں اس ٹکراؤ سے سحر ٹوٹ جاتا ہے۔ اخلاقی تصادم، مایوسیاں اور ناکامیاں وجود میں آتی ہیں۔ ان تمام حربوں سے ہم غیر یہودیوں کو اتنا تھکا دیں گے کہ وہ خود ہمیں ایسا بین الاقوامی اقتدار پیش کرنے پر مجبور ہو جائیں گے کہ باعث بتدریج دنیا کی تمام مملکتوں کی اجتماعی طاقت پر بغیر کسی قسم کی تشدد کے قابض ہو جائیں گے اور ایک اعلیٰ درجے کی حکومت کا قیام عمل میں لائیں گے۔ موجودہ حکمرانوں کی جگہ ہم ایک ایسا انیلی ادارہ تشکیل کریں گے جو سپر گورنمنٹ ایڈمنسٹریشن کے نام سے موسوم ہو گا۔ اس کے ہاتھ زنبور کی مانند چاروں طرف پھیلیں گے۔ اس کی تنظیم اتنی وسیع ہو گی کہ یہ دنیا کی تمام قوموں کو مغلوب کر کے رکھ دے گی۔

عالمی امن کی تباہی کے لئے

ہم جلد ہی بڑی بڑی اجارہ داریوں اور مال و دولت کے وسیع ذخائر کا قیام عمل میں لائیں گے۔ جن پر غیر یہودی اقوام کی قسمت کا انحصار اس حد تک ہو گا کہ سیاسی تصادم کے اگلے روز ہی تمام ملکی قرضوں سمیت غرق ہو کر رہ جائیں گے۔

زیادہ آمدنی کا حصول ممکن ہے۔

ہمارے بادشاہ کی قوت کا انحصار معاشی توازن اور امن عامہ کی ضمانت پر ہوگا۔ لہٰذا اس مقصد کے حصول کے لئے اور ریاست کے نظم و نسق کو اطمینان بخش طریقے سے چلانے کے لئے یہ لازمی ہوگا کہ سرمایہ دار اپنی آمدنی کا ایک حصہ ریاست کی نذر کر دیں۔ مملکت کی ضروریات انہیں لوگوں کی جیبوں سے پوری کی جائیں گی جو اس کی متحمل ہو سکیں اور کسی قسم کا بوجھ بھی محسوس نہ کریں۔ اس اقدام سے طبقہ امراء کے خلاف غریبوں کی نفرت و بیزاری ختم ہو جائے گی اور وہ اسے ملک میں امن و سلامتی کی بحالی اور عوام کی فلاح و بہبود کا ضامن سمجھیں گے۔ کیونکہ وہ خود اس امر پر شاہد ہوں گے کہ ریاست کے ان ارفع و اعلیٰ مقاصد کے حصول کے لئے یہی طبقہ ضروری وسائل مہیا کر رہا ہے۔

تخت و تاج اور انتظامی اداروں پر اٹھنے والے خرچ کے سوا باقی تمام اخراجات کا مکمل حساب کتاب تعلیم یافتہ طبقہ کی رسائی میں ہوگا۔ تاکہ وہ ٹیکسوں سے پریشان اور بد دل نہ ہونے پائیں۔

ہمارے حکمران کی کوئی ذاتی جائیداد نہیں ہوگی۔ چونکہ ساری ریاست ہی ان کی میراث ہوتی ہے لہٰذا اس کا ذاتی جائیداد بنانا اس اصول سے متضاد ہوگا بادشاہ کا ذاتی آمدنی کے ذرائع کا مالک ہونا ملکیت عامہ میں اس کے حقوق کو ختم کر دے گا۔

بادشاہ اور اس کے تمام اعزہ و اقارب کو ریاست کے ملازمین کی صفوں میں شامل ہونا پڑے گا یا حق جائیداد کے حصول کے لئے کوئی اور کام کرنا ہوگا شاہی خون کا یہ مطلب نہیں کہ یہ لوگ سرکاری خزانے پر الللے تللے کرتے رہیں۔

خریداری کے علاوہ روپے پیسے کی وصولی اور وراثت سے متعلق تمام امور ترقیاتی شامپ ٹیکس ادا کرنے پر ہی طے پا سکیں گے۔ اگر کسی منقولہ یا غیر منقولہ جائیداد یا ایسی رقوم کا انتقال جس کی رجسٹریشن افراد کے ناموں ہی پر ہونی چاہئے، اس ٹیکس کی ادائیگی کے مکمل ثبوت کے بغیر عمل میں آیا تو اس کے سابقہ مالک کا انتقال جائیداد اس سے لے کر اس کا سراغ لگنے کی تاریخ تک ممکنہ ٹیکس پر سود کی رقم بھی ادا کرنا ہوگی۔ انتقال کے کاغذات کو ہر ہفتے

یہاں موجود حضرات میں سے جو بھی ماہرین معاشیات ہیں انہیں اس متحدہ کاروائی کی اہمیت کا تخمینہ تیار کرنا ہے۔ نیز ہمیں ہر ممکن طریقے سے اپنی عظیم حکومت کی اہمیت کو اس انداز سے واضح کرنا ہے کہ ہمارے دائرہ اطاعت میں آنے والی قومیں از خود اسے اپنا محافظ و نگہبان اور محسن مربی سمجھیں۔

غیر یہود کا طبقہ شرفاء سیاسی قوت کی حیثیت سے ختم ہو چکا ہے۔ اسے اہمیت دینے کی قطعاً کوئی ضرورت نہیں۔ لیکن بحیثیت زمیندار یہ لوگ اب بھی ہمارے لئے نقصان دہ ثابت ہو سکتے ہیں۔ کیونکہ وہ ان وسائل کے لحاظ سے جن پر ان کا گذر بسر ہوتا ہے خود کفیل ہیں۔ لہٰذا ہمارے لئے یہ ضروری ہے کہ انہیں قطعی طور پر اراضی سے محروم کر دیا جائے۔ اس مقصد کا حصول زرعی املاک پر زیادہ بوجھ ڈالنے اور اراضی و قرضوں کے بوجھ تلے دبانے سے ممکن ہو سکتا ہے۔ ان اقدامات سے اراضی پر اجارہ داری کے رجحانات کا خاتمہ ہو جائے گا نیز انکساری فروتنی اور غیر مشروط اطاعت و فرمانبرداری کی کیفیت بھی پیدا ہو سکے گی۔

غیر یہود کو مزدوروں میں تبدیل کرنا

غیر یہود کے شرفاء اپنی خاندانی روایات کے باعث قلیل آمدنی پر قناعت کرنے سے قاصر رہیں گے۔ لہٰذا وہ جلد ہی صفحہ ہستی سے معدوم ہو جائیں گے۔ اس کے ساتھ ساتھ ہمیں صنعت اور تجارت کی بھرپور سرپرستی کرنی چاہئے۔ لیکن اس سے زیادہ اہمیت سٹے بازی کو دینی چاہئے کیونکہ اس سے صنعت میں توازن پیدا ہو سکتا ہے۔ اس کی عدم موجودگی میں سرمایہ نجی ہاتھوں میں مجتمع ہو جائے گا۔ جس کے نتیجہ میں اراضی کو زرعی بنکوں کے قرضوں سے نجات ملے گی اور زراعت بحال ہو جائے گی۔ ہمارا مطمع نظر یہ ہے کہ صنعت کاری، اراضی کو محنت اور سرمائے سے کلی طور پر محروم کر کے سٹے کے حیلے سے کرہ ارض کی دولت ہمارے ہاتھوں میں منتقل کر دے۔ اس طرح تمام غیر یہودی محنت کش اور مزدور طبقہ میں تبدیل ہو کر رہ جائیں گے۔ پھر وہ اگر کسی اور وجہ سے نہ سہی زندہ رہنے کے حق کے حصول کی خاطر تو ہمارے سامنے سرنگوں ہو کر رہیں گے۔

غیر یہود اقوام کی صنعت کی تباہی کو پایہ تکمیل تک پہنچانے کے لئے ہم سٹہ بازی کی سامان ش اور عیش پرستی سے امداد کریں گے جسے ہم نے غیر یہود میں فروغ دے رکھا ہے۔ اس ے حصول کی ہوس اب ہر چیز کو نگل رہی ہے۔ ہم اجرتوں کی شرح میں اضافہ کریں گے جو کارکنوں اور مزدوروں کے لئے کسی طرح بھی مفید ثابت نہ ہو گا۔ کیونکہ اس کے ساتھ ہی ہم زندگی کی بنیادی ضروریات کی اشیاء کی قیمتوں میں بھی اضافہ کردیں گے۔ اس اضافے کا سبب رعی پیداوار میں کمی اور مویشیوں کی قلت کو بتائیں گے۔

علاوہ ازیں ہم نہایت ہوشیاری اور چالاکی سے کارکنوں میں افتراق و انتشار پیدا کر کے اور انہیں شراب نوشی کا عادی بنا کر پیداوار کے دیگر ذرائع کو بھی کھوکھلا کردیں گے۔ ہم ایسے تمام اقدامات بھی عمل میں لائیں گے۔ جن سے کرہ ارض سے غیر یہودیوں کے تعلیم یافتہ طبقے کی بیخ کنی ہو سکے۔ اس امر کے لئے کہ غیر یہود ان پالیسیوں کے حقیقی مفہوم اور ان کے پس پردہ عزائم کو قبل از وقت نہ سمجھ لیں۔ ہم ان پر محنت کش طبقے کی بے لوث خدمت کی خواہش کا پردہ ڈالیں گے۔ نیز سیاسی معیشت کے ان اصولوں کو بھی صیغہ راز میں رکھنا ہو گا جن کے فروغ کے لئے ہمارے معاشی نظریات پوری قوت سے پراپیگنڈہ کر رہے ہیں۔

عالمی اقتصادی بحران کس طرح ہو گا

آج ہم مالیاتی پروگرام کو زیر بحث لائیں گے اس معاملہ کی انتہائی مشکل، پیچیدہ، اہم ترین، اور فیصلہ کن نوعیت کے باعث میں نے اسے رپورٹ میں خصوصی اہمیت دی ہے۔ اس پر کسی قسم کی بحث و تمحیص سے پیشتر میں آپ کو یہ یاد دلانا چاہتا ہوں کہ اس کا ذکر میں پہلے بھی اشارۃً کر چکا ہوں جب میں نے کہا تھا کہ ہماری تمام تر سرگرمیاں اعداد و شمار کی روشنی ہی میں متعین ہوں گی۔ اقتدار اعلیٰ کی باگ ڈور سنبھالنے پر ہماری مطلق العنان حکومت ذاتی تحفظ و بقا کے اصول کے تحت عوام پر بھاری ٹیکسوں کا بوجھ لادنے کی احمقانہ پالیسی سے گریز کرے گی۔ وہ اس امر کو ملحوظ رکھے گی کہ اس کا کردار ایک باپ اور محافظ کا سا ہے۔

لیکن چونکہ ریاست کی تنظیم اور اس کے نظم و نسق پر کافی رقم اٹھتی ہے اور اس مقصد

ے لئے سرمائے کا حصول بہرحال لازمی ہے لہٰذا ہماری حکومت اس معاملے سے متعلق اصول توازن کی تفصیلات طے کرتے وقت خصوصی احتیاط کام لے گی۔

ہماری حکومت میں بادشاہ کو اس قانونی مفروضے کو کہ ریاست کی ہر شے حکمران کی ملکیت ہوتی ہے، حقیقت کا روپ دینے میں کوئی دقت پیش نہیں آئے گی۔ وہ اس اصول سے فائدہ اٹھاتے ہوئے گردش زر میں باقاعدگی پیدا کرنے کے لئے ہر قسم کی رقوم کو بحق سرکار ضبط کر سکے گا۔ اس سے یہ نتیجہ بھی اخذ ہوتا ہے کہ جائیداد پر ترقیاتی ٹیکس لگانا ہی کافی ہو گا۔

اس طریق کار سے کسی شخص پر بھی بوجھ ڈالے بغیر یا کسی کو تباہی سے ہمکنار کئے بغیر واجب الادا رقوم کی ادائیگی جائیداد کی رقوم پر فی صد ٹیکس کی صورت میں ہو سکی گی۔

سرمایہ داروں کو اس امر سے آگاہ ہونا چاہئے کہ یہ ان کا فرض ہے کہ وہ اپنی فاضل دولت مملکت کے حوالے کر دیں جو ان کی جائیداد کی ملکیت کے تحفظ اور جائز منافع کمانے کے حق کی ضمانت دیتی ہے۔ میں نے جائزہ کا لفظ استعمال کیا ہے۔ کیونکہ جائیداد پر سرکاری ضبط سے قانونی طور پر لوٹ کھسوٹ کا خاتمہ ہو جائے گا۔ معاشرے میں یہ اصلاح بالائی طبقے سے ہونی چاہئے اور اب اس کا وقت آچکا ہے۔ نیز امن عامہ کے لئے بھی یہ ایک ناگزیر ضمانت ہے۔

غریبوں پر ٹیکس عائد کرنا انقلاب کے لئے بیج بونے کے مترادف ہے۔ بڑے بڑے سرمایہ داروں کو نظرانداز کر کے افلاس کے ہاتھوں پسے ہوئے عوام کو شکار بنانے کی حکمت عملی اپنانے سے ملک پر تباہ کن اثرات مرتب ہوتے ہیں۔ اس کے برعکس سرمایہ داروں پر ٹیکس کا نفاذ غیر سرکاری ہاتھوں میں دولت کے ارتکاز کو روکتا ہے جن میں آج کل ہم نے اسے غیر یہودی حکومتوں کی قوت و طاقت اور ان کی مملکتوں کی سرمایہ کاری کے خلاف ایک پاسنگ کے طور پر مرتکز کر رکھا ہے۔

فی الحال موجودہ ذاتی ٹیکس یا جائیداد پر ٹیکس ہمارے لئے محض اس لحاظ سے مفید ہیں کہ ان سے غیر یہودیوں میں بے چینی اور اضطراب کی کیفیت پیدا ہو رہی ہے لیکن در حقیقت اس کے مقابلے میں بڑھتے ہوئے سرمائے پر فی صد تناسب سے ٹیکس میں اضافے کے باعث کہیں

مقامی دفتر خزانہ میں پیش کرنا ہوگا جن میں متعلقہ جائیداد کے سابقہ اور نئے مالک کا نام، ان کے خاندانی نام اور مستقل رہائش کے سرنامے درج ہوں گے۔

ناموں کی رجسٹریشن کے ساتھ اس قسم کے انتقا کے لئے رقم کی ایک حد مقرر کی جائے گی جو روز مرہ کی ضروریات زندگی پر اٹھنے والے اخر ت سے زائد ہو گی۔ ٹیکس کی زد میں آنے والی رقوم کی ادائیگی اسی صورت میں ممکن ہو گی جب ان پر مقررہ فی صد کے حساب سے سٹامپوں کی صورت میں ٹیکس ادا کر دیا جائے۔ آپ ذرا اندازہ تو کیجئے کہ اس قسم کے ٹیکسوں سے ہمیں غیر یہود ریاستوں کے مقابلے میں کتنے گنا زیادہ آمدنی ہو گی؟

سرکاری خزانے کو محفوظ رقموں کی ایک خاص خبر رکھنا ہو گی۔ اس سے زائد وصول ہونے والی رقموں کو واپس گردش میں ڈال دیا جائے گا۔ تعمیر عامہ کے کام انہیں رقوم سے شروع کئے جائیں گے۔ اس قسم کی تعمیرات جن کا آغاز حکومت کے وسائل سے ہو گا، مزدور طبقہ کو حکومت اور حکمرانوں کے مفادات سے قریب تر لے آئیں گے ان ہی رقوم کا ایک حصہ مختلف ایجادات کے موجد اور پیداوار بڑھانے والوں کے لئے بطور انعام مخصوص کر دیا جائے گا۔ مخصوص لیکن بمقدار کثیر رقم سے زائد روپیہ کسی صورت بھی سرکاری خزانے میں نہیں رکھا جائے گا۔ کیونکہ سرمایہ گردش ہی کے لئے ہوتا ہے۔ اس میں جمود سرکاری مشینری کی کارکردگی کے لئے ایسے ہی تباہ کن ثابت ہوتا ہے۔ جیسے تیل کے جامد ہو جانے سے مشین کے کل پرزے باقاعدگی سے کام کرنا چھوڑ دیتے ہیں۔ تبادلے کے ٹوکن اور ایک حصے کی بجائے سودی تمسکات کے رو نے یہودی جمودی صورت حال پیدا کر رکھی ہے اور اس کے نتائج پہلے ہی سب کے سامنے ہیں۔

ہم حساب کتاب کے لئے ایک علیحدہ ادارہ قائم کریں گے جو ریاست کی آمدنی اور اخراجات مکمل حساب رکھنے کا ذمہ دار ہو گا اس سے متعلق تمام تفصیلات حکمران کو ہر وقت دست یاب ہوں گی۔ البتہ ماہ رواں کا حساب جو تیاری کے مراحل میں ہو گا اور گذشتہ ماہ کا حساب جو ابھی وصول نہیں ہوا ہو گا۔ ادارے کے پاس موجود نہیں ہو گا۔ تنہا اور واحد شخص جسے ریاست کی لوٹ کھسوٹ سے کوئی دلچسپی نہیں ہو گی وہ اس کا اصل مالک و مختار، اس کا

ذاتی کنٹرول، رازوں کے افشا ہونے اور فضول خرچیوں کے امکانات کو ختم کر دے گا۔

استقبالیہ تقریبات میں حکمران کو اخلاقی طور پر مملکت کی نمائندگی کے فرائض سرانجام دینے کی زحمت نہیں دی جائے گی تاکہ اسے امور سلطنت پر غور و خوض کرنے اور نظم و نسق برقرار رکھنے کے لئے کافی وقت مل سکے۔ اس طرح اس کا اقتدار بھی ابن الوقت قسم کے لوگوں کے ہاتھوں تباہ ہونے سے بچ جائے گا جو محض تخت و تاج کی شاہی شان و شوکت کے گرد منڈلاتے ہیں اور جنہیں ریاست کے مفادات کی بجائے اپنے مقاصد عزیز ہوتے ہیں۔

ہم نے سرمائے کو گردش سے نکال کر غیر یہود کے لئے اقتصادی بحران پیدا کر دئے ہیں۔ ریاستوں سے زر کی واپسی کے باعث سرمائے کے بڑے بڑے ذخیرے جامد ہو کر رہ گئے ہیں حالانکہ پیشتر ازیں تمام مملکتیں اس جامد سرمائے کے ذخیروں ہی سے متواتر قرضے لیا کرتی تھیں۔ ان قرضوں کے باعث ریاستوں کی معیشت سود کی ادائیگیوں کے بوجھ تلے دب کر رہ گئی ہے۔ چھوٹے صنعت کاروں کی بجائے بڑے بڑے سرمایہ داروں کے ہاتھوں میں صنعت کے ارتکاز سے عوام کے ساتھ ریاستیں بھی کھوکھلی ہو کر رہ گئی ہیں۔

زر کا اجراء بالعموم فی کس ضروریات کے مطابق نہیں ہے اس لئے مزدوروں کی تمام ضروریات کو کماحقہ پورا نہیں کر سکتا۔ دراصل آبادی میں اضافے کے ساتھ ساتھ زر کے اجراء میں بھی اضافہ ہونا چاہئے اور بچوں کو بھی اس کے یوم پیدائش ہی سے صافین زر میں شمار کرنا چاہئے۔ اس کے اجراء پر نظر ثانی کا مسئلہ تو تمام دنیا کے لئے ہی اہم ہے۔ آپ کو معلوم ہی ہے کہ سونے کو بطور معیار اختیار کرنے والی تمام ریاستیں تباہی سے ہمکنار ہو چکی ہیں۔ کیونکہ یہ زر کے مطالبات کو پورا کرنے سے قاصر رہا ہے اس کی وجہ یہ بھی ہے کہ ہم نے حتی الامکان سونے کو گردش سے نکال لیا ہے۔

ہم محنت کش افرادی قوت کے مصارف کو بطور معیار اختیار کریں گے۔ خواہ اسے کاغذ یا اشیاء ضرورت کی صورت میں متعین کیا جائے۔ زر کا اجراء انسانی ضروریات کے مطابق ہو گا اور رعایا کے ہر فرد کی ضرورت کو مد نظر رکھا جائے گا۔ ہر بچے کی پیدائش پر زر کی مقدار میں اضافہ کر دیا جائے گا اور ہر موت پر اس میں تخفیف کی جائے گی۔ ہر محکمہ (فرانسیسی ڈویژن)

اور ہر سرحل اپنا حساب ساب رکھنے کا ذمہ دار ہو گا۔

سرکاری ضروریات کے لئے واجبات کی ادائیگیوں میں تاخیر سے بچنے کے لئے متعلقہ رقوم اور شرائط کا تعین بادشاہ کی صوابدید پر ہو گا۔ اس طریق کار سے کوئی وزارت ایک ادارے کے تحفظ کی خاطر کسی دوسرے کو نقصان نہیں پہنچا سکے گی۔

غیر یہود کے مالیاتی اداروں اور قواعد و ضوابط میں اصلاحات اس انداز سے نافذ کریں گے اور انہیں ایسی شکل و صورت پہنائیں گے کہ کسی کو بھی پریشانی نہ اٹھانی پڑے۔ غیر یہود نے بے قاعدگیوں اور بے اصولیوں کے باعث اپنی معیشت کو تباہی کے جس گڑھے میں دھکیل رکھا ہے اس کے پیش نظر ہم اصلاحات کی ضرورت کو ثابت کریں گے۔ ہم اس امر کی وضاحت کریں گے کہ ان کی پہلی بے قاعدگی سال بھر کے لئے واحد میزانیہ پیش کرنے میں ہے۔ جس میں سال بسال بوجوہ ذیل اضافہ ہو تا جاتا ہے۔ یہ میزانیہ نصف سال ہی میں ختم ہو جاتا ہے۔ پھر امور مملکت کو چلانے کے لئے ایک اور میزانیے کا تقاضا کیا جاتا ہے جو تین ماہ کے عرصہ ہی میں خرچ ہو جاتا ہے بعد ازاں ایک اور ضمنی میزانیے کا مطالبہ شروع ہو جاتا ہے۔ اس ساری کاروائی کا نتیجہ ایک دیوالیے بجٹ کی صورت میں بر آمد ہو تا ہے۔ لیکن اگلے سال کا میزانیہ چونکہ گذشتہ سال کی مجموعی رقم کو پیش نظر رکھ کر بنایا جاتا ہے۔ لہٰذا ابتدا ہی میں اس میں پچاس فی صد کا اضافہ ہو جاتا ہے۔ اس طرح دو سال کے عرصہ ہی میں یہ سالانہ میزانیہ تگنا ہو جاتا ہے۔

غیر یہود ریاستوں کی لاپرواہی اور ان غیر ذمہ دار طریقوں کی بدولت ان کے خزانے خالی ہو جاتے ہیں۔ پھر قرضوں کا دور شروع ہو جاتا ہے۔ تو ان کی تمام بچتیں اس کی نذر ہو کر رہ جاتی ہیں اور تمام غیر یہود ریاستیں دیوالیہ ہو جاتی ہیں۔ آپ بخوبی سمجھ سکتے ہیں کہ اس قسم کے تباہ کن اقتصادی انتظامات پر ہم خود عمل پیرا نہیں ہو سکتے جو ہم ہی نے غیر یہود کو سکھائے ہیں۔

قرضہ خواہ کسی کا بھی ہو مملکت کی کمزوری اور ریاست کے حقوق سے متعلق فہم و ادراک کے فقدان پر دلالت کرتا ہے۔ قرضوں کی حیثیت حکمرانوں کے سروں پر لٹکی ہوئی

وار کی مانند ہوتی ہے۔ جو اپنی رعایا پر عارضی ٹیکس لگا کر رقم حاصل کرنے کی بجائے ہمارے اروں کے پاس ہاتھ پھیلائے بھیک مانگنے آ جاتے ہیں۔

غیر ملکی قرضے ایسی جونکیں ہیں جنہیں مملکت کے جسم سے الگ کرنا ممکن نہیں بجز اس کہ یہ از خود علیحدہ ہو جائیں یا متعلقہ ریاست انہیں اتار پھینکے۔ لیکن غیر یہودی ریاستیں نہیں کسی طرح بھی اتار پھینکنے کو تیار نہیں ہوتیں بلکہ مزید قرضے لینے پر مصر رہتی ہیں۔ اس طرح رضا کارانہ طور پر اپنا سارا خون نچوڑ دینے سے بالآخر تباہی سے ہمکنار ہونا ان کے لئے اگزیر ہو جاتا ہے۔

قرضہ اور بالخصوص غیر ملکی قرضے کی اصل نوعیت کیا ہے؟

قرضہ کسی حکومت کی طرف سے جاری شدہ ایک ہنڈی ہوتی ہے جس میں قرضے کی رقم کے مطابق سود ادا کرنے کی ذمہ داری قبول کر لی جاتی ہے۔ اگر قرضے پر شرح سود پانچ فی صد ہو تو متعلقہ حکومت بیس سال کے عرصہ میں اصل زر کے برابر محض سود ہی ادا کر دیتی ہے چالیس سال کے عرصہ میں یہ رقم دوگنا اور ساٹھ سال میں تین گنا ہو جاتی ہے اس کے باوجود بھی اصل قرضہ سر ہی پر رہتا ہے۔

اس سے واضح ہوتا ہے کہ حکومت غیر ملکی سرمایہ داروں کا جن سے اس نے قرضے لئے ہوتے ہیں، حساب کتاب چکانے کے لئے اپنی رعایا پر فی کس ٹیکس لگا کر ٹیکس دہندگان سے آخری سکے بھی نکلوا لیتی ہے۔ حالانکہ اپنی ضروریات کو پورا کرنے کے لئے یہی سکے اکٹھے کر کے سود سے بچا جا سکتا تھا۔

جب تک قرضوں کی نوعیت ملکی رہی اس وقت تک غیر یہود کے غریب طبقہ کی جیبوں سے روپیہ نکل کر ان کے دولت مندوں کی جیبوں میں پہنچتا رہا جب ہم نے قرضوں کو غیر ملکی دائروں میں لانے کے لئے متعلقہ افراد کو خرید لیا تو مملکتوں کی تمام دولت ہماری تجوریوں میں منتقل آئی اور تمام غیر یہود بطور رعایا ہمیں خراج ادا کرنے لگے۔

لیکن یہ یاد رکھیئے کہ اگر غیر یہود بادشاہوں کا امور مملکت سے متعلق سطحی رویے، وزیروں کی ضمیر فروشی یا دیگر منتظمین کی اقتصادی امور سے متعلق کم فہمی نے ان کے ملکوں کو

اس حد تک ہمارا مقروض بنا دیا ہے کہ اب اس کی ادائیگی ناممکنات میں سے ہے تو ہمیں بھی یہ بالا دستی مفت میں حاصل نہیں ہوئی۔ بلکہ اس کے لئے ہم نے بے شمار تکالیف و مصائب اٹھائے ہیں، بہت سی پریشانیوں کا سامنا کیا ہے اور مالی لحاظ سے بھی بھاری قیمت ادا کی ہے

ہم سرمایے کے انجماد کی اجازت نہیں دیں گے۔ اسی لئے ایک فی صد سلسلے کے سوا کوئی سودی تمسکات جاری نہیں کئے جائیں گے۔ اس سے ان جونکوں کو کچھ بھی حاصل نہیں ہوگا۔ جو ریاست کی ساری طاقت چوس لیتی ہیں۔ سودی تمسکات کے اجراء کا حق صرف صنعتی کمپنیوں کو دیا جائے گا جن کے لئے منافع کی رقم میں سے سود ادا کرنا دشوار نہ ہوگا۔ کیونکہ حکومت تو ان کمپنیوں کی مانند قرضوں پر منافع نہیں کماتی۔ وہ ملکی اخراجات پورا کرنے کے لئے قرض اٹھاتی ہے نہ کہ کاروباری منصوبوں میں لگانے کے لئے اس وقت حکومتوں کو مختلف قرضوں پر سود کی صورت میں خراج ادا کرنا پڑتا ہے لیکن ہماری حکومت خود صنعتی کمپنیوں کے جاری کردہ تمسکات خریدے گی۔

اس طرح اس کی حیثیت قرض دہندہ میں تبدیل ہو جائے گی۔ اس اقدام سے سرمایے کے انجماد مفت کی نفع خوری، اور سستی و کاہلی کا قلع قمع ہو جائے گا۔ ان عیوب کا وجود غیر یہودی ریاستوں کی آزادی کے دوران تو ہمارے لئے مفید ثابت ہوتا ہے لیکن ہمارے دور اقتدار میں یہ ناپسندیدہ قرار پائیں گے۔

غیر یہود کے خالص حیوانی ذہنوں اور غیر ترقی یافتہ قوت فکر کی عکاسی اس امر سے ہوتی ہے کہ وہ یہ سوچے سمجھے بغیر ہم سے سودی قرضے لے رہے ہیں حالانکہ انہیں ہمارا حساب بیباک کرنے کے لئے اصل زر کے علاوہ سود کی رقم بھی اپنی مملکتوں کے وسائل ہی سے ادا کرنا ہوتی ہے۔ اس سے زیادہ آسان اور سہل امر کیا ہو سکتا ہے کہ وہ اپنی ضروریات کی تکمیل کے لئے مطلوبہ رقم اپنے ہی عوام سے حاصل کریں

یہ ہمارے بے مثل اور عالی دماغ افراد کی ذہانت و فطانت کا ثبوت ہے کہ ہم نے قرضوں سے متعلق امور کو ان کے سامنے اس انداز سے پیش کیا ہے کہ اس میں انہیں اپنا ہی مفاد نظر آتا ہے۔ وقت آنے پر ہم یہ حساب کتاب، غیر یہود پر صدیوں آزمائے گئے تجربات کی روشنی

میں پیش کریں گے۔ یہ حسابات اپنی غیر فہم نوعیت، قطعیت و وضاحت کے باعث منفرد حیثیت کے مالک ہوں گے اور ہر شخص پر ایک ہی نظر میں ہماری اختراعات کے فوائد آشکار ہو جائیں گے۔ ان سے ان تمام خرابیوں کا خاتمہ ہو جائے گا جن کے باعث ہمیں غیر یہود پر بالا دستی حاصل ہے لیکن جن کو جاری رکھنے کی اجازت ہماری مملکت میں نہیں دی جائے گی۔

ہم اپنے حساب کتاب کے نظام کو اس طرح محصور کر دیں گے کہ ایک ادنیٰ ترین ملازم سے لے کر اعلیٰ حکمران تک کوئی شخص بھی معمولی سے معمولی رقم بھی اگر خرد برد کرے گا اس کا انکشاف ہو کر رہے گا۔ علاوہ ازیں کسی منصوبے کے لئے جو رقم مخصوص کی جائے گی اسے کسی اور مد پر خرچ نہیں کیا جا سکے گا۔

ایک واضح منصوبے کے بغیر حکومت چلانا ناممکنات میں سے ہے۔ غیر معینہ وسائل کے ساتھ غیر معینہ راستے کو اختیار کرنے سے بڑے بڑے سورما اور رستم وقت تباہی سے ہمکنار ہو جاتے ہیں۔

ہم غیر یہودی حکمرانوں کی امور سلطنت سے توجہ ہٹانے کے لئے انہیں استقبالیوں، آداب مجلس کی پابندیوں اور تفریحات میں مشغول رہنے کے مشوروں سے نوازتے ہیں اور ان کی آڑ میں خود حکمرانی کے فرائض سرانجام دیتے ہیں۔ تمام امور سلطنت میں ان کی نمائندگی کرنیوالے منظور نظر درباریوں کے حساب کتاب ہمارے ایجنٹ ہی تیار کرتے ہیں جو ہر دفعہ کوتاہ اندیش ذہنوں کو ان وعدوں سے مطمئن کر دیتے ہیں کہ مستقبل میں بچتوں اور اصلاحات کی بہت توقع ہے۔ آخیر بچتیں کہاں سے ہوں گی؟ کیا نئے ٹیکس عائد کرنے پڑیں گے؟ یہ سوالات تو پوچھے جا سکتے ہیں۔ لیکن ہمارا حساب کتاب اور منصوبوں کا مطالعہ کرنے والوں نے کبھی یہ استفسار کرنے کی ضرورت ہی محسوس نہیں کی اور یہ آپ بخوبی جانتے ہیں کہ اپنی حیران کن صنعتی ترقی کے باوجود اسی بے احتیاطی کے باعث وہ کیسے عظیم اقتصادی بحران سے دوچار ہو کر رہ گئے ہیں۔

قرضوں کی دلدل

غیر ملکی قرضوں کے بارے میں مجھے مزید کچھ نہیں کہنا۔ چونکہ ان کی بدولت غیر یہود کی

قومی دولت ہمارے ہاتھوں میں پہنچ چکی ہے لہٰذا ہماری ریاست کے دروازے ہر غیر ملکی چیز پر بند رہیں گے۔ ہم نے غیر یہودی حکمرانوں کی کاہلی و سستی اور منتظمین کی ضمیر فروشی سے فائدہ اٹھاتے ہوئے ان کی حکومتوں کو قرضے فراہم کر کے جن کی دراصل انہیں قطعاً ضرورت نہ تھی، اپنے سرمائے میں دگنا تگنا بلکہ کئی گنا اضافہ کر لیا ہے۔ کیا ہم کسی اور کو اپنے ساتھ یہ کھیل کھیلنے کی اجازت دے سکتے ہیں؟ لہٰذا میں صرف ملکی قرضوں کو زیر بحث لاؤں گا۔

مختلف ریاستیں اپنے کسی قرضے کا اعلان کرتی ہیں تو اپنی ہنڈیاں یعنی سودی تمسکات عوام کے سامنے خریداری کے لئے پیش کرتی ہیں۔ اس مقصد کے پیش نظر کہ سب لوگ انہیں خرید سکیں، حصص کی قیمت سو سے ہزار تک رکھی جاتی ہے اور اولین خریداروں کو کٹوتی بھی دی جاتی ہے۔ اگلے ہی روز مصنوعی طریقوں سے ان کی قیمت میں اضافہ کیا جاتا ہے جس کی وجہ یہ بتائی جاتی ہے کہ ہر شخص انہیں خریدنے کے لئے دوڑ دھوپ کر رہا ہے۔

چند روز ہی میں بقول ان کے خزانے کی تجوریاں بھر جاتی ہیں اور ان کے پاس ضرورت سے زائد رقم جمع ہو جاتی ہے (اخیر یہ رقم وصول ہی کیوں کی جاتی ہے؟) مطلوبہ قرض کی کل رقم سے کئی گنا زائد روپے کی وصولی ہی اس سارے ناٹک کا راز مضمر ہے کیونکہ اس طرح متعلقہ حکومتیں بڑمار سکتی ہیں کہ دیکھو! سرکاری تمسکات پر لوگوں کی طرف سے کس قدر اعتماد کا اظہار کیا گیا ہے؟ لیکن اس ڈرامے کا طربیہ پہلو کھیلے جانے کے بعد یہ حقیقت آشکار ہوتی ہے کہ ایک ایسا قرضہ لے لیا گیا ہے۔ جو انتہائی تکلیف دہ ثابت ہو رہا ہے اور پھر اس سے متعلقہ سود کی ادائیگی کے لئے نئے قرضے لینے پڑتے ہیں جس سے اصل قرض میں کمی کی بجائے اضافہ ہو جاتا ہے جب یہ نیا قرضہ بھی ختم ہو جاتا ہے تو اس قرضے کی نہیں بلکہ اس کے سود کی ادائیگی کے لئے نئے نئے ٹیکس عائد کرنے پڑتے ہیں۔ ان ٹیکسوں سے حاصل کردہ رقوم قرض کی ایک ایسی صورت ہے جو ان قرضوں کو ادا کرنے کے لئے لیا جاتا ہے جن کی ادائیگی کی مدت قریب الاختتام ہو۔

بعد ازاں ان قرضوں کو دوسرے قرضوں میں تبدیل کرنے کی نوبت آجاتی ہے۔ لیکن اس طرح اصل زر کی وصولی کی صورت تو عنقا رہتی ہے البتہ سود کی شرح میں کمی واقع ہو جاتی ہے۔ علاوہ ازیں اس قسم کے تبادلے قرض خواہوں کی منظوری کے بغیر ہو بھی نہیں سکتے۔

اسی لئے تبادلے کے اعلان کے ساتھ ہی ان حصہ داروں کو روپیہ واپس کرنے کی پیشکش کی جاتی ہے جو اپنے تمسکات کو نئے تمسکات میں تبدیل نہیں کرنا چاہتے۔ اگر ہر شخص نئے تمسکات خریدنے سے انکاری ہو اور اپنے روپے کی واپسی کا مطالبہ کرے تو حکومت اپنے ہی پھیلائے ہوئے دام میں پھنس سکتی ہے اور مجوزہ رقوم نہ ادا کر سکنے کے باعث اس کا دیوالیہ نکل سکتا ہے۔

غیر یہودی حکومتوں کی یہ خوش قسمتی ہے کہ ان کے مالی امور سے واقفیت رکھنے والے عوام نے ہمیشہ نئی سرمایہ کاری پر مبادلے کے نقصانات اور سود میں کمی قبول کر لینے کو ترجیح دی ہے۔ اور اس طرح ان حکومتوں کو بارہا اپنے کندھوں سے لاکھوں روپے کے قرضوں کا بوجھ اتارنے کے قابل بنایا ہے۔

آج کل غیر ملکی قرضوں کے ساتھ غیر یہودیہ چالیں نہیں چل سکتے کیونکہ انہیں بخوبی علم ہے کہ اس صورت میں ہم اپنی تمام رقوم کی واپسی کا مطالبہ کر دیں گے۔ اس طرح [illegible] دیوالیہ پن سے مختلف ممالک پہ یہ حقیقت بخوبی منکشف ہو جائے گی کہ وہاں کے فرمانرواؤں اور عوامی مفادات کے درمیان کوئی قدر مشترک نہیں ہے۔

میں آپ کو اس نکتہ اور درج ذیل حقائق پر خصوصی غور و خوص کی دعوت دیتا ہوں۔

آج کل تمام ملکی قرضوں کو عارضی نوعیت کے قرضوں سے تقویت دی جاتی ہے یہ قرضے سیونگ بنکوں میں ادا شدہ رقموں اور محفوظ سرمائے پر مشتمل ہوتے ہیں۔ اگر یہ رقوم زیادہ عرصہ تک حکومت کے پاس پڑی رہیں تو غیر ملکی قرضوں کے سود کی ادائیگی میں اڑ جاتی ہیں اور انہیں پورا کرنے کے لئے متوازی رقمیں مہیا کرنی پڑتی ہیں۔ اور یہی وہ آخری رقوم غیر یہود کے سرکاری خزانوں کی درزوں کے لئے پیوند کاری کا کردار ادا کرتی ہیں۔

کرہ ارض کے ہر خطے پر ہماری تخت نشینی کے بعد تمام مالیاتی ہیر پھیر ہمارے مفادات کے خلاف اسی نوعیت کے دیگر ادل بدل صفحہ ہستی سے اس طرح مٹا دئے جائیں گے کہ ان کا کوئی نقش باقی نہ رہے۔ ہم زر کی تمام منڈیوں کا بھی خاتمہ کر دیں گے کیونکہ ہم قیمتوں کے

اتار چڑھاؤ کے باعث اپنی مخصوص اقدار پر استوار شدہ وقار کو مجروح نہیں ہونے دیں گے۔ اشیاء کی قیمتیں ان کی خوبیوں کو ملحوظ رکھتے ہوئے بذریعہ قانون مقرر کردی جائیں گی اور ان میں کمی بیشی کا کوئی امکان نہیں رہے گا (قیمتوں میں اضافہ ان میں کمی کا جواز بنتا ہے۔ ہم نے غیر یہود کے ساتھ قیمتوں کے بارے میں یہی چال اختیار کر رکھی ہے۔)

ہم زر کی منڈیوں کی جگہ قرض کے لین دین کے لئے شاندار سرکاری ادارے قائم کریں گے جن کا مقصد صنعتی اشیاء کی قیمتوں کا تعین حکومت کے نظریات کی روشنی میں کرنا ہوگا۔ یہ ادارے پانچ سو ملین کے صنعتی تمسکات کو ایک ہی دن میں خرید لینے یا فروخت کرنے کی پوزیشن میں ہوں گے۔ اس طرح تمام صنعتی سرگرمیوں کا انحصار ہم پر ہوگا۔ آپ خود تصور کریں کہ اس طرح ہم کتنی عظیم طاقت کے مالک بن جائیں گے۔

اب تک میں نے جو کچھ آپ کو بتایا ہے اس میں میں نے ماضی حال اور مستقبل کے اسرار و رموز مستقبل قریب میں رونما ہونے والے اہم واقعات کے سیلاب غیر یہود کے ساتھ ہمارے تعلقات کے رازوں نیز مالیاتی منصوبوں کی تصویر پیش کرنے کی کوشش کی ہے۔ اس موضوع پر مجھے ابھی کچھ مزید روشنی ڈالنا ہے۔ ہمارے ہاتھ میں وقت کی اہم ترین طاقت ہے -- سونا -- ہم جس قدر چاہیں اسے دو دن میں اپنے ذخائر سے حاصل کرسکتے ہیں۔

یقیناً اس امر کے لئے اب مزید کسی ثبوت کی ضرورت نہیں رہی کہ اللہ تعالٰی نے فرمانروائی ہمارا مقدر بنادی ہے۔ اس عظیم عظمت و شوکت کے ساتھ ہم یقیناً یہ بات ثابت کرنے میں کامیاب رہیں گے کہ ہمارا صدیوں برائیوں کا ارتکاب ہی بالآخر فلاح عامہ کا باعث بنا ہے اور اس کے نتیجہ میں دنیا میں نظم و ضبط کا سورج طلوع ہوا ہے اور یہ امن و عافیت کا گہوارہ بن سکی ہے۔ ممکن ہے نظم و ضبط کی بحالی اور امن و امان کے قیام کے لئے کچھ تشدد بھی استعمال کرنا پڑے لیکن ہم اس مقصد کے حصول میں کامیاب ہو کر رہیں گے۔

ہم یہ ثابت کرنے کی تدابیر کریں گے کہ ہم ہی وہ محسن اور بہی خواہ ہیں جنہوں نے انتشار و افتراق سے پارہ پارہ کرہ ارض کو حقیقی فلاح سے آشنا کیا ہے۔ زخموں سے چور چور اور مظالم میں پسی ہوئی نوع انسان کو شخصی آزادی ... ا ہے۔ ہم اس امر کا بھی اہتمام کریں

کہ مراتب و مناصب کے باہمی وقار کو ملحوظ رکھتے ہوئے اس شخصی آزادی سے خوب لطف اندوز ہوا جاسکے۔

لیکن ہمارے تشکیل کردہ قوانین کی اطاعت اشد طور پر لازمی ہوگی۔ کیونکہ جس طرح کسی شخص کی عظمت و قوت کا یہ مطلب نہیں ہو سکتا کہ وہ آزادی ضمیر، مساوات اور ایسے دوسرے خوش کن اور پرجوش نعروں کی آڑ میں تباہ کن اصولوں کو فروغ دیتا رہے اسی طرح آزادی کا مفہوم نہ تو انتشار و نفاق ہے اور نہ ہی بے راہ روی اور بے لگامی۔ اس سے ہر گز یہ مراد نہیں کہ کوئی شخص مشتعل ہو کر بے لگاہ ہجوم کے سامنے نفرت انگیز تقریریں کر کے انہیں سرکشی پر آمادہ کرتا پھرے بلکہ حقیقی آزادی سے مراد تو ہر اس شخص کی عزت و ناموس کا تحفظ ہے جو روز مرہ زندگی کے قوانین کی مخلصانہ انداز میں مکمل طور پر پابندی کرتا ہو۔ انسانی وقار کا راز اپنی انا سے متعلق خیالی پلاؤ پکانے میں نہیں بلکہ حقوق کے تعین اور فرائض کی ادائیگی میں مضمر ہے۔

ہماری حکومت ہمہ مقتدر ہونے کے باعث انتہائی جاہ و جلال کی مالک ہوگی جو فرمانروائی بھی کرے گی اور رہنمائی بھی۔ یہ ان رہنماؤں اور مقرروں کی تقلید میں حالات کو ابتر نہیں ہونے دیں گی جو چیخ چیخ کر پھٹی آواز میں بے معنی الفاظ کو دہراتے رہتے ہیں اور انہیں عظیم اصولوں کا نام دیتے ہیں۔ حالانکہ ان کی حقیقت کسی شیخ چلی کے خیالی منصوبوں سے زیادہ نہیں۔

ہماری حکومت میں نظم و ضبط اپنے کمال پر ہوگا اور اسی میں نوع انسانی کی تمام راحتیں اور مسرتیں مضمر ہیں۔ اس کے گرد پھیلے ہوئے قدرت کے پراسرار ہالے کے باعث لوگوں کے دلوں میں باطنی طور پر جذبہ اطاعت کی تحریک پیدا ہوگی اور تمام قومیں احساس خود کے ساتھ ساتھ اس کی تعظیم و تکریم بھی کریں گی۔ حقیقی قوت کبھی بھی کسی قسم کے حقوق کے ساتھ مصالحت نہیں کرتی۔ بلکہ خدا کے ساتھ بھی نہیں۔ کوئی طاقت اس کے نزدیک نہیں پھٹکا کرتی۔ کسی کی ہمت نہیں کہ اس سے ایک گز زمین کا ٹکڑا ہی حاصل کرسکے۔

قوت کا مظاہرہ بذریعہ دہشت گردی

اپنے عزائم کی تکمیل کے لئے ہمارے لئے اسلحے کے انبار لگانا اور پولیس کی قوت میں اضافہ کرنا بہت ضروری ہے۔ ہمارا نصب العین یہ ہے کہ دنیا کی تمام مملکتوں میں ہمارے علاوہ صرف مزدور اور محنت کش طبقہ رہ جائے۔ چند ایک کروڑ پتی بھی ہوں جو صرف ہمارے مفادات کے لئے کام کرتے رہیں۔ علاوہ ازیں پولیس کے ذریعے تمام یورپ میں یورپ کی وساطت سے دوسرے براعظموں میں بھی ہمیں فسادات، انتشار اور جنگ و جدل کی آگ بھڑکانی ہے۔ اس سے ہمیں دوہرا فائدہ ہوگا۔

اول ہم تمام ممالک کو اپنے قابو میں رکھ سکیں گے کیونکہ وہ اس امر سے خائف ہوں گے کہ ہمارے پاس ہی وہ طاقت ہے جس سے ہم کسی ملک کو جب چاہیں بدنظمی اور انتشار کا شکار بنا سکتے ہیں۔ اور اس میں امن بھی بحال کر سکتے ہیں۔

اس طرح یہ تمام ممالک ہمیں ایک ناگزیر مطلق العنان کی حیثیت سے دیکھنے کے عادی ہو جائیں گے۔

دوئم۔ ہم ان تمام ڈوروں کو جو سیاسی نظام، معاشی معاہدوں اور قرضوں کے نام پر تمام مملکتوں کی کابینوں میں پھیلا رکھی ہیں الجھا کر رکھ دیں گے۔ اس مقصد کے حصول کے لئے ہمیں مذاکرات اور معاہدوں کے دوران انتہائی مکاری اور فراست سے کام لینا ہوگا۔ لیکن جہاں تک سرکاری زبان کا تعلق ہے۔ ہمیں اس کے برعکس حربے استعمال کرنے ہوں گے۔ ہمیں دیانت داری اور اطاعت گزاری کا لبادہ اوڑھنا ہوگا۔

اس طرح غیریہود اقوام کے عوام اور حکومتیں جنہیں ہم نے پیدا کردہ مسائل کی صرف ظاہری ہیئت ہی کو دیکھنا سکھایا ہے۔ ہمیں نسل انسانی کا محسن، نجات دہندہ اور مہر و محبت کا پیکر سمجھتی رہیں گی۔

اس کے علاوہ ہمیں اس قابل ہونا چاہئے کہ اگر کوئی ملک ہماری مخالفت کی جرات کرے تو ہم اس کے ہمسایوں کے ساتھ مل کر اس کی ہر مخالفانہ کارروائی کا جنگ کے ذریعے منہ توڑ جواب دے سکیں۔ لیکن اگر یہ ہمسائے بھی ہمارے خلاف متحد ہونے کی جسارت کریں تو پھر ہم ان کا مقابلہ عالمی جنگ کی صورت میں کریں گے۔

سیاسیات میں کامیابی کا اصل راز یہی ہے کہ تمام کارروائیوں کو صیغہ راز میں رکھا جائے۔ نیز ماہرین سیاسیات کے قول و فعل میں کوئی مطابقت نہیں ہونی چاہئے۔ ہمیں تمام غیریہودیوں کی حکومتوں کو اس امر پر مجبور کرنا ہے کہ وہ اپنی سرگرمیوں کو ہمارے منصوبوں اور پروگراموں کے مطابق مرتب کریں۔ جو پہلے ہی مطلوبہ کمال کو پہنچ رہے ہیں۔ ہم اپنی نام نہاد اور عظیم طاقت 'پریس کے ذریعہ اپنے منصوبوں کی حمایت میں خفیہ طور پر رائے عامہ کو ہموار کرتے رہتے ہیں۔ کیونکہ پریس معدودے چند مستثنیات کے جنہیں قابل اعتنا نہیں سمجھنا چاہئے مکمل طور پر ہمارے قبضہ میں ہے۔ المختصر یورپ میں غیریہودی حکومتوں کو اپنے زیر تسلط رکھنے کے لئے ہم اپنی قوت کا مظاہرہ کسی ایک مملکت پر تشدد اور دہشت گردی سے کریں گے۔ ضرورت پڑنے پر سب کا یہی حشر کیا جائے گا۔ ہمارے خلاف عام بغاوت کے امکان کی صورت میں ہم امریکہ، چین اور جاپان کی بندوقوں سے جوابی کارروائی عمل میں لائیں گے۔

پریس کا گھناؤنا رول

پیٹ کی روز' کی ضروریات غیریہود کو خاموشی اختیار کرنے اور ہمارے حقیر خادم رہنے پر مجبور کرتی ہیں۔ لہٰذا ایسے امور جنہیں براہ راست سرکاری دستاویزات میں لاتے ہوئے ہمیں دقت محسوس ہوگی، انہیں پریس میں بھرتی کئے گئے غیریہودی کارندے ہمارے ہی احکامات کے تحت زیر بحث لے آئیں گے اور پھر اس شور و غوغا کے دوران ہی ہم اپنے مطلوبہ اقدامات پر عمل درآمد کرنے میں کامیاب ہو جائیں گے اور آخر کار انہیں عوام کے سامنے مسلمہ حقائق کی صورت میں پیش کر دیں گے۔

کسی معاملے کا ایک بار تصفیہ ہو جائے گا تو کوئی شخص بھی طے شدہ فیصلوں کی تنسیخ کا مطالبہ کرنے کی جرات نہیں کرے گا۔ علاوہ ازیں پریس فوری طور پر لوگوں کے خیالات کا رخ نئے مسائل کی طرف موڑ دے گی۔ اس طرح یہ ذہنی صلاحیتوں سے عاری لوگ ایک بار پھر نئے مسائل پر بحث و تمحیص میں الجھ پڑیں گے۔ حالانکہ وہ احمق اتنی سی بات بھی تو سمجھنے کی اہلیت نہیں رکھتے کہ جن مسائل پر وہ گرما گرم بحث کر رہے ہیں ان کے بارے میں وہ قطعاً

کوئی تصور تک پیش نہیں کر سکتے۔ سیاسی نظام سے متعلقہ مسائل کو تو صرف وہی لوگ سمجھ سکتے ہیں جنہوں نے خود اس کی تشکیل میں حصہ لیا ہو اور جن کے ہاتھوں میں صدیوں سے ان کی باگ ڈور رہی ہو۔

ان حقائق کی روشنی میں آپ یہ نتیجہ اخذ کر سکتے ہیں کہ رائے عامہ کو ہموار کر کے ہم اپنی مشینری کے نظام کار کو آسان بنا رہے ہیں اور آپ یہ بھی کہہ سکتے ہیں کہ عوام سے اپنی کارکردگی پر نہیں بلکہ مختلف مسائل پر وقتاً فوقتاً دئے گئے بیانات کی توثیق حاصل کرتے ہوئے دکھائی دیتے ہیں۔

ہم متواتر پبلک میں یہ اعلان کرتے رہتے ہیں کہ ہم اپنے تمام منصوبوں میں اس امید اور یقین سے رہنمائی حاصل کرتے ہیں کہ ہم خدمت خلق اور رفاہ عامہ کے جذبے سے سرشار ہیں اور اسی جذبے کے تحت تمام امور کو سرانجام دے رہے ہیں۔

جو لوگ ہمارے لئے ضرورت سے زیادہ پریشانی کا باعث ہوں گے ان کی توجہ سیاسی مسائل سے ہٹا کر ان مسائل کی طرف منعطف کر دی جائے گی جنہیں ہم نے سیاسی مسائل کے نام سے پیش کر رہے ہیں اور یہ مسائل صنعتی مسائل ہیں۔ ان کے بارے میں غیر یہودیوں کو بے ہودہ بحث و تمحیص میں الجھنے دیجئے۔ عوام عملی زندگی سے علیحدگی پر رضامند ہو گئے ہیں۔

ان سرگرمیوں سے چین لینے کے لئے جنہیں وہ سیاسی سرگرمیوں کا نام دیتے ہیں اور جن میں ملوث ہونے کی ہم نے انہیں خود تربیت دی ہے تاکہ غیر یہود حکومتوں کا مقابلہ کرنے میں وہ ہمارے آلہ کار بن سکیں وہ اس علیحدگی پر اس شرط پر تیار ہو گئے ہیں کہ انہیں ہم ایسے پیشے مہیا کر دیں جو ان کے سیاسی مقاصد سے مطابقت رکھتے ہوئے دکھائی دیتے ہوں۔

اس خطرے کے پیش نظر کہ مبادا عوام یہ اندازہ نہ کر لیں کہ انہیں کس طرح آلہ کار بنایا جا رہا ہے ہم ان کی توجہ کا رخ تفریحات، کھیل تماشوں، ہوس پرستی، تماشاگاہوں اور عالی شان ہوٹلوں کی طرف موڑ دیں گے۔ ہم پریس کے ذریعے آرٹ، اور ہر قسم کے کھیلوں کے

مقابلے کی تجاویز پیش کریں گے۔

اس قسم کی دل چسپیاں ان کی توجہ کو ہمیشہ کے لئے ان مسائل سے ہٹا دیں گی جن کی ہم مخالفت کرنے پر مجبور ہوں گے۔ جب لوگ غور و فکر اور سوچ بچار کرنے نیز اپنے نظریات قائم کرنے کی عادت سے عاری ہو جائیں گے تو وہ ہماری ہی زبان میں بات کرنا شروع کر دیں گے کیونکہ صرف ہم ہی انہیں فکر کی نئی راہیں سمجھائیں گے۔ واضح رہے کہ یہ کام ایسے لوگوں سے لیا جائے گا جن کے متعلق ہمارے ساتھ اشتراک عمل کا شبہ تک نہ کیا جا سکے۔

ہماری حکومت کے تسلیم کئے جانے پر حریت پسندوں اور خوابوں کی دنیا میں رہنے والوں کا کام بھی ختم ہو جائے گا۔ اس وقت تک یہ لوگ ہمارے لئے مفید خدمات سرانجام دیتے رہیں گے۔ لہٰذا اس دوران ہم ان کے اذہان کو عجیب و غریب نظریات جو بظاہر نئے اور ترقی پسندانہ دکھائی دیتے ہیں، کی آماجگاہ بنا دیں گے۔ کیا ہم پہلے ہی غیر یہودیوں کے بے مغز سروں میں ترقی کا جنون بھرنے میں مکمل طور پر کامیاب نہیں ہو گئے ہیں؟

ہمارا یہ عمل اس وقت تک جاری رہے گا جب تک غیر یہودیوں میں ایک بھی ذہن یہ سوچنے کے قابل ہو کہ مادی ایجادات کے علاوہ باقی تمام امور میں لفظ ترقی حق و صداقت سے انحراف کے مترادف ہے۔ کیونکہ صداقت تو واحد ہے جس میں ارتقاء و ترقی کی قطعاً کوئی گنجائش نہیں۔ ترقی ایک غلط تصور کی مانند صداقت کو اپنی جھوٹی آب و تاب سے ظلمت و تاریکی کے پردوں میں چھپا دیتی ہے۔

اس حقیقت سے صرف ہم ہی آگاہ جو حق و صداقت کے محافظ اور خدا کے محبوب ہیں۔ جب ہم اپنی سلطنت پر مکمل اقتدار حاصل کر لیں گے تو ہمارے مقررین ان تمام عظیم مسائل کی تفصیلات بیان کریں گے جو انسانیت کو زیر و زبر کر کے بالآخر ہماری منزہ امن حکومت کے تحت لانے کا سبب بنے۔ کیا کوئی شخص یہ بھی گمان کر سکتا ہے کہ ہم اس سارے ڈرامے میں دنیا کی تمام اقوام کو اپنے سیاسی منصوبے کے مطابق استعمال کرتے رہے اور لوگ کئی صدیاں گذرنے پر بھی قطعاً اس کا کوئی اندازہ نہ کر سکے۔

ہٹی کا فروغ

اپنی سلطنت کی باگ ڈور سنبھالنے پر ہم اپنی توحیدی مذہب کے علاوہ، جس کے ساتھ بحیثیت خدا کی برگزیدہ قوم کے ہماری تقدیر وابستہ ہے اور جس کے باعث ہماری تقدیر دنیا کے تمام ممالک کی تقدیر سے منسلک ہے کسی اور مذہب کا وجود برداشت نہیں کریں گے۔ لہٰذا ہمیں ایمان و اعتقاد کی دوسری تمام صورتوں کو صفحہ ہستی سے نیست و نابود کرنا ہوگا۔ ممکن ہے اس طرز عمل سے کچھ لوگ الحاد اور بے دینی کی راہ اختیار کرلیں۔

جیسا کہ آج کے دور میں بھی ہے تو وہ ہمارے نظریات میں دخل اندازی نہیں کرسکیں گے۔ بلکہ ان نسلوں کے لئے باعث عبرت بنیں گے جو دین موسوی سے متعلق ہمارے وعظ و خطبات کو سنیں گے کہ کس طرح اس کے اٹل اور جامع نظام حیات کی بدولت دنیا کی تمام اقوام ہماری محکوم بن چکی ہیں۔

ہم اس کی باطنی کیفیات پر زور دیتے ہوئے یہ واضح کریں گے کہ اسی پر اس کی تمام تعلیمی قوت و طاقت کا انحصار ہے۔

ہر ممکن موقع پر مضامین کی اشاعت کے ذریعے ہم اپنے بابرکت دور حکومت کا ماضی کی حکومتوں سے موازنہ کرکے اپنے دور کے امن و عافیت کی برکات بیان کریں گے۔ خواہ یہ امن و عافیت کی فضا صدیوں کی بدامنی اور شورشوں کے بعد بزور شمشیر پیدا کی گئی ہو۔ ان برکات کے زیر عنوان ان فوائد کو بڑھا چڑھا کر بیان کیا جائے گا جن کی ہم نشان دہی کریں گے۔ علاوہ ازیں غیر یہودی حکومتوں کی غلطیوں کو بہت وضاحت سے پیش کیا جائے گا۔

ہم لوگوں کے دلوں میں ان کے خلاف نفرت و حقارت کے ایسے بیج بو دیں گے کہ وہ امن و عافیت کے دور میں حالت غلامی کو آزادی کے اس دور پر ترجیح دیں گے جس پر لفظی طور پر فخر تو کیا جا سکتا تھا لیکن جس نے انسانیت کو تعذیب میں ڈال رکھا تھا اور انسانی زندگی کے سرچشموں کو خشک کرکے رکھ دیا تھا جس میں بدمعاش قسم کے طالع آزماؤں اور مہم جوؤں نے ان وسائل کا خوب استحصال کیا جو انسانی وجود کو برقرار رکھنے کے لئے ضروری ہوتے ہیں حالانکہ وہ خود بھی اس امر سے آگاہ نہیں تھے کہ وہ کیا کر رہے ہیں؟

اس وقت تک طرز حکومت میں بکثرت تبدیلیاں، جن کے لئے ہم خود غیر یہودیوں کو ان

کے ریاستی ڈھانچے کی بنیادیں کھوکھلی کرنے کے دوران اکساتے رہے، اتنا تھکا دیں گی کہ وہ لوی میں ہر مصیبت کو اپنی حکومتوں کے تحت برداشت کئے ہوئے آلام و مصائب اور بدنظمی و انتشار کی فضا پر ترجیح دیں گے۔

علاوہ ازیں ہم غیر یہودی حکومتوں کی تاریخی غلطیوں کے اظہار کا کوئی موقع ہاتھ سے نہیں جانے دیں گے جن کے باعث انسانیت صدیوں سے دائمی عذاب میں مبتلا رہی ہے۔ یہ حکومتیں رفاہ عامہ کی بے اصل اور بے معنی سکیموں کا تعاقب کرتی رہیں اور ر اتنا بھی نہ سمجھ سکیں کہ ان سکیموں نے ہمیشہ صلاح احوال کی بجائے عالمی تعلقات کو ابتر ہی بنایا ہے جو دراصل انسانی زندگی کی اساس ہیں۔

ہمارے قواعد و ضوابط اور ان سے متعلق طریق استدلال کی قوت انہیں پیش کرنے کے انداز میں مضمر ہوگی۔ ہم ان کی خوبیاں اس انداز سے بیان کریں گے کہ وہ مردہ، گلے سڑے، فرسودہ اور قدیم سماجی نظام کے مقابلہ میں انتہائی اعلیٰ و ارفع معلوم ہوں۔

ہمارے فلاسفر غیر یہودیوں کے مختلف اعتقادات کی تمام خامیوں کو زیر بحث لائیں گے۔ لیکن کوئی شخص کبھی بھی ہمارے یقین و اعتقاد کو اس کے صحیح نقطہ نظر سے موضوع بحث نہیں بنا سکے گا۔ کیونکہ ہمارے فلاسفروں کے سوا کوئی اور اس سے واقف نہیں ہوگا اور وہ اس کے بھیدوں کو افشا کرنے کی جرات نہیں کریں گے۔

ترقی پسند اور روشن خیال کہلانے والے ممالک میں ہم نے لغو، فحش اور قابل نفرت قسم کے ادب کو پہلے ہی سے فروغ دے رکھا ہے۔ عنان اقتدار سنبھالنے کے کچھ عرصہ بعد تک عوام کو تقریروں اور ہماری پارٹی کے عظیم مرکز سے جاری کئے گئے پروگراموں کے مقابلے کم موثر قسم کی تفریحات مہیا کرنے کے لئے ہم اس قسم کے مخرب اخلاق ادب کی حوصلہ افزائی کرتے رہیں گے۔ ہمارے دانش ور جنہیں غیر یہود قیادت سنبھالنے کی تربیت دی جائے گی ایسی تقاریر، منصوبے، یادداشتیں اور مضامین تیار کریں گے جنہیں ہم غیر یہود کے ذہنوں کو متاثر کرنے کے لئے استعمال کریں گے تاکہ وہ صرف ہماری متعین کردہ علمی و فکری راہوں پر گامزن ہو سکیں۔

قتل عام کا منصوبہ

ہر جگہ ایک ہی دن انقلابات برپا کرانے کے بعد یقینی طور پر ہم اپنی مجوزہ سلطنت کا اقتدار سنبھال لیں گے۔ اس وقت تک حکومت کی تمام موجودہ صورتوں کے بودے پن کو تسلیم کر لیا جائے گا۔ اس وقت ہم ان سب لوگوں کو انتہائی بے دردی سے قتل کر دیں گے جو ہمارے اقتدار کا راستہ روکنے کے لئے ہتھیار اٹھائیں گے۔ خفیہ جماعتوں کی طرز کے ہر قسم کے نئے اداروں کو نیست و نابود کر دیا جائے گا۔ خفیہ تنظیموں کو جو ہمارے دائرہ علم میں ہیں اور جنہوں نے ہمارے لئے عظیم خدمات سرانجام دی ہیں اور آج بھی ہماری آلہ کار ہیں، توڑ دیا جائے گا۔

ان کے ارکان کو یورپ سے دور دراز کے براعظموں میں جلا وطن کر دیا جائے گا۔ ہمارے بھیدوں سے زیادہ تر واقف فری میسن کے غیر یہود اراکین کے ساتھ بھی ہم یہی بہیمانہ سلوک کریں گے۔ لیکن بعض مصلحتوں کے تحت اگر چند ایک سے صرف نظر کیا گیا تو وہ بھی جلاوطنی کے خوف سے مستقل عذاب میں رہیں گے۔

ہم ایک ایسا قانون وضع کریں گے جس کے تحت خفیہ تنظیموں کے تمام سابقہ اراکین کو ہماری حکومت کے صدر مقام یورپ سے بہت دور جلا وطن کر دیا جائے گا۔ ہماری حکومت کی قرار دادیں حرف آخر ہوں گی جن کے خلاف کسی قسم کی اپیل نہیں کی جا سکے گی۔

غیر یہودی معاشروں میں ہم نے انتشار و نفاق اور احتجاجات کے بیج بو کر ان کی جڑیں اتنی مضبوط کر دی ہیں کہ اب نظم و نسق بحال کرنے اور حکومت کو قوت کا سکہ جمانے کے لئے بے رحمانہ اقدامات کا نفاذ ضروری ہے۔ تشدد کا شکار ہونے والوں کی طرف کوئی توجہ نہیں دی جائے گی۔ کیونکہ وہ تابناک مستقبل کی بھینٹ چڑھائے جائیں گے۔ مستقبل کی فلاح و بہبود کا حصول ہر اس حکومت کا فرض ہے جو اپنی بقا کے لئے صرف حقوق ہی کو نہیں بلکہ فرائض کی ادائیگی کو بھی ضروری سمجھتی ہے۔

اس مقصد کے حصول کے لئے خواہ اسے قربانیاں ہی کیوں نہ دینی پڑیں؟ حکومت کے

استحکام و بقا کی سب سے بڑی ضمانت اس امر میں مضمر ہے کہ اس کے گرد قوت و طاقت کے ہالے کو مستحکم کیا جائے۔ اس ہالے کو برقرار رکھنے کے لئے ضروری ہے کہ طاقت کا ایسا عظیم الشان اور بے لچک مظاہرہ کیا جائے کہ لوگ اسے پر اسرار غیبی طاقت کی طرف سے واجب التعمیل علامت جانیں اور اسے حکم خداوندی سمجھتے ہوئے اس کے سامنے احترام سے سر تسلیم خم کر دیں ماضی قریب میں روس کی اشرافیہ حکومت کا یہی طرز عمل تھا جو پاپائیت کو چھوڑ کر دنیا بھر میں ہماری سب سے اہم اور تنہا دشمن تھی۔ اٹلی کا وہ واقعہ ذہن میں لائے سارا ملک خوف میں نہا رہا تھا لیکن خون کی ندیاں بہانے والے سولا (sulla) کا کوئی بال بھی بیکا نہ کر سکا۔ وہ لوگوں کی نظروں میں اپنی جرات و طاقت کے باعث دیوتا سمجھا جاتا تھا۔ اگرچہ اس نے انتہائی سفاکی اور بے دردی سے عوام کا قتل عام کیا تھا اس کے باوجود اٹلی میں اس کی دلیرانہ اور جرات مندانہ واپسی لوگ عزت و احترام سے اس کے گرد جمع ہو گئے در حقیقت کوئی شخص بھی ایسے فرد پر انگلی اٹھانے کی جرات نہیں کر سکتا جو اپنی دلیری، شجاعت اور ذہنی قوتوں سے لوگوں کو مسحور کر لے۔

خوبصورت نعروں کا فریب

ہمیں ایسے تمام ہتھیاروں اور اسلحہ سے لیس ہونا چاہئے جو دشمن ہمارے خلاف استعمال کر سکتے ہیں۔

بعض امور سے متعلق ہمیں ایسے فیصلے صادر کرنے ہوں گے جو لوگوں کی نظروں میں خلاف معمول، غیر معمول اور غیر منصفانہ ہوں گے لیکن ان کے قانونی جواز کے لئے ہمیں لغات کی کتابوں سے پیچیدہ نکات کی وضاحت پیش کرنے کے لئے دل کش انداز بیان اختیار کرنا ہو گا کیونکہ یہ امر بہت ضروری ہے کہ ان فیصلوں اور قرار دادوں کو ایسے حسین الفاظ کا جامہ پہنایا جائے تو یہ تاثر دے سکے کہ دراصل اعلیٰ ترین اور وجد آفرین اخلاقی اقدار و ضوابط ہی کو قانون کی صورت دے دی گئی ہے۔

ہماری انتظامیہ کو اپنے ارد گرد تہذیب کی ان تمام قوتوں کو مجتمع کرنا ہو گا جن کے

درمیان رہ کر اسے اپنے فرائض سرانجام دیتے ہیں۔ اس کے گرد مشتہرین، ماہرین قانون، منتظمین، ڈپلومیٹ اور وہ افراد بھی جمع ہوں گے جنہیں ہماری خصوصی درسگاہوں میں مخصوص انداز فکر و نظر کی اعلیٰ تعلیم و تربیت سے مزین کیا جائے گا۔ یہ افراد سماجی ڈھانچے کے تمام اسرار و رموز سے آگاہ ہوں گے۔ وہ ان تمام زبانوں سے واقف ہوں گے جو سیاسی ابجد اور الفاظ سے وجود میں آسکتی ہیں۔ انہیں انسانی فطرت کے خفیہ پہلوؤں اور ان حساس تاروں سے آشنا کرایا جائے گا جن کو چھیڑ کر وہ اپنی مقاصد حاصل کر سکیں۔ یہ تار غیر یہودیوں کی افتاد طبع، ان کے رجحانات، ان کی کمزوریوں، ان کی خوبیوں، ان کے طبقات و حالات کی تفصیلات پر مشتمل ہیں۔ یہ امر محتاج وضاحت نہیں کہ حکومت کے یہ ذہین اور باصلاحیت معاونین جن کا میں ذکر کر رہا ہوں غیر یہودیوں سے نہیں لئے جائیں گے جو اپنے انتظامی امور کو سرانجام دیتے ہوئے اتنا سوچنے کی زحمت اٹھانے کے بھی عادی نہیں کہ ان کے کیا مقاصد ہیں؟ ان کا نفاذ کیوں ضروری ہے؟ غیر یہود کے منتظمین کاغذات کو پڑھے بغیر دستخط کرنے کے عادی ہیں۔ اور ان کا مطمع نظر حصول زر ہے یا پھر ہوس کے بندے ہیں۔

ہماری حکومت کے گرد ماہرین معاشیات کی ایک دنیا آباد ہوگی۔ یہی وجہ ہے کہ یہودیوں کو دی جانے والی تعلیم میں اقتصادی سائنس کو ایک اہم مضمون کی حیثیت حاصل ہے۔ ہمارے چاروں طرف بنک کاروں، صنعت کاروں، سرمایہ داروں اور خصوصاً کروڑپتیوں کا ایک مجمع ہوگا کیونکہ درحقیقت ہر مسئلہ اعداد و شمار کی روشنی میں طے ہوگا۔

وہ وقت قریب ہے جب ہماری مملکتوں کے اہم عہدوں پر ہمارے یہودی بھائیوں کو فائز کرنے میں کوئی خطرہ نہ ہوگا۔ لیکن اس وقت تک ہم ان کی باگ ڈور ان لوگوں کو دے سکتے ہیں۔ جن کا ماضی اور شہرت اس امر کی غمازی کرتے ہوں کہ ان کے اور عوام کے درمیان وسیع خلیج حائل ہے۔ ہماری ہدایات کی خلاف ورزی کی صورت میں انہیں مجرمانہ الزامات کا سامنا کرنا پڑے گا یا پھر اپنی زندگی ہی کا خاتمہ کرنا ہوگا۔ اس طریق کار سے لوگوں کو ایک ایسا سبق ملے گا کہ وہ آخری سانس تک ہمارے مفادات کے لئے کام کرنے پر مجبور ہوں گے۔

نعروں کی سیاست

ہمارے قواعد و ضوابط کو عملی جامہ پہنانے سے پیشتر ان قوموں کی عادات و اطوار کا مطالعہ بھی ضروری ہے جن کے ملک میں آپ بود و باش اختیار کئے ہوں اور اپنی سرگرمیوں میں مصروف عمل۔ علاوہ ازیں تاوقتیکہ عوام کو ہمارے تعلیمی نظام کے مطابق از سرنو تعلیم سے آراستہ نہیں کیا جائے گا، ان قواعد و ضوابط کا سب پر یکساں اطلاق کامیابی کا ضامن نہیں ہوگا۔ لیکن اگر انہیں احتیاط سے بروئے کار لایا جائے تو آپ دیکھیں گے کہ دس سال کا عرصہ بھی گذرنے نہ پائے گا کہ انتہائی ضدی اور ہٹ دھرم قسم کے افراد کے ذہنوں میں بھی تغیر رونما ہو کر رہے گا۔ لہٰذا اس طریق کار سے پہلے ہمارے شکنجے میں آئے ہوئے افراد کی صفوں میں مزید اضافہ ہو جائے گا۔

ہماری سلطنت کے قیام پر حریت پسندوں اور روشن خیالوں کا نعرہ آزادی، مساوات اور اخوت جو درحقیقت میسنری کا نعرہ ہے ایسے الفاظ میں تبدیل کر دیا جائے گا جن کی حیثیت ایک نعرے یا مطالبے کی نہیں ہوگی بلکہ وہ محض ایک تصور کا اظہار کریں گے یعنی "آزادی کا حق، مساوات کے فرائض، اخوت کا تصور" ہم اس کی تاویل اسی انداز سے کریں گے اور مشکلات کا مقابلہ کرنے کا طریق کار بھی یہی ہے۔ جہاں تک حقیقی حکمرانوں کا تعلق ہے اپنے سوا ہم نے سب ہی کو صفحہ ہستی سے مٹا دیا ہے۔ اگرچہ آئینی حکمران آج بھی خاصی تعداد میں موجود ہیں۔ ان دنوں اگر کوئی حکومت ہمارے خلاف آواز بلند کرتی ہے تو یہ ہمارے ہی ایما پر اور ہماری ہی ہدایات کے تحت محض رسمی کاروائی ہوتی ہے کیونکہ ایسے لوگوں کو قابو میں رکھنے کے لئے جن کا رویہ ہمارے ساتھ غیر ہمدردانہ ہے، بظاہر سامی دشمنی کی پالیسی اختیار کرنا ناگزیر ہے اب میں مزید تفصیلات میں نہیں جاؤں گا کیونکہ یہ مسئلہ بار بار زیر بحث آچکا ہے۔ ہمارے دائرہ عمل کو کوئی رکاوٹ کوئی مزاحمت محدود نہیں کر سکتی۔ ہماری عظیم حکومت غیر قانونی اساس ہی پر قائم رہ سکتی ہے جسے عام اصطلاح یا بہترین الفاظ میں آمریت سے تعبیر کیا جاتا ہے۔ میں اس حیثیت میں ہوں کہ پوری ہوش مندی سے آپ پر یہ واضح کر دوں کہ وقت آنے پر ہم قانون کی تشکیل کرنے والے ہی فیصلے بھی صادر کریں گے اور سزائیں بھی نافذ کریں گے۔ ہم قتل کریں گے اور کسی کو نہیں بخشیں گے اپنی فوجوں کے سپہ سالار کی

حیثیت سے زمام قیادت ہمارے ہاتھ میں ہو گی۔ چونکہ ہمارے دائرہ اختیار میں وہ عناصر بھی ہوں گے جو کبھی صاحب اختیار اور طاقت ور تھے لیکن بعد ازاں ہمارے ہاتھوں مغلوب ہوئے لہٰذا ایسے عناصر کو قابو میں رکھنے کے لئے ہمیں قوت ارادی کے بل بوتے پر حکمرانی کرنی ہو گی۔ لامحدود خواہشات، حرص و آز کی بھڑکتی ہوئی آگ، سنگدلانہ انتقام اور نفرت و حسد کے جذبات ہمارے ہتھیار ہیں۔

آپ یہ یقین کیجئے کہ ہر سو پھیلی ہوئی دہشت گردی اور درندگی کا سرچشمہ ہم ہی ہیں۔ ہر مکتبہ فکر کے لوگ ہر نظریہ کے حامل افراد بادشاہت کی بحالی کے خواہاں، فتنہ پرور اور شورش انگیز رہنما، سوشلسٹ، کیمونسٹ، خوابوں کی دنیا میں رہنے والے شیخ چلی سبھی ہماری غلامی کا دم بھرتے ہیں۔ ہم نے انہیں اپنے مقاصد کے حصول کے لئے جوت رکھا ہے۔ ان میں سے ہر ایک اپنے طور پر بچی کھچی حکومتوں کی جڑیں کھودنے اور نظم وضبط کی تمام مسلمہ صورتوں کو زیر و زبر کرنے میں سرگرم عمل ہے۔ ان سرگرمیوں کے باعث تمام ریاستیں اذیت سے دو چار ہیں۔ وہ سکون واطمینان کے لئے پند ونصائح سے کام بھی لیتی ہیں اور حصول امن کے لئے تو سب کچھ نثار کرنے کرنے کو بھی تیار ہیں۔ لیکن جب تک وہ ہماری بین الاقوامی سپر حکومت کو عجزو انکسار سے تسلیم نہ کرلیں گی۔ ہم انہیں امن و چین سے نہیں بیٹھنے دیں گے۔

اگرچہ لوگوں نے سوشلزم کے مسئلے کو بین الاقوامی معاہدے کے ذریعے طے کرنے کی ضرورت پر بہت زور دیا ہے لیکن مختلف پارٹیوں میں تقسیم ہونے کے باعث وہ ہمارے ہاتھوں میں کھیلنے پر مجبور ہیں کیونکہ کش مکش کو برقرار رکھنے اور انتخابی مقابلوں کی جدوجہد کے لئے ہر شخص کو سرمائے کی ضرورت پڑتی ہے جو تمام کا تمام ہمارے ہاتھوں میں مرکوز ہے۔

ہمارے پاس ایسی وجوہات موجود ہیں جن کے باعث ہم محسوس کرتے ہیں کہ غیر یہودیوں کے عقابی نظر رکھنے والے دور اندیش بادشاہوں اور ان کے عوام کی ناعاقبت اندیش قوت کے مابین اتحاد ممکن ہے لیکن ہم نے اس امکان کے خلاف پہلے ہی ضروری اقدامات کرلئے ہیں۔ ہم نے دونوں قوتوں کے درمیان خوف و ہراس کی فصیل کھڑی کر رکھی ہے اس طرح ہم ہمیشہ اور ہر جگہ عوام کی اندھی طاقت کی تائید حاصل کرنے میں کامیاب ہو جاتے ہیں۔ ہم اور

صرف ہم انہیں قیادت مہیا کریں گے اور یقیناً انہیں ان راہوں پر گامزن کریں گے جن کا رخ ہماری منزل کی طرف ہے۔

اس مقصد کے پیش نظر کہ مختلف ممالک کے ناعاقبت اندیش عوام ہماری گرفت سے آزاد ہونے میں کامیاب نہ ہو جائیں ہمیں اکثراوقات ان سے رابطہ قائم کرتے رہنا چاہئے۔ اگر ذاتی طور پر یہ ممکن نہ ہو تو اپنے چند خاص معتمدین کی وساطت سے ہر قیمت پر ان سے میل جول کی راہیں نکالنا ہو گی۔ جب تمام دنیا میں ہماری حیثیت واحد حکمران کے طور پر تسلیم کرلی جائے گی تو پھر ہم عوام سے بازاروں اور منڈیوں میں براہ راست گفتگو کریں گے اور سیاسی مسائل پر انہیں اس انداز سے ہدایات دیں گے کہ ان کی سوچ کے دھارے ہمارے مفادات کا رخ اختیار کرلیں۔ اس مقصد کا حصول بہت سہل ہو گا۔ آپ بخوبی جانتے ہیں کہ اس امر کی تصدیق کا حصول بہت سہل ہو گا۔ آپ بخوبی جانتے ہیں کہ اس امر کی تصدیق تو کوئی نہیں کرتا کہ دیہاتی علاقوں کی درسگاہوں میں کیا پڑھایا جاتا ہے؟ لیکن کسی حکومت کے سفیر یا تخت سلطانی کے مالک فرمانروا کی زبان سے نکلے ہوئے الفاظ فوری طور پر ساری مملکت میں مشہور ہو جاتے ہیں۔ کیونکہ عوام کی آواز انہیں ہر طرف پھیلا دیتی ہے۔ اس خدشے کے پیش نظر کہ غیر یہودیوں کے ادارے مخصوص وقت سے پہلے ہی نیست و نابود نہ ہو جائیں، ہم نے ان پر نہایت مہارت، ہوشیاری اور احتیاط سے ہاتھ ڈالا ہے۔ ہم نے ان کے نظام کو کنٹرول میں رکھنے والے محرے پر قابو پالیا ہے۔ جو ان کے ہاں حقیقی معنوں میں امن و امان بحال رکھنے کے ذمہ دار تھے۔

ہم نے انہیں ہر قیسم کے نظام کو درہم برہم کرنے والے آزادی کے پروانے سے تبدیل ک دیا ہے۔ عدل و انصاف کے نفاذ، انتخابات کے انعقاد، پریس، شخصی آزادی، خاص طور پر تعلیم و تربیت جو کسی ملک کے آزادانہ وجود کے لئے بنیادی حیثیت رکھتی ہے، ان سب امور میں ہمارا ہاتھ کارفرما ہے۔ ہم نے غیر یہود کی نوجوان نسل کو احمق، مختل الدماغ، بدچلن اور اخلاقی طور پر دیوالیہ بنا دیا ہے اور ان کی تربیت ایسے نظریات اور عقائد کی روشنی کی ہے جو ہمارے ہی پیش کردہ ہیں اور جان کے متعلق ہمیں بخوبی علم ہے کہ قطعاً بے بنیاد اور غلط

ہیں۔ علاوہ ازیں موجودہ قوانین میں کوئی خاص تبدیلی لائے بغیر متضاد قسم کی توضیحات سے انہیں توڑ موڑ کر ہم نے ایسے نتائج اخذ کیے ہیں جو بظاہر بہت پرشکوہ نظر آتے ہیں۔ ان نتائج کا یہ فائدہ ہوا ہے کہ پہلے تو اصل قوانین توضیحات کے پردوں میں چھپ کر رہ گئے اور بعد ازاں وہ مکمل طور پر حکومتوں کی نظروں سے اوجھل ہو گئے کیونکہ یہ ایک حقیقت ہے کہ قانون سازی کے الجھے ہوئے جالے میں تو کچھ اخذ کرنا ممکن نہیں۔ اور یہیں سے ثالثی فیصلوں کے نظریہ کی ابتدا ہوتی ہے۔

آپ یہ کہہ سکتے ہیں کہ اگر وقت آنے سے پیشتر غیر یہود کو ان سرگرمیوں کا اندازہ ہو جائے تو وہ مسلح ہو کر ہم پر پل پڑیں گے۔ لیکن مغربی ممالک میں تو ہم نے انتہائی حکمت عملی سے اس امکان کے خلاف دہشت گردی کا ایک ایسا منصوبہ بنا لیا ہے کہ مضبوط سے مضبوط دل رکھنے والے انسان بھی لرز اٹھیں۔ اس منصوبے کے تحت مقررہ وقت کی آمد سے پہلے ہی تمام دارالحکومتوں کے زیر زمین بڑے بڑے شہر تعمیر کیے جائیں گے اور سرنگوں کا جال بچھا دیا جائے گا جہاں سے ان دارالسلطنتوں کو ان کے تمام اداروں اور دفاتر سمیت بھک سے اڑا دیا جائے گا۔

جاسوسی کے اڈے

تمام ممالک میں فری میسن کا اجتماع گاہوں کا قیام عمل میں لائیں گے اور دن بدن ان کی تعداد میں اضافہ کرتے رہیں گے۔ ان میں ہر ملک کے تمام سرکردہ افراد کو ضم کر لیا جائے گا جو عوامی سرگرمیوں میں اہم کردار ادا کر سکتے ہیں یا مستقبل میں کر سکتے ہیں۔ دراصل یہی اجتماع گاہیں ہمارے سب سے بڑے جاسوسی کے اڈے اور اثر و رسوخ کا ذریعہ ہوں گی۔ جو ہمارے فاضل رہنماؤں پر مشتمل مرکزی انتظامیہ کی زیر قیادت کام کریں گی، جس کا علم صرف ہمیں ہی ہو گا۔ اس ضمن میں کسی اور کو قطعاً کوئی معلومات نہیں ہوگی۔ اجتماع گاہوں کے نمائندے میسنری کی متذکرہ انتظامیہ کے لئے آڑ کا کام دیں گے جو خفیہ الفاظ اور مختلف پروگرام مرتب کرنے کی ذمہ دار ہوگی۔ ان اجتماع گاہوں (لاجز) میں ہم ایک ایسی گرہ لگائیں گے جو معاشرے کے ہر طبقے سے لئے گئے تمام انقلابی اور حریت پسند عناصر کو یکجا کر دے گی۔

انتہائی خفیہ قسم کی تمام سازشیں ہمارے دائرہ علم میں ہوں گی بلکہ ہمارے رہنما ہاتھوں کی گرفت تو اسی روز ان پر مضبوط ہو جائے گی جس دن ان کا تصور ہی جنم لے گا۔

ان اجتماع گاہوں کے اراکین میں قومی اور بین الاقوامی پولیس کے تقریباً تمام نمائندے شامل ہوں گے۔ ان کی خدمات ہمارے لئے اس لحاظ سے ناگزیر ہیں کہ پولیس حکم عدولی کرنے والوں کو اپنے مخصوص اقدامات سے زچ کر سکتی ہے بلکہ ہماری سرگرمیوں کے لئے آڑ کا کام دے سکتی ہے اور انتشار اور بدامنی کی فضا پیدا کرنے کے لئے مواقع بھی تلاش کر لیتی ہے۔ بالعموم چالاکیوں سے روزی کمانے والے بے فکری، لاابالی طبیعت کے مالک اور بے دھڑک قسم کے افراد بخوشی خفیہ تنظیموں میں شامل ہو جاتی ہیں لہٰذا ہمیں اپنی اختراع کردہ میسنری کے نظام کو چلانے کے لئے ایسے لوگوں کو آلہ کار بنانے میں دقت پیش نہیں آئے گی۔ اگر دنیا کے کسی خطے میں شورشیں اور فسادات برپا ہوتے ہیں تو یہ سمجھ لینا چاہئے کہ ہم ہی نے اس کے استحکام کو تہ و بالا کرنے کے لئے ہوا دی ہے اور اگر کہیں کوئی سازش جنم لیتی ہے تو یہ بھی ہمارے معتمد خدمت گزاروں ہی کی کارروائیوں کا نتیجہ ہوگی۔

یہ امر تو قدرتی ہے کہ فری میسنری کی سرگرمیوں کی قیادت ہمیں اور صرف ہمیں کرنی ہے۔ کیونکہ یہ صرف ہمیں ہی علم ہے کہ ہم کس طرف رہنمائی کر رہے ہیں ہم ہر قسم کی سرگرمیوں کے منتہائے مقصود کو جانتے ہیں جب کہ غیر یہود ہر امر سے لاعلمی کے باعث کسی کارروائی کے فوری نتائج تک سے بھی آگاہ نہیں ہوتے۔ وہ اسی پر پھولے نہیں سماتے کہ ان کی رائے کامیابی سے ہمکنار ہو چکی ہے وہ یہ اعتراف کرنے کی کبھی زحمت بھی گوارہ نہیں کرتے کہ متعلقہ تصور ان کے ذہن کی پیداوار نہیں ہے بلکہ اس کے اصل محرک ہم ہیں۔ بالعموم غیر یہودی اپنے جذبہ تجسس کی تسکین یا عوامی شورشوں سے کچھ فائدہ حاصل کرنے کے لئے فری میسن کی اجتماع گاہوں کی رکنیت اختیار کر لیتے ہیں۔ بعض ایک عوام کے سامنے اپنے ناقابل عمل بے بنیاد اور خیالی منصوبوں کا اظہار کرنے کے شوق میں ان میں شامل ہو جاتے ہیں۔ وہ کامیابی اور تعریف و توصیف کے بھوکے ہوتے ہیں۔ ثنا خوانی کے معاملے میں ہم از حد فیاض واقع ہوئے ہیں۔ ہم انہیں کامیابیوں سے ہمکنار کر کے خود فریبی میں مبتلا

رکھتے ہیں۔ اس کے نتیجے میں وہ غیر شعوری طور پر ہمارے خیالات کو اپنا لیتے ہیں۔ اس سلسلے میں وہ کسی قسم کی احتیاط بھی بروئے کار نہیں لاتے بلکہ اس خوش فہمی میں مبتلا رہتے ہیں کہ وہ قطعی طور پر معصوم ہیں اور وہ محض اپنی ہی آراء کا اظہار کر رہے ہیں اور ان کے لئے کسی کے خیالات کو مستعار لینا ناممکن ہے۔

آپ تصور بھی نہیں کر سکتے کہ اس خود فریبی کی بدولت غیر یہودیوں کے ذہین ترین افراد کو بھی کس طرح الو بنایا جا سکتا ہے اور معمولی سی ناکامی سے دل برداشتہ کیا جا سکتا ہے۔ یہ ناکامی خواہ ان کے لئے ترک توصیف کی صورت میں ہی کیوں نہ رونما ہو؟ اس کامیاب کے دربار حوصل کے لئے وہ غلام بے دام بن جانے کو بھی تیار ہوں گے۔ ہمارا نصب العین کامیابی نہیں بلکہ منصوبوں کو عملی جامہ پہنانا ہوتا ہے لیکن غیر یہود ذاتی کامیابی کی خاطر اپنے تمام منصوبوں کی داؤں پر لگانے کو تیار ہو جاتے ہیں۔ ان کی اسی نفسیات کے باعث ہمارے لئے انہیں اپنی مرضی کے مطابق کسی مخصوص مقصد کے لئے اپنا آلہ کار بنانا آسان ہو جاتا ہے۔ ان ظاہری شیروں کے اندر نہ صرف بھیڑوں کی روح ہوتی ہے بلکہ وہ عقل و خرد سے بھی عاری ہوتے ہیں۔ ہم نے انہیں اس تصور کے چوبی گھوڑے پر سوار کر رکھا ہے کہ فرد کو جماعت میں بالکل ضم ہو جانا چاہئے۔ انہوں نے کبھی یہ نہیں سوچا اور نہ ہی وہ اس کی زحمت گوارہ کریں گے کہ یہ کاٹھ کا گھوڑا اس اہم ترین قانون فطرت کی خلاف ورزی ہے۔ جس کے تحت آفرینش عالم کی ابتدا ہی سے ہر فرد دوسرے سے مختلف ہے اور جس کا مقصد ہے انفرادیت کو برقرار رکھنا ہے۔

ہمارا انہیں حماقت و کم فہمی اور اندھا دھند تقلید و جہالت کے اس گھڑے تک لے آنا ہی اس امر کی واضح دلیل ہے کہ ہمارے مقابلے میں غیر یہودیوں کا ذہن کتنا پست ہے اور یہی ہماری کامیابی کی سب سے بڑی ضمانت ہے۔

زمانہ قدیم کے ہمارے فاضل رہنماؤں کی اس قول سے کس قدر دور اندیشی کا اظہار ہوتا ہے کہ کسی سنجیدہ مقصد کے حصول کے لئے کسی بھی قسم کے ذرائع کے استعمال سے دریغ نہیں کرنا چاہئے اور نہ ہی لوگوں کے جانی نقصان کی پرواہ کرنی چاہئے۔ غیر یہودی بہائم کی جتنی

یں بھی کام آئیں ہم انہیں شمار کرنے کی کبھی ضرورت محسوس نہیں کی۔ اگرچہ ہم نے بھی
ن سے افراد کی قربانی دی ہے لیکن ہم نے انہیں دنیا میں اس مرتبے پر پہنچا دیا ہے جس کو وہ
ہی تصور بھی نہیں کر سکتے تھے اس آویزش میں ہماری تعداد کے لحاظ سے ہمارا نقصان نسبتاً کم
ا ہے اور ہماری قوم بھی مکمل تباہی سے محفوظ و مامون ہو گئی ہے۔

(موت سے کسی کو مفر نہیں بالآخر ہر شخص کی زندگی کا انجام یہی ہے۔ اس لئے بہتر یہ ہے
ہماری نسبت یہ انجام ہماری سرگرمیوں کے راستے میں رکاوٹ بننے والوں سے قریب تر
ریا جائے کیونکہ ہم تو تمام سرگرمیوں کے سرچشمہ ہیں۔ ہم فری میسن کی سرگرمیوں کو اس
ح منظم کرتے ہیں کہ ہماری برادری کے سوا کسی کو ان کا شائبہ تک نہیں گذرتا۔ یہاں
ں کہ ہمارے ہاتھوں موت سے ہمکنار ہونے والوں کو بھی ہم پر شک نہیں ہوتا وہ ہمارے
لم پر اس طرح جان، جان آفریں کے سپرد کر دیتے ہیں جیسے کہ یہ طبعی موت ہو۔ ان حالات
ے آگاہ ہو جانے کے باوجود میسن برادری بھی احتجاج کی جرات نہیں کر سکتی۔ اس قسم کے
ائہ عمل سے ہم نے فری میسن تحریک میں سے ہمارے رجحانات و نظریات کے خلاف
تجاج کی جڑوں کو اکھاڑ پھینکا ہے۔ ہم غیر یہود اقوام کو حریت پسند اور روشن خیالی کا درس تو
یتے ہیں لیکن خود اپنے لوگوں اور دکانداروں سے غیر مشروط اطاعت کا تقاضا کرتے ہیں۔

ہمارے اثر و رسوخ کے باعث غیر یہود کے قوانین پر بہت کم عمل درآمد ہوتا ہے۔ کثیر
یرات کے باعث قانون کا وقار مجروح ہو کر رہ گیا ہے۔ عدالتی جج اہم ترین اور اساسی
سائل کے فیصلے بھی ہمارے حکم کے مطابق ہی کرتے ہیں۔ وہ غیر یہود کی انتظامیہ سے متعلق
م امور کو بھی اسی رنگ میں دیکھتے ہیں جس میں ہم انہیں پیش کرتے ہیں۔ ہم تمام ان
صوبوں کو اپنے آلہ کار عناصر کے ذریعے پایہ تکمیل تک پہنچاتے ہیں جن کے ساتھ بظاہر
اری کوئی قدر مشترک نہیں ہوتی، اس مقصد کے لئے ہم اخبارات کی آراء اور دیگر ذرائع
ے کام لیتے ہیں۔ ہمارے اثر و رسوخ کا اندازہ اس امر سے کر لیجئے کہ غیر یہود کے سینٹ کے
اکین اور انتظامیہ کے اعلیٰ ارکان بھی ہماری ہی تجاویز اور مشوروں کو قبول کرتے ہیں۔ غیر
ہودیوں کا خاصل بہائم صفت ذہن تجزیہ اور مشاہدہ کرنے کی صلاحیتوں سے عاری ہے اور

اس کے بے خبری کا تو یہ عالم ہے کہ کسی مسئلے کو ایک مخصوص طریقے سے حل کرنے کے نتیجہ میں مرتب ہونے والے اثرات کا اندازہ کرنا اس کے بس کا روگ ہی نہیں۔

ہمارے اور غیر یہود کے درمیان قوت فکر کے اسی امتیاز ہی میں ہمیں خدا کی برگزیدہ قوم ہونے اور ان کے بہائم صفت ذہن کے مقابلہ میں اعلیٰ ترین بشری کمالات و اوصاف کے حامل ہونے کا شرف حاصل ہے۔ ان کی آنکھیں کھلی ہیں لیکن وہ گرد و پیش کچھ دیکھنے سے عاری ہیں اسی لئے وہ کسی قسم کی ایجادات و اختراعات کرنے سے قاصر رہتے ہیں (بجز چند مادی اشیاء کے) اس سے عیاں ہے کہ قدرت نے خود ہمیں دنیا کی قیادت اور حکومت کے لئے مامور کیا ہے۔

جب ہماری حکومت علی الاعلان وجود میں آجائے گی اور اس کی برکات کے ظہور کا وقت آپہنچے گا تو ہم قوانین کی از سر نو تشکیل کریں گے۔ ہمارے قوانین مختصر، سادہ، مستحکم اور اتنے واضح ہوں گے کہ ان کی تشریح و تاویل کی قطعاً کوئی ضرورت نہیں پڑے گی۔ ہر شخص انہیں باسانی سمجھ لے گا۔ ان کی اہم ترین خصوصیت ان کے بے چون و چرا اطاعت و فرمانبرداری میں مضمر ہو گی اور اس اصول کو از حد اہمیت دی جائے گی۔ ہر برائی کا خاتمہ ہو جائے گا کیونکہ حکومت کے تمام ادارے یہاں تک نچلی سطح کے یونٹ بھی اقتدار کے نمائندے یعنی مملکت کے اعلیٰ حکمران کے سامنے جواب دہ ہوں گے۔ اختیارات کے غلط استعمال کرنے والوں کو ایسی کڑی اور بے رحمانہ سزائیں دی جائیں گی کہ کوئی شخص بھی اپنے اختیارات کے غلط استعمال کے تجربہ کی ہمت نہیں کرے گا۔ ہم انتظامیہ کے ہر کام کی کڑی نگرانی کریں گے جس پر کسی مملکت کا میشنری کی کی عمدہ کارکردگی کا انحصار ہوتا ہے کیونکہ اس دائرے میں سست روی ہر میدان میں کاہلی اور آرام طلبی کا باعث بنتی ہے لاقانونیت اور اختیارات کے غلط استعمال کے ہر وقوعہ پر ہم عبرت ناک سزائیں دیں گے۔

جرم کے اخفا یا انتظامیہ کے اہل کاروں کی آپس میں ملی بھگت اور اس قبیل کی دوسری تمام برائیاں عبرت ناک سزاؤں کی ابتدائی چند مثالوں کے بعد بالکل ختم ہو جائیں گی۔ ہماری قوت و اقتدار کے ہالے کا تقاضا ہے کہ اس کے اعلیٰ وقار کو بحال رکھنے کے لئے معمولی سے

معمولی جرم کی مناسب یعنی ظالمانہ سزا دی جائے۔ سزا جھیلنے والا خواہ اس کی سزا اس کے جرم سے کہیں زیادہ ہو ایک ایسا سپاہی ہو گا جو حکومت اس کے قواعد و ضوابط اور قانون کی بالادستی کے مفاد میں انتظامیہ کے میدان کارزار میں مارا گیا ہو۔ کیونکہ حکومت کے قوانین کے تحت اس امر کی اجازت نہیں مل سکتی عنان اقتدار کے مالک عوامی شاہراہ سے ہٹ کر اپنی ذاتی پگڈنڈیوں پر چل نکلیں۔ مثال کے طور پر ہمارے عدالتی ججوں کو یہ معلوم ہو گا کہ اگر کبھی انہوں نے احمقانہ طور پر رحمدلی کی راہ اختیار کی تو وہ عدل و انصاف کا قانون توڑنے کے مرتکب ہوں گے۔ جس کا مقصد ججوں کی روحانی خوبیوں کے مظاہرہ کی بجائے لوگوں کی فرو گذاشتوں اور لغزشوں کی سزا دے کر ان کے اخلاق کی مثالی طور پر اصلاح کرنا ہے۔ ایسی خصوصیات کا مظاہرہ نجی زندگی میں کرنا مناسب ہے نہ کہ کسی ایسے عوامی مقام پر جو انسانی زندگی میں تعلیمی اساس کی حیثیت رکھتا ہو۔

ہمارے عدالتی عملے کا عرصہ ملازمت پچپن سال تک کی عمر سے زائد نہیں ہو گا۔ اس کی دو وجوہ ہیں۔ اول یہ کہ معمر افراد اپنی متعصبانہ آراء پر قائم رہتے ہیں اور نئے خیالات کو باآسانی قبول نہیں کرتے۔ دوم اس اقدام سے عملے میں تبدیلی لانے میں سہولت رہے گی۔ لوگ ہمارے دباؤ تلے جھکنے پر مجبور ہوں گے۔ جو شخص اپنی ملازمت کو برقرار رکھنے کا خواہاں ہو گا، اسے غیر مشروط طور پر ہماری اطاعت کرنا ہو گی۔ ہم اپنے عدالتی ججوں کا انتخاب بالعموم ایسے افراد میں سے کریں گے جو یہ امر بخوبی سمجھتے ہوں کہ ان کا فرض قانون کو نافذ کرنا اور سزا دینا ہے نہ کہ مملکت کی تعلیمی سکیم کو خطرے میں ڈال کر حریت پسندی کے مظاہروں کے خواب دیکھنا جیسا کہ آج کل غیر یہودیوں کے اپنا وطیرہ بنا رکھا ہے۔ عملے کو اول بدل کرنے کے طریق کار سے ایک ہی قسم کی ملازمت کے افراد کے درمیان اجتماع اتحاد کا شعور پیدا نہیں ہو سکے گا۔ اور وہ سب کے سب صرف حکومت کے وفادار رہیں گے جن پر ان کی قسمت کا دارو مدار ہو گا ججوں کی نوجوان نسل کو اختیارات کے غلط استعمال سے روکنے کے لئے خاص نظریات کی تربیت دی جائے گی۔ اس طریق کار سے ہماری رعایا مسلمہ باہمی نظم و ضبط متاثر ہونے سے محفوظ رہے گا۔

آج کل غیر یہودیوں کو جج اپنے عہدے کی اہمیت کا شعور ہی نہیں رکھتے بلکہ اپنی اس لا علمی کے باعث ہر قسم کے جرائم کی حوصلہ افزائی کرتے ہیں۔ کیونکہ موجودہ دور کے حکمران ججوں کا تقرر کرتے وقت ان میں احساس فرض اور وہ شعور بیدار نہیں کرتے جو ان کے منصب کے متقاضی ہے۔ جس طرح ایک درندہ اپنے بچوں کو شکار کی تلاش میں کھلا چھوڑ دیتا ہے، اسی طرح غیر یہودی اپنی رعایا کو منفعت بخش اسامیوں سے نواز دیتے ہیں لیکن ان پر یہ واضح کرنے کی زحمت گوارہ نہیں کرتے کہ متعلقہ اسامی کس مقصد کے پیش نظر وجود میں لائی گئی تھی۔ یہی وجہ ہے کہ ان کی حکومتیں انتظامیہ کی غلط کاریوں کے باعث اپنی ہی اندرونی قوتوں کے ہاتھوں تباہی و بربادی سے ہمکنار ہو جاتی ہے۔

آیئے! ہم ان غلط کاریوں کے نتائج سے اپنی حکومت کے لئے ایک اور سبق اخذ کریں۔ ہم اپنی حکومت ان کی تمام اسامیوں سے حریت پسندوں کا قلع قمع کر دیں گے جن پر ہمارے ریاستی ڈھانچے کو چلانے کے لئے ماتحت عملے کی تربیت کا انحصار ہے۔ ایسی اسامیوں پر صرف ان لوگوں کا تقرر عمل میں آئے گا جن کو ہم نے انتظامی امور سے متعلق خاص تربیت دی ہو گی۔ ممکن ہے آپ یہ اعتراض اٹھائیں کہ پرانے ملازموں کو ریٹائر کرنے سے خزانے پر بھاری بوجھ پڑے گا۔ میری طرف سے اس کا جواب یہ ہے کہ اول تو اس طرح ریٹائر ہونے والوں کو نجی شعبے میں ملازمتیں مہیا کی جائیں گی۔ دوم دنیا بھر کی تمام دولت ہمارے ہاتھوں میں مرکوز ہو گی لہٰذا ہماری حکومت کو اخراجات سے گھبرانے کی قطعاً کوئی ضرورت نہیں۔

تمام امور سے متعلق ہمارے فیصلے حتمی اور منطقی ہوں گے جو نتائج کو پیش نظر رکھ کر کئے جائیں گے اسی لئے تمام احکامات میں ہماری اعلیٰ مشیت کا احترام کیا جائے گا اور ان کی تعمیل غیر مشروط طور پر کی جائے گی۔ نیز ہر قسم کی بڑبڑاہٹ اور بے چینی کو نظر انداز کر دیا جائے گا اور کسی گوشے سے اس کا عملاً اظہار کیا گیا تو عبرتناک سزاؤں کے ذریعے ان کا خاتمہ کر دیا جائے گا۔

فرماں روائی کے فرائض سرانجام دینے کے باعث تنسیخ قوانین کا حق بھی قطعی طور پر ہمارے پاس منتقل ہو جائے گا اور عدالتیں اس حق سے محروم کر دی جائیں گی۔ ہم عوام میں

اس قسم کے تصور کو قطعاً جنم نہیں لینے دیں گے کہ ہمارے مقرر کردہ جج بھی اپنے طور پر کوئی فیصلہ کر سکتے ہیں۔ لیکن اگر کبھی اس قسم کے حالات رو پذیر ہوئے تو ہم خود ایسے فیصلے کو منسوخ کر دیں گے اور متعلقہ جج کو اس کی فرض شناسی اور منصب کے اغراض و مقاصد کی نافہمی پر ایسی کڑی سزا دیں گے جو دوسروں کے لئے باعث عبرت ہو اور اس قسم کی غلطیوں کا اعادہ نہ ہونے پائے۔ میں ایک بار پھر آپ کو یہ امر یاد دلاتا ہوں کہ ہمیں انتظامیہ کے تمام اقدامات سے باخبر رہنا چاہئے اور عوام کو مطمئن کرنے کے لئے اس کی کڑی نگرانی کرنی چاہئے کیونکہ انہیں اچھی قسم کی حکومت سے قابل اور ہوشیار افسروں کی تعیناتی کا مطالبہ کرنے کا حق حاصل ہے۔

ہماری حکومت میں فرمانروا کی حیثیت ایک بزرگ اور سرپرست کی سی ہو گی۔ ہماری اپنی قوم اور رعایا حکمران کی شخصیت میں ایک ایسے باپ کو دیکھے گی جو ان کی ہر ضرورت کا خیال رکھے اور ان کے ہر کام کی نگرانی کرے۔ علاوہ ازیں رعایا کے باہمی تعلقات نیز رعایا اور حکمران کے درمیان باہم تعلقات سے بھی خبردار رہے۔ اس طرح یہ تصور عوام کے قلوب و اذہان میں گھر کر جائے گا کہ اگر وہ امن و سکون کی زندگی گذارنا چاہتے ہیں تو ان کے لئے ہمارے حکمران کی سرپرستی اور قیادت ناگزیر ہے۔ وہ اس کی مطلق العنانیت کو تسلیم کرتے ہوئے اس کی ایک دیوتا کی مانند پرستش کریں گے بالخصوص جب انہیں یہ بھی یقین ہو گا کہ ہمارے متعین کردہ افسر کسی معاملے میں اپنی مرضی استعمال نہیں کر سکتے بلکہ حکمران کے احکامات کی اندھا دھند تعمیل کرتے ہیں۔ وہ اس امر پر خوش ہوں گے کہ ہم نے ان کی زندگیوں میں اس طرح باقاعدگی پیدا کر دی ہے جس طرح کہ عقل مند والدین اپنے بچوں کو فرائض منصبی کی ادائیگی اور اطاعت گذاری کا عادی بنانے کے لئے کرتے ہیں۔ جہاں تک ہماری ریاست کے بھیدوں کا تعلق ہے، زمانہ دراز گذرنے کے باوجود دنیا کی اقوام کی حیثیت ان سے متعلق محض نابالغ بچوں کی سی ہے اور بالکل یہی کیفیت ان کی حکومتوں کی بھی ہے۔

جیسا کہ آپ پر عیاں ہے کہ میں اپنی مطلق العنانیت کو حقوق اور فرائض کی اساس پر استوار کیا ہے۔ فرائض کی صحیح بجا آوری کے لئے مجبور کرنا حکومت کی براہ راست ذمہ داری

ہے جس کی حیثیت رعایا کے لئے باپ کی سی ہے۔ یہ طاقت ور کا حق ہے کہ وہ انسانیت کے مفاد کے پیش نظر، اس کی ایسے عوام کی طرف رہنمائی کرے جسے قدرت نے طاعت کا نام دیا ہے۔ دنیا کی ہر شے حالت اطاعت میں ہے اگر یہ اطاعت کسی انسانی ہستی کی نہ ہو تو حالات کی ہوتی ہے یا خود اس کے اچھے خصائل کو یعنی ہر اس چیز کی جو اس سے زیادہ طاقتور ہو۔ لہٰذا عوام کی فلاح و بہبود کے پیش نظر ہماری حیثیت بھی زیادہ قوی اور طاقتور کی سی ہو گی۔

ہم مسلمہ قوانین کی خلاف ورزی پر افراد کو قربان کرنے سے ہر گز دریغ نہیں کریں گے۔ کیونکہ برائی کے بدلے میں کڑی سزائیں ہی سبق آموز ثابت ہوتی ہیں۔ جب اسرائیل کا بادشاہ، یورپ کا پیش کردہ تاج اپنے مقدس سر پر رکھے گا تو وہ دنیا کا قابل احترام باپ بن جائے گا۔ اسے جن لوگوں کو مصلحتاً ظلم و جور کا نشانہ بنانا پڑے گا۔ ان کی تعداد بہرحال ان کی نسبت کم ہو گی جو صدیوں کے دوران غیر یہودی حکومتوں کے جذبہ مسابقت اور شان و شوکت کے اظہار کے جنوں کے نتیجہ میں شکار ہونے والوں کی تھی۔ ہمارا بادشاہ اقوام عالم سے مسلسل اپنا رابطہ قائم رکھے گا۔ وہ اپنے تخت شاہی سے جو تقاریر کرے گا وہ اسی لمحہ دنیا بھر میں زبان زد عام ہو جائیں گی۔

صیہونی تعلیمی نظام

اپنی طاقت کے سوا تمام اجتماعی قوتوں کا خاتمہ کرنے کے لئے ہم اجتماعیت کے اولین مرحلے یعنی یونیورسٹیوں کی از سر نو تنظیم کے ذریعے انہیں کمزور اور بے بس بنا دیں گے۔ ان میں تعینات پروفیسروں اور افسروں کو ایک تفصیلی خفیہ پروگرام کے ذریعے ان کے فرائض منصبی کے لئے تیار کیا جائے گا۔ ادائیگی فرائض کے دوران وہ اپنی مرضی سے ذرہ بھر بھی ادھر ادھر نہیں ہٹ سکیں گے۔ ان کے تقرر میں خصوصی احتیاط سے کام لیا جائے گا اور انہیں اس انداز سے متعین کیا جائے گا کہ وہ مکمل طور پر حکومت کے رحم و کرم پر رہیں۔

ریاستی قوانین اور تمام سیاسی امور کو نصاب تعلیم سے خارج کر دیا جائے گا۔ یہ مضامین چند درجن باصلاحیت متبدیوں کو پڑھائے جائیں گے۔ یونیورسٹیوں کے وسیع و عریض کمروں سے ایسے بودے اور نکمے افراد نہیں نکلنے دیئے جائیں گے جو کسی المیہ یا طربیہ کی طرح آئین

سے متعلق ہی تجاویز کا تانا بانا بنتے رہیں اور ایسی پالیسیاں وضع کرنے میں مصروف رہیں جن سے ان کے آباؤ اجداد کو کبھی سروکار نہ رہا ہو۔ بلکہ وہ ان سے متعلق کسی قسم کا تصور بھی ذہن میں لانے سے قاصر رہے ہوں۔ ہر کس و ناکس کو سیاسی امور سے متعلق بیجا قسم کی تعلیم دینے کا نتیجہ، تصوراتی فلاحی ریاست کے خواب دیکھنے والوں اور گھٹیا قسم کے رعایا کے وجود کی صورت میں ظاہر ہوتا ہے۔ جیسا کہ آپ خود بھی اس ضمن میں غیر یہود کی تعلیم عامہ کی پالیسی کے نتائج سے اندازہ کر سکتے ہیں۔ ہمیں غیر یہود کے نظام تعلیم میں تو ان تمام اصولوں کو بڑھ چڑھ کر رواج دیتے رہنا چاہئے جو انتہائی کامیابی سے ان کے نظم و نسق کو تہ و بالا کرنے کا موجب بنے ہوئے ہیں۔ لیکن زمام اقتدار ہمارے ہاتھوں میں آنے پر، نصاب تعلیم سے ہر ایسے مضمون کو خارج کر دیا جائے گا۔ جو کسی قسم کی بے چینی و اضطراب کا موجب بن سکے۔

ہم تمام نوجوانوں کو اپنی حکومت کے ایسے طاعت شعار اور فرماں بردا قسم کے پیرو بنا دیں گے۔ جو ہمارے حکمران کو اپنا محسن، ہمدرد، محافظ نیز امن و سکون کی امیدوں کا واحد مرکز سمجھ کر اپنی محبت و طاعت کا محور بنا لیں۔

آپ اس امر سے آگاہ ہیں کہ کلاسیکی ادب اور ازمنہ قدیم کی تاریخ قابل اعتماد اور معقول حقائق کی نسبت بے کار اور گھٹیا قسم کی مثالوں سے پر ہے۔ لہٰذا ان مضامین کا مطالعہ قطعی طور پر ختم کر دیا جائے گا۔ ان کی جگہ ہم مستقبل کے پروگرام کے مطالعہ کو نصاب میں شامل کریں گے۔ ہم لوگوں کے ذہنوں سے گذشتہ صدیوں کے وہ تمام نقوش جو ہمارے لئے ناپسندیدہ اور غیر مفید ہیں، مٹا ڈالیں گے اور صرف انہیں حقائق کی یاد تازہ رہنے دیں گے جو غیر یہودی حکومتوں کی غلطیوں اور نقائص کو نمایاں کر رہے ہوں۔ عملی زندگی، نظم و نسق کی ذمہ داریاں، لوگوں کے باہمی تعلقات اور اس طرح کے تعلیمی نوعیت کے مسائل کے مطالعہ کو ہمارے تعلیمی پروگرام میں سب سے زیادہ اہم حیثیت حاصل ہو گی۔ لیکن اس میں ان حقائق کے لئے کوئی جگہ نہیں ہو گی جو غیر اخلاقی حرکات اور خود غرضی و نفس پروری سے متعلق مثالوں کو پیش کریں۔ یہ پروگرام زندگی کے ہر منصب اور ہر پیشے کے لئے علیحدہ علیحدہ ہو گا اور کسی صورت بھی رعایا کے سب افراد کو یکساں نوعیت کی تعلیم دی جائے گی۔ تعلیمی کا

یہ پہلو انتہائی اہمیت حامل ہے۔

زندگی کے ہر پیشے اور منصب سے متعلق تعلیم قطعی طور پر محدود خطوط پر ہونی چاہئے۔ ہر شخص کو وہی تعلیم ملنی چاہئے جو اس کے منصب اور نصب العین سے مطابقت رکھتی ہو۔ ذہین و فطین قسم کے افراد ہمیشہ زندگی کے دوسرے پہلوؤں پر بھی حاوی ہوتے رہے ہیں اور ہوتے رہیں گے۔ لیکن یہ زبردست حماقت ہے کہ اس قسم کے خال خال عبقری افراد کی خاطر نااہل لوگوں کو ایسے مراتب و مناصب پر قبضہ جمانے کا موقع دیا جائے جو ان سے غیر متعلقہ ہوں اور جن کے لئے پیدائشی طور پر اہل افراد موجود ہوں۔ آپ کو خوب معلوم ہے کہ غیر یہود کو اس کھلی حماقت کے کیا نتائج بھگتنے پڑے ہیں۔

کسی حکمران کو لوگوں کے اذہان و قلوب میں قطعی اور مستقل مقام دلانے کے لئے یہ لازمی ہے کہ اس کے دور حکومت میں درس گاہوں، بازاروں، گلی کوچوں غرض کہ ہر جگہ تمام قوم کو اس کی سرگرمیوں کے اغراض و مقاصد، اس کے کارناموں اور اس کے فلاحی اقدامات کا بتکرار درس دیا جائے۔

ہم تعلیم و تدریس کے شعبے میں ہر قسم کی آزادی کا خاتمہ کردیں گے۔ ہر عمر کے طالب علموں اور ان کے والدین کو اداروں میں اجتماع کا حق حاصل ہوگا۔ اسی طرح جیسے کہ وہ کسی کلب میں یکجا ہوتے ہیں۔ تعطیل عامہ کے روز ان اجتماعات سے اساتذہ مختلف موضوعات مثلاً انسانی تعلقات، قوانین امثلہ، غیر شعوری تعلقات سے جنم لینے والی حدود اور نئے نظریات کا فلسفہ جو ابھی دنیا کے سامنے پیش نہیں کیا گیا، پر تقاریر کریں گے۔ ان نظریات کو ہم مذہبی عقیدے کے مقام پر لے آئیں گے۔ لیکن یہ مرحلہ ہمارے مذہب کی جانب ایک عبوری دور ہوگا۔ زمانہ حال اور زمانہ مستقبل سے متعلق اپنے لائحہ عمل کو مکمل طور پر بیان کرنے کے بعد اب میں آپ کو ان نظریات کے بنیادی اصولوں سے آگاہ کرتا ہوں۔

صدیوں کے تجربات سے یہ امر پایہ ثبوت کو پہنچ چکا ہے کہ لوگ اپنی زندگی میں مخصوص نظریات ہی سے رہنمائی حاصل کرتے ہیں اور انہیں کے مطابق زندگی گذارتے ہیں۔ وہ ان نظریات کو تعلیم ہی کے ذریعہ اپناتے ہیں جو یکساں کامیابی سے ہر عمر کے افراد کو

مختلف طریقوں سے مہیا کی جاتی ہے۔ لیکن ہم اپنے مفادات کے پیش نظر فکر و خیال کی ہر آزادی کو ختم کردیں گے جس کا رخ ہم مدت مدید سے ان موضوعات اور تصورات کی طرف موڑتے رہے ہیں جو ہمارے مقاصد کے لئے مفید تھے۔ فکر و تصور کو مقید کرنے کا عمل تو پہلے ہی نام نہاد مشاہداتی طریقہ تعلیم کی صورت میں جاری ہے جس کا مقصد غیر یہود کو قوت فکر سے عاری اطاعت شعار حیوان بنانا ہے جو اس امر کے منتظر رہیں کہ کسی چیز کا تصور قائم کرنے کے لئے اسے ان کے سامنے لایا جائے۔ فرانس میں ہمارے بہترین ایجنٹوں میں سے ایک یعنی طبقہ بورژوا نے تو پہلے ہی مشاہدہ کے ذریعے تدریسی اسباق اور طریقہ تعلیم کے ایک نئے پروگرام کو عوام کے سامنے پیش کردیا ہے۔

وکالت کا پیشہ انسان کو سرد مہر، ظالم، ضدی، ہٹ دھرم اور بے اصول بنا دیتا ہے۔ یہ پیش تمام امور کو غیر جذباتی اور قانونی نقطہ نور سے پرکھتا ہے۔ یہ عادت وکلاء میں بہت راسخ ہوتی ہے کہ وہ ہر معاملے کو صرف اپنے موکل کے موقف و نکتہ نظر سے دیکھتے ہیں اور اس کے نتائج میں وجود پذیر ہونے والے عوام کو جو فلاح عامہ کو بھی متاثر کرسکتے ہیں، نظرانداز کر دیتے ہیں۔ بالعموم وہ کسی قسم کی بھی عذر داری کو لینے سے انکار نہیں کرتے اور اپنے موکلوں کی بریت کے لئے بھرپور کوشش کرتے ہیں۔ اس مقصد کے حصول کے لئے وہ قانون کے معمولی معمولی نکتوں میں مین میخ نکالتے ہیں اور اس طرح عدل و انصاف سے بددلی پھیلانے کا موجب بنتے ہیں۔

اسی وجہ سے ہم اپنے پیشے کی حدود متعین کردیں گے اور اسے سرکاری انتظامیہ کے دائرے میں لے آئیں گے۔ نیز وکیلوں اور ججوں کو مقدمے کے فریقین سے براہ راست رابطہ قائم کرنے کے حق سے بھی محرروم کردیا جائے گا۔ اول الذکر حضرت کو مقدمات عدالت کی طرف سے تفویض کئے جائیں گے اور وہ ان کا مطالعہ سرکاری رپورٹ اور متعلقہ دستاویزات کی روشنی میں کریں گے۔ انہیں اپنے موکلوں کے دفاع کی اجازت اس وقت ملے گی جبکہ متعلقہ حقائق و واقعات کے بارے میں موخر الذکر سے پوچھ گچھ کی جا چکی ہوگی۔ انہیں کام کی نوعیت کو ملحوظ رکھے بغیر حکومت کی طرف سے اعزازی فیس دی جائے گی۔

اس طرح عدل و انصاف کے مفاد میں قانونی امور سے متعلق ان کی حیثیت محض رپورٹروں کی سی ہو جائے گی۔ وہ وکیل استغاثہ، جس کی حیثیت خود ایک رپورٹر کی سی ہو گی، کے خلاف توازن کا کام دیں گے۔ اس طرح سے عدالتوں پر کام کا بوجھ بھی ہلکا ہو جائے گا اور غیر متعصبانہ صفائی اور دفاع کی ایک ایسی روایت قائم ہو جائے گی۔ اس ضمن میں مزید یہ فائدہ ہو گا کہ سودے بازی کی موجودہ قبیح رسم کا بھی خاتمہ ہو جائے گا۔ جس کے تحت زیادہ سے زیادہ رقم بطور فیس ادا کرنے والے فریق ہی کو جتایا جاتا ہے۔

عالمی استحصال یہودی نصب العین

ہم عرصہ دراز سے غیر یہود کے مذہبی رہنماؤں کا وقار ختم کر کے کرہ ارض پر ان کے مذہبی مشن کو تباہ و برباد کرنے میں مصروف عمل ہیں جو آج بھی ہمارے راستے میں ایک بہت بڑی رکاوٹ ہے۔ دنیا کی سب اقوام میں ان کا اثر و رسوخ دن بدن کم ہوتا جا رہا ہے۔ دنیا کے کونے کونے میں آزادی ضمیر کا نعرہ بلند کر دیا گیا ہے۔ جہاں تک دوسرے مذاہب کا تعلق ہے ان کا قلع قمع کرنے میں ہمیں نسبتاً کم دقتوں کا سامنا کرنا پڑے گا۔ لیکن اس سلسلے میں کچھ کہنا ابھی قبل از وقت ہو گا۔ البتہ ہم پادریوں اور پاپائیت کو اتنی تنگ ناؤں میں مقید کر دیں گے کہ ان کا اثر و رسوخ اپنے گزشتہ عروج و کمال کی نسبت کہیں زیادہ تیزی سے زوال پذیر ہو گا۔

جب یورپ کی عدالت کو ہمیشہ کے لئے صفحہ ہستی سے مٹانے کا وقت آئے گا تو ایک غیر مرئی ہاتھ کی ایک انگشت تمام قوموں کو اس عدالت کی طرف اشارہ کرے گی۔ لوگ اس پر ٹوٹ پڑیں گے تو ہم اس کے محافظ کے روپ میں آگے بڑھیں گے۔

بظاہر ہمارا مقصد بے حد و حساب خون خرابی کو روکنا ہو گا لیکن یہ بھی حریف کو مغالطہ میں رکھنے ہی کی ایک چال ہو گی۔ اس چال کے تحت ہم اس کی آنتوں میں گھس جائیں گے۔ اور یاد رکھئے اس وقت تک باہر نہیں آئیں گے۔ جب تک کہ نوچ نوچ کر اس کے تمام قوت کو ختم نہ کر دیں گے۔

اہل یہود کا بادشاہ ہی تمام دنیا کا حقیقی پوپ ہو گا۔ ایک بین الاقوامی چرچ کا مقدس باپ۔

لیکن اس دوران جب کہ ہم نوجوان نسل کو روایات پر مبنی نئے مذاہب کی دوبارہ تعلیم دے رہے ہیں اور بعد ازاں اپنے مذہب سے بھی روشناس کرائیں گے، ہم کھلم کھلا موجودہ چرچوں پر انگشت نمائی نہیں کریں گے بلکہ ان کے خلاف اس قسم کی تنقید کریں گے جس کا نصب العین اختلاف و انتشار کی فضا پیدا کرنا ہو۔

ہمارا ہم عصر پریس بالعموم غیر یہود کی نالائقیوں اور نااہلیوں کے علاوہ ان کے مذاہب اور امور مملکت کو بھی ہدف تنقید بناتا رہے گا۔ کسی قسم کے اخلاقی قواعد و ضوابط کو ملحوظ رکھے بغیر ان کے خلاف ایسا انداز بیان اختیار کیا جائے گا کہ ان کی عزت و وقار خاک میں مل کر رہ جائے اور اس منصوبے کو خداداد صلاحیتوں کے مالک صرف ہمارے قبیلے کے ذہین افراد ہی عملی جامہ پہنا سکتے ہیں۔ ہماری سلطنت سینکڑوں ہاتھوں کی حامل ہونے کے باعث وشنو دیوتا کی متماثل ہو گی۔ لیکن اس کی عظمت و قوت کے سامنے وشنو دیوتا کی الوہیت بھی ہیچ ہو گی۔ کیونکہ اس کا ہر ہاتھ معاشرتی و سماجی زندگی کے سرچشموں پر قابض ہو گا۔

ہم سرکاری پولیس کی مدد کے بغیر ہر چیز کو دیکھ سکیں گے جس کے اختیارات کو ہم ہی نے غیر یہودیوں کے خلاف استعمال کرنے کے لئے وسعت دی ہے اور اب وہ اپنی حکومتوں کی راہ میں اس طرح حائل ہو جاتی ہے کہ وہ اصل حقائق تک پہنچنے سے قاصر رہتی ہیں۔ ہمارے پروگرام کے مطابق ہماری رعایا کا ایک تہائی حصہ احساس فرض اور ریاست کی رضاکارانہ خدمت کی بنیادوں پر بقیہ دو تہائی کی کڑی نگرانی کرے گا۔ ہمارے ہاں ایک جاسوس یا مخبر ہونا باعث ذلت نہیں ہو گا بلکہ اس پر فخر کیا جائے گا۔ تاہم بے بنیاد الزامات لگانے پر کڑی سزائیں دی جائیں گی تاکہ اس حق کا استعمال غلط نہ ہو۔

ہمارے کارندوں کا تعلق معاشرے کے اعلیٰ طبقے سے بھی ہو گا اور نچلے سے بھی۔ ان میں انتظامیہ میں عیش و عشرت کے دلدادہ افسر، ایڈیٹر، پرنٹرز، پبلشرز، کتب فروش، کلرک، سیلز مین، مزدور، گاڑی بان اور اردلی وغیرہ ہوں گے۔ ہر قسم کے اختیارات سے محروم اس جماعت کو از خود کسی قسم کی بھی کاروائی کرنے کا حق حاصل نہیں ہو گا۔ دراصل یہ ایک قسم کی بے اختیار و اقتدار پولیس ہو گی جو صرف دیکھے گی کہ رپورٹ کر دے گی۔ ان کی مہیا کردہ اطلاعات

کی چھان بین اور گرفتاریوں کا انحصار امور پولیس کو کنٹرول کرنے والے ایک ذمہ دار گروپ پر ہو گا۔ جبکہ گرفتاری کا اعمل عمل مسلح پولیس اور شہری پولیس کے ہاتھوں پایہ تکمیل کو پہنچے گا۔

جو لوگ عوام کے بارے میں خود دیکھی ہوئی یا سنی ہوئی باتوں کی اطلاع نہیں دیں گے ان پر حقائق کو مخفی رکھنے کا الزام لگایا جائے گا اور جرم کے ثابت ہونے پر انہیں سزا دی جائے گی۔

جس طرح آج کل ہمارے بھائیوں پر یہ فرض عائد ہے کہ وہ خود خطرہ مول لے کر اپنے خاندان کے بھی مرتد افراد اور حکومت کے خلاف سرگرمیوں میں ملوث لوگوں کی اطلاع مقامی حکومت کو پہنچائیں اسی طرح ساری دنیا پر ہمارے تسلط کے دوران ہماری رعایا پر یہ فرض عائد ہو گا کہ وہ اس سلسلے میں ریاست کی طرف سے عائد شدہ فرائض کو سرانجام دیں۔

اس قسم کی تنظیم قوت و اقتدار کے غلط استعمال، رشوت ستانی اور ان تمام برائیوں کا، جو ہمارے مشوروں اور ہمارے فوق الانسانی حقوق کے نظریات کی بدولت غیر یہود کی روزانہ زندگی میں جم لے چکی ہیں کا قلعہ قمع کر کے رکھ دے گی۔ لیکن موجودہ حکومتوں کے نظم و نسق کے دوران ہم اور کون سی تدابیر اختیار کر سکتے ہیں جو افراتفری اور بدانتظامی کے رجحانات میں اضافے کا باعث بنیں۔ مجوزہ طریقوں میں سے اہم ترین تو یہ ہے کہ ہمارے ایجنٹ امن و سکون کی بحالی کے لئے اس طرح تعینات ہوں کہ انہیں انتشار و افتراق پھیلانے کی کاروائیوں کے دوران ضد، ہٹ دھرمی اختیارات کے ناجائز استعمال اور سب سے اولین اور اہم ضمیر فروشی اور قبیح قسم کے میلانات و رجحانات کے اظہار و فروغ کا موقع ملتا رہے۔

مکاری ہمارا بہترین ہتھیار!

سٹیٹ کونسل، نظم عامہ کے ارباب اختیار کا موثر ترین اظہار رہی ہے۔ ہماری حکمرانی کے دوران یہ قانون ساز کور (مقننہ) کا جسے حکومت کے قوانین اور فیصلوں کے ادارتی کمیٹی کہا جا سکتا ہے، محض ایک نمائشی جزو ہو گی۔ لہٰذا نئے آئین کے پروگرام کے تحت حق و

انصاف کی حدود کا تعین اور قانون سازی کے عمل کے لئے درج ذیل طریق اختیار کیا جائے گا۔

1- قانون ساز کور (مقننہ) کو پیش کردہ تجاویز کی حیثیت قانون کے مترادف ہو گی۔

2- عام قواعد و ضوابط کے نام پر صدر کے احکامات اور سینٹ کے احکامات کو قانون کا درجہ حاصل ہو گا۔ اسی طرح وفاقی کونسل کی قرار دادوں کو وزارتی احکامات کے روپ میں جاری کیا جائے گا اور ان کی حیثیت بھی قانون ہی کی ہو گی۔

3- موقع ملتے ہی ریاست میں انقلاب برپا کر کے نئے قوانین کو رائج کیا جائے گا۔

عام طریق کار کو متعین کرنے کے بعد ہم ان اجتماعی سرگرمیوں کی تفصیلات طے کرنے میں مصروف ہو جائیں گے۔ جن کے ذریعے ہمیں اپنی متعینہ راہ کے مطابق ریاست کی مشینری میں انقلاب کو پایہ تکمیل تک پہنچانا ہو گا۔ میرا مطلب یہ ہے کہ ان سرگرمیوں کے نتیجہ میں پریس کی آزادی، انجمن سازی کا حق، ضمیر کی آزادی، ووٹ کے استعمال کا حق اور اسی نوعیت کے بہت سے حقوق کے تصور کو انسانی ذہن سے حرف غلط کی طرح مٹ جانا چاہئے یا ان میں نئے آئین کے نفاذ کے ساتھ ہی فوری طور پر ایک زبردست تبدیلی آنی چاہئے۔ کیونکہ صرف یہی وہ لمحہ ہو گا جب ہم فی الفور اپنے تمام احکامات کا اعلان کرنے کے قابل ہوں گے بعد میں کوئی بھی تبدیلی بوجوہ ذیل خطرناک ہو گی۔

اگر یہ تبدیلی جبر و تشدد کے ذریعہ عمل میں لائی گئی۔ بالخصوص اگر اس کے پیش نظر مقصد لوگوں پر پابندیاں عائد کرنا اور اقوام کا مظاہرہ ہوا تو اس سے مایوسی اور خوف اور وہراس کے جذبات پیدا ہوں گے۔ اور اگر کسی تبدیلی کا مقصد لوگوں کو مزید سہولتیں بہم پہنچانا ہوا تو یہ کہا جائے گا کہ ہم نے انقلاب برپا کرنے کی غلطی کو تسلیم کر لیا ہے۔ اس سے ہمارا وقار مجروح ہو گا اور ہماری حکومت کی خطاؤں اور لغزشوں سے معصوم مسلمہ حیثیت، تباہ ہو کر رہ جائے گی۔ علاوہ ازیں لوگوں پر یہ تاثر بھی مرتب ہو سکتا ہے کہ ہم نے آنے والے خطرات کو محسوس کر لیا ہے اور گھٹنے ٹیکنے پر مجبور ہو گئے ہیں۔ گویا لوگ ہمارے شکر گزر ہونے کی بجائے اسے ہماری مجبوری اور بے بسی پر محمول کریں گے۔ لہٰذا یہ دونوں قسم کا طرز عمل نئے آئین کے

وقار و تکریم کے لئے نقصان دہ ہو گا۔

ہمارا مقصد تو یہ ہے کہ نئے آئین کے نافذ ہوتے ہی، جب اقوام عالم انقلاب کی تکمیل پر حیران و ششدر اور حواس باختہ ہوں وہ خوف و وحشت، اور بے یقینی کے عالم ہی میں ہمیشہ کے لئے یہ حقیقت تسلیم کر لیں کہ ہم ایک نہ مٹنے والی طاقت ہیں۔ ہماری قوت اتنی ناقابل تسخیر ہے کہ ہمیں ان کی قطعاً کوئی پرواہ نہیں۔

ہمیں ان کے خیالات و خواہشات کا احترام تو در کنار ہم ایک ناقابل مزاحمت طاقت کے ساتھ ان کے اظہار کو بھی ہر وقت اور ہر جگہ کچل کر رکھ سکتے ہیں۔ انہیں یہ بھی ذہن نشین کرنا ہو گا کہ ہم نے فوری طور پر ہر اس چیز پر قبضہ کر لیا ہے جس کے ہم خواہ تھے اور کسی حال میں بھی اپنے اقتدار میں شریک کرنے کو تیار نہیں۔ بالآخر وہ خوف و ہراس سے لرزہ براندام ہر چیز سے آنکھیں بند کر لیں گے اور اس ناٹک کے اختتام کا انتظار کرنے پر قانع ہو جائیں گے۔

غیر یہود بھیڑوں کا ایک گلہ ہیں اور ہم ان کے بھیڑئے۔ آپ کو بخوبی علم ہے کہ جب بھیڑئے بھیڑوں کے گلے میں گھستے ہیں تو کیا حشر برپا ہوتا ہے؟ ان کی آنکھیں بند کر لینے کی ایک اور وجہ بھی ہو گی اور وہ یہ کہ ہم ان سے مسلسل یہ وعدہ کرتے رہیں گے۔ کہ امن و عافیت کے دشمنوں کا قلع قمع کرنے اور مختلف جماعتوں کو رام کرنے کے فوراً بعد ان کی تمام آزادیاں انہیں لوٹا دیں گے۔ البتہ اس امر کا ذکر بے کار ہے کہ ان لوگوں کو اپنی آزادیوں کی واپسی کے لئے کتنا طویل انتظار کرنا پڑے گا؟

آخر کار وہ مقصد کیا ہے جس کے پیش نظر ہم نے اس ساری پالیسی کا اختراع کیا ہے اور اس کی تہ میں چھپے ہوئے مفہوم کو سمجھنے کا موقع دئے بغیر انتہائی عیاری سے اسے غیر یہود کے ذہنوں میں اتار دیا ہے؟ کیا اس کا مقصد یہ نہیں کہ ہم ہیر پھیر سے وہ سب کچھ حاصل کرنے میں کامیاب ہو جائیں جس کا حصول ہماری منتشر قوم کے لئے براہ راست ناممکن ہے۔؟

یہی وہ نصب العین ہے جو ہماری خفیہ تنظیم فری میسنری کی اساس ہے۔ جس کا حقیقی علم کسی کو نہیں اور جس کے مقاصد سے متعلق ان غیر یہودی بہائم کو شک تک نہیں گزر سکتا

جنہیں ہم نے اپنی فری میسن اجتماع گاہوں میں اپنی نمائشی لیکن منظم جمعیت کا گرویدہ کر رکھا ہے تاکہ وہ اپنے ہم وطنوں کی آنکھوں میں دھول جھونک سکیں۔

خدا نے ہمیں یعنی اپنی محبوب قوم کو پراگندگی و انتشار کا تحفہ دے رکھا ہے۔ یہ امیر لوگوں کی نظر میں ہماری کمزوری کی دلالت کرتا ہے لیکن در حقیقت ہماری تمام تر قوت کا راز اسی میں مضمر ہے۔ ہمارا انتشار ہی ہمیں دنیا بھر کی حکمرانی کی دہلیز پر لے آیا ہے۔ کرہ ارض پر حکومت کے لئے جو بنیادیں ہم نے رکھ دی ہیں ان پر تعمیر کا کام اب کچھ زیادہ نہیں رہ گیا۔

سنسر شپ۔ کالے قانون

لفظ آزادی کو مختلف طریقوں سے تعبیر کیا جا سکتا ہے لیکن ہمارے نزدیک اس کی تعریف مندرجہ ذیل ہے:۔

"آزادی ایسے امور سرانجام دے سکنے کے حق کا نام ہے جن کی اجازت قانون کے تحت حاصل ہو۔ اس لفظ کی یہ توضیح مناسب وقت پر ہمارے لئے مفید ثابت ہو گی۔ کیونکہ اس طرح ہر قسم کی آزادی کی باگ ڈور ہمارے ہی ہاتھ میں رہے گی۔ یہ امر واضح ہے کہ قوانین کے تحت صرف ان قواعد و ضوابط کو منسوخ کیا جائے گا یا وجود میں لایا جائے گا۔ جو مجوزہ پروگرام کے تحت ہمارے لئے قابل قبول ہوں۔

پیشتر اس کے کہ میں پریس کے متعلق آئندہ لائحہ عمل کی وضاحت کروں آج کے پریس کے کردار پر روشنی ڈالنا ضروری ہے۔ جو دراصل ان جذبات و احساسات کو برانگیختہ اور مشتعل کرنے کا کردار ادا کر رہا ہے جو ہماری مقاصد کی تکمیل کے لئے ضروری ہیں یا پھر یہ سیاسی جماعتوں کے خود غرضانہ اور مذموم عزائم کے کام آتا ہے۔ اس کا کردار اکثر و بیشتر خشک عدل و انصاف سے عاری اور کذب بیانی پر مبنی ہوتا ہے اور عوام کی بھاری اکثریت کو قطعاً اس امر کا کوئی تصور بھی نہیں ہو تاکہ پریس کن مقاصد کی تکمیل کر رہا ہے؟

لیکن ہم اس کے منہ میں کس کر لگام دیں گے اور اسے مکمل طور پر اپنے قابو میں رکھیں گے۔ بلکہ ہر قسم کے مطبوعہ مواد کے بارے میں بھی ہمارا طرز عمل یہی ہو گا۔ کیونکہ اگر ہم

کتابوں اور پمفلٹوں کے حملوں کا نشانہ بنے رہے تو پریس کے حملوں سے بچنے کا کیا فائدہ ہو گا ؟

پبلسٹی کی تخلیقات کو جن پر سنسر کے باعث بھاری رقوم بطور خرچ اٹھ جاتی ہیں، ہم ریاست کے لئے ایک منفعت بخش آمدنی میں تبدیل کر دیں گے اور طباعتی اداروں کے قیام اور کسی اخبار کے اجراء کی اجازت دینے سے پیشتر زر ضمانت داخل کرنا لازمی قرار دیں گے پریس کو اس امر کی بھی ضمانت دینا ہو گی کہ حکومت کو ہدف تنقید بنانے سے اجتناب کیا جائے گا۔ لیکن اس کے باوجود بھی اگر کسی قسم کا نکتہ چینی کا امکان باقی رہا اور کسی نے اس امر کی جرات کی تو اس پر کسی قسم کے ترحم کے جذبہ کے بغیر بھاری جرمانہ عائد کیا جائے گا۔ اس طرح شامپ ٹیکس، زر ضمانت، جرمانوں اور ایسے ہی دیگر اقدامات سے حکومت کو بھاری آمدنی ہو گی۔

یہ واضح ہے کہ پارٹیوں کے ترجمان، پبلسٹی کے لئے شاید زیادہ رقوم خرچ نہ کر سکیں گے لہٰذا دوسری بار تنقید کرنے پر ہم انہیں فوری طور پر بند کر دیں گے۔ اس طرح کوئی شخص بھی ہماری حکومت کے گرد پھیلے ہوئے معصومیت کے ہالے کو ہدف تنقید نہیں بنا سکے گا۔ کسی بھی مطبوعہ مواد کی اشاعت کو روک دینے کے لئے اتنا عذر کافی ہو گا کہ یہ عوامی اذہان کو مشتعل کرنے کا موجب بن رہا ہے اور اس کی اشاعت کا کوئی موقع اور جواز نہیں۔ میں آپ سے اس امر کو بالخصوص ذہن میں رکھنے کی درخواست کرتا ہوں کہ نکتہ چینی کرنے والوں میں وہ اخبارات و رسائل بھی ہوں گے جن کا اجراء ہم نے خود کیا ہو گا۔ لیکن وہ صرف ان پالیسیوں کو ہدف تنقید بنا سکیں گے جن میں تبدیلی لانے کا ہم نے پہلے ہی سے فیصلہ کر لیا ہو گا۔

کوئی ایک اعلان بھی ہماری نگرانی سے بچ کر عوام تک نہیں پہنچ سکے گا بلکہ اب بھی ہم اس حد تک تو اس مقصد میں کامیابی حاصل کر چکے ہیں کہ دنیا بھر کی تمام خبریں ہماری زیر اثر چند ایجنسیاں ہی وصول کرتی ہیں۔ یہ خبریں ایجنسیوں کے مرکزی دفاتر میں یکجا کرنے کے بعد ہی منظر عام پر لائی جاتی ہیں۔ اس وقت تو یہ سب ایجنسیاں پہلے ہی ہمارے قبضے میں آ چکی ہوں گی اور وہ صرف ایسا مواد شائع کریں گی جو ہماری منشا کے مطابق ہو۔

اگر اس وقت ہم نے غیر یہود کے ذہنوں پر قبضہ جمانے کی تدبیر اس حد تک کر لی ہے کہ وہ واقعات عالم کو ان رنگین عینکوں کے ذریعے ہی دیکھتے ہیں جو ہم انہیں پہناتے ہیں۔ اگر آج دنیا بھر میں کوئی بھی ریاست ایسی نہیں ہے کہ جس کے ان امور میں بھی ہمارا خفیہ ہاتھ کار فرما نہ ہو جنہیں یہ بے وقوف مملکت کے رازوں کا نام دیتے ہیں تو اس وقت ہمارے جاہ و جلال کا عالم کیا ہو گا۔ جب ہم اپنے تمام دنیا کے بادشاہ کی شخصیت کے ذریعے اقوام عالم کے مسلمہ حکمران اعلیٰ ہوں گے۔

آیئے! ایک بار پھر ہم پرنٹنگ پریس کے مستقبل پر نظر ڈالیں۔ پبلشر، لائبریرین یا پرنٹر بننے کے ہر خواہش مند شخص کو اس مقصد کے لئے مجوزہ ڈپلومہ حاصل کرنا ہو گا جو کسی قسم کے قصور کی صورت میں فوری طور پر ضبط کر لیا جائے گا۔ ان اقدامات کی بدولت فکر و تدبیر کے آلات ہماری حکومت کے ہاتھوں میں ذریعہ تعلیم کی صورت اختیار کر لیں گے۔ جس سے ترقی کی برکات سے متعلق خیالی منصوبوں میں گمراہ ہونے کا کوئی امکان نہیں رہے گا۔

کیا ہم میں سے کوئی ایسا شخص بھی ہے جو یہ نہ جانتا ہو کہ یہ ہوائی برکتیں، احمقانہ تصورات، خوابوں کی دنیا میں لے جانے کا باعث بنتی ہیں جس سے لوگوں کے نہ صرف باہمی تعلقات میں انتشار پیدا ہوتا ہے بلکہ حکومت کے ساتھ بھی بگاڑ کی صورت رونما ہو جاتی ہے۔ کیونکہ ترقی یا ترقی کے تصور نے آزادی بلکہ ہر قسم کی مادر پدر آزادی کے تصور کو متعارف تو کرا دیا ہے لیکن اس کی حدود کو متعین کرنے میں ناکام رہا ہے۔ یہ تمام نام نہاد حریت پسند اگر عملی لحاظ سے نہیں فکری طور پر انارکسٹ (انتشار پسند) ہی ہیں۔ ان میں سے ہر ایک آزادی کے خیالی منصوبوں کے پیچھے بھاگتا پھرتا ہے اور نتیجتہ مکمل قسم کی بے راہروی کا شکار ہو کر رہ جاتا ہے۔ وہ احتجاج برائے احتجاج کے انتشار میں مبتلا ہو جاتا ہے۔

اب ماہناموں اور ہفتہ وار رسائل و جرائد کی طرف آیئے! ہم ان پر بھی دیگر مطبوعہ مواد کی مانند کاغذ کے فی تختے کے حساب سے شامپ ٹیکس عائد کریں گے اور زر ضمانت جمع کروائیں گے۔ کاغذ کے تیس تختوں سے کم حجم کی کتابوں پر دگنا ٹیکس عائد ہو گا۔ ایسی کتابوں کو پمفلٹوں کا درجہ دیا جائے گا۔ تاکہ ایک طرف ان رسالوں کی تعداد میں کمی آ جائے جو

مطبوعہ زہر کی بد ترین قسم ہیں اور دوسری طرف اس اقدام سے مصنف حضرات اتنی طویل تصانیف لکھنے پر مجبور ہو جائیں کہ عوام کی بہت کم تعداد ان کے مطالعہ میں دلچسپی کا اظہار کرے۔ بالخصوص ان کی گراں قیمت بھی ان کی اس خواہش کے سد راہ بن جائے۔ اس کے برعکس ہم لوگوں کے ذہنوں کو اپنے عزائم اور مفادات کے مطابق متاثر کرنے کے لئے ارزاں قسم کا لٹریچر شائع کریں گے۔ جو بہت ذوق و شوق سے پڑھا جائے گا۔

بھاری ٹیکسوں کے باعث بے لطف اور خشک ادبی تمنائیں حدود ہی میں رہیں گی اور جرمانوں کی صورت میں سزا کا خوف ادیبوں کو ہمارا محتاج اور دست نگر بنا دے گا۔ لیکن اس کے باوجود اگر کسی کو ہمارے خلاف قلم آزمائی کا شوق چرائے گا تو اس کی تحریروں کو چھاپنے کے لئے کوئی شخص بھی تیار نہیں ہو گا۔ کیونکہ کسی بھی مواد کو طباعت کے لئے قبول کرنے سے پیشتر، پبلشر یا پرنٹر کو متعلقہ حکام سے اجازت لینی پڑے گی۔ لہٰذا ہمیں اپنے خلاف تیار ہونے والی تمام چالوں کا پہلے ہی علم ہو جائے گا اور متعلقہ موضوع پر پیشگی توضیحات سے ہم انہیں باطل ٹھہرا دیں گے۔

ادب اور صحافت دونوں ہی اہم ترین تعلیمی قوتیں ہیں۔ اس لئے ہماری حکومت بیشتر جرائد کو خود اپنی ملکیت میں رکھے گی۔ اس سے غیر سرکاری پریس کے مضر اثرات زائل ہوتے رہیں گے اور عوامی ذہن پر ہمارے اثر و رسوخ میں معتدبہ اضافہ ہو گا۔ اگر ہم دس رسالوں کے پرمٹ جاری کریں گے تو خود تیس جرائد کا اجراء کریں گے اور مستقبل میں بھی یہی تناسب قائم رہے گا۔

البتہ پبلک کو کسی طرح بھی اس سے متعلق کوئی شائبہ نہیں گذرنا چاہیے۔ ہمارے تمام جرائد و رسائل بظاہر متضاد رجحانات اور خیالات کے حامل ہوں گے۔ اس سے عوام پر اعتماد بحال ہو گا۔ نیز ہمارے غیر شکی طبیعت کے مخالفین ہماری جھولی میں آگریں گے اور ہمارے جال میں پھنس کر قطعی طور پر بے ضرر ہو کر رہ جائیں گے۔

سرکاری اخبارات و رسائل اہمیت کے لحاظ سے اولین درجے پر ہوں گے۔ وہ ہمیشہ ہمارے مفادات کی نگرانی کریں گے۔ اس لئے مقابلتاً ان کا اثر و نفوذ معمولی نوعیت کا ہو گا۔

دوسرے درجے پر نیم سرکاری ترجمان ہوں گے جن کا کام غیر جانبدار اور سرد مہر لوگوں کو بیدار کرنا ہو گا۔

تیسرے درجے پر ایسے جرائد ہوں گے جو خود ہم نے اپنی مخالفت میں جاری کئے ہوں گے۔ ان میں سے کم از کم ایک تو ایسے نقطہ نظر کو پیش کرے گا جو ہر لحاظ سے ہمارے مخالف ہو گا۔ اس سے ہمیں یہ فائدہ پہنچے گا کہ ہمارے مخالفین ہماری اس خود پیدا کردہ مخالفت کو اپنی تحریک سمجھتے ہوئے دل و جان سے قبول کر لیں گے اور ہمیں اپنے منصوبوں سے آگاہ کر دیں گے۔

ہمارے تمام اخبارات تمام ممکن پہلوؤں کا احاطہ کر لیں گے یہ طبقہ شرفاء ری پبلکن، انقلابیوں اور انتشار پسندوں کے نکتہ نظر کی ترجمانی اس وقت تک کرتے رہیں گے جب تک کہ آئین کا وجود برقرار رہے گا۔ ہندو دیوتا ویشنو کی مانند اس کے بھی سو ہاتھ ہوں گے اور ان میں سے ہر ایک رائے عامہ کے ہر نظریہ کی نشان دہی کرے گا۔ جب بھی کوئی نبض ریز ہو گی اور کسی قسم کی بے اطمینانی کا اظہار ہو گا تو یہ ہاتھ عوامی خیالات کا رخ ہمارے مقاصد کی طرف موڑ دیں گے۔ چونکہ ہر مریض گھبراہٹ و ہیجان کے عالم میں قوت فیصلہ کھو بیٹھتا ہے اور بہ آسانی دوسروں کے جھانسے میں آ جاتا ہے۔ وہ احمق جو یہ سمجھیں گے کہ وہ اپنے کیمپ کے کسی اخبار کا نکتہ نظر دہرا رہے ہیں۔ وہ ہمارے ہی نکتہ نظر یا ہماری پسند کے نکتہ نظر کی تائید کر رہے ہوں گے۔ وہ اس بے کار خیال کو سینے سے لگائے ہوں گے کہ وہ اپنی پارٹی کی ترجمانی کر رہے ہیں حالانکہ وہ صرف اس پرچم کے پیچھے چل رہے ہوں گے جو ہم نے ان کے لئے لہرا دیا ہو گا۔

اپنی اخباری فوج کی اس انداز سے رہنمائی کے لئے ہمیں اس معاملہ کی تنظیم میں خاص حزم و احتیاط سے کام لینا ہو گا۔ مرکزی محکمہ پریس کے نام پر ہم ادبی اجتماعات کا انتظام کریں گے جہاں ہمارے ایجنٹ لوگوں کو متوجہ کئے بغیر ضروری ہدایات اور وقت کے لحاظ سے موزوں نعرے جاری کریں گے۔

اصل موضوع کی طرف لوٹے بغیر ہمارے ترجمان محض سطحی بحث و مباحثے کے ذریعے

مصنوعی جنگ بپا کر کے سرکاری اخبارات پر وار کریں گے۔ اس کا مقصد ہمارے لئے ایسے مواقع بہم پہنچانا ہوگا جن کے ذریعے ہم اپنے ان خیالات کا اظہار مکمل کر سکیں جو ابتدا ہی میں سرکاری اعلانات میں نہیں لائے جاسکتے تھے لیکن جو ہمارے لئے مفید ثابت ہو سکتے ہوں۔

ان تنقیدی حملوں سے ایک اور مقصد کی تکمیل ہوگی کہ ہماری رعایا کو مکمل آزادی تقریر کے وجود کا یقین ہو جائے گا اور ہمارے ایجنٹوں کو بھی اس ادعا کا موقع مل جائے گا کہ ہمارے تمام مخالف اخبار محض یاوہ گوئی سے کام لے رہے ہیں کیونکہ وہ ہمارے احکام پر کوئی ٹھوس اعتراض نہیں کر سکتے۔

اس طرح کے تنظیمی حربے جنہیں عوام اگرچہ محسوس بھی نہیں کر سکتے لیکن اثر و نفوذ کے لحاظ سے یقینی ہوتے ہیں، ہماری حکومت پر عوام کی توجہ مرکوز کرنے اور اعتماد بحال کرنے کا موثر ذریعہ ہیں۔ ہمیں ان طریقوں کا شکر گزار بھی ہونا چاہئے کہ ان ہی کی بدولت ہم وقتاً فوقتاً عوامی ذہن کو سیاسی مسائل پر مشتعل بھی کر سکیں گے اور مطمئن بھی ہم لوگوں کو قائل کرنے اور ذہنی انتشار پیدا کرنے کے لئے کبھی سچی باتیں شائع کریں گے اور کبھی جھوٹے حقائق بھی بیان کریں گے اور ان سے متضاد بیانات بھی خواہ انہیں حقیقت پر مبنی تسلیم کیا جائے یا کذب بیانی پر محمول کیا جائے۔ لیکن ہر قدم اٹھانے سے پہلے کئی بار سوچ بچار کریں گے۔

ہمیں اپنے مخالفین پر یقینی طور پر فتح حاصل ہوگی کیونکہ پریس کے ساتھ مندرجہ بالا طریقے اختیار کرنے کے باعث ان کے پاس ایسے اخبارات ہی نہیں ہوں گے جن کے ذریعے وہ اپنے نظریات کو اظہار کی مکمل اور حتمی صورت پہنا سکیں بلکہ ہمیں تو ان کی تردید کی سطحی طور پر بھی ضرورت محسوس نہیں ہوگی۔

ہمارے اس قسم کے آزمائشی فائروں کی جو پریس کے تیسرے درجے سے داغے جائیں گے ہمارے نیم سرکاری ترجمان موثر انداز سے تردید کریں گے۔

آج کل بھی پہلے بعض ایسی مثالیں موجود ہیں جو فری میسن تحریک کے دئے ہوئے نعروں کے سلسلہ میں مکمل یک جہتی کا مظاہرہ کر رہی ہیں فرانس کے پریس ہی کو لیجئے۔ اس کے تمام

جریدے پیشہ وارانہ رازداری کے لئے مجبور ہیں۔ زمانہ قدیم کے پیش گوئی کرنے والوں کی مانند ان میں سے ہر ایک اپنے ذرائع اطلاع کے بارے میں مہر بلب رہے گا۔ بجز اس کے کہ ان ذرائع کے اظہار سے متعلق متفقہ فیصلہ کر لیا جائے۔ لہٰذا ہمارے ہاں کسی صحافی کو بھی کسی راز کے افشا کرنے کی جرات نہیں ہوگی کیونکہ کسی شخص کو اس پیشے سے منسلک ہونے کی اجازت نہیں دی جائے گی جب تک کہ اس کی سابقہ زندگی کے اوراق کسی شرمناک واقعہ، کسی رسواکن کمزوری یا موجب ذلت حادثے سے داغدار نہ ہوں کسی راز کو افشا کرنے کی کوشش پر اس کے یہ ناسور آشکار کروئے جائیں گے۔

جب تک صحافی کے داغدار ماضی کے راز چند لوگوں تک محدود ہیں۔ اس کی عزو منزلت عوام کی اکثریت کو اپنی جانب متوجہ کئے رکھتی ہے اور لوگ انتہائی جوش و خروش اور ولولے سے اس کی تقلید کرتے ہیں ہمارے منصوبوں کو صوبوں میں بالخصوص پایہ تکمیل تک پہنچایا جائے گا۔ وہاں آرزوؤں اور تمناؤں نیز جذبات و احساسات کو مشتعل کرنا ناگزیر ہوگا اور اسی اشتعال و انتشار کے نتیجہ میں ہم دارالسلطنت پر کسی بھی وقت باآسانی حملہ کر سکیں گے۔ ہم مرکزی حکومتوں پر یہ واضح کر دیں گے کہ صوبوں کا یہ مشتعل طرز اظہار دراصل ان کی علیحدگی اور خود مختاری سے متعلق آرزوؤں کا نتیجہ ہے۔ قدرتی طور پر ان سب کا سرچشمہ ایک ہی ہوگا یعنی ہم خود۔

ہم تو صرف یہ چاہتے ہیں کہ ہمارے برسر اقتدار آنے تک صوبوں سے متعلق رائے عامہ جس کی اکثریت کو ہمارے ایجنٹوں نے منظم کیا ہوگا۔ مرکزی حکومت کا ناک میں دم کر دے۔ تاکہ اس نفسیاتی لمحے پر مرکزی حکومتیں ایک طے شدہ حقیقت کو زیر بحث لانے کی پوزیشن میں نہ ہوں۔ اگر کسی اور سبب سے نہیں تو محض اس لئے کہ صوبوں میں اکثریت کی رائے عامہ اسے پہلے ہی قبول کر چکی ہوگی۔

مکمل اقتدار اعلیٰ کے حصول سے پیشتر اپنے عبوری دور حکومت میں ہم پریس میں سرکاری افسروں کی بد دیانتی سے متعلق خبریں شائع کرنے کی اجازت نہیں دیں گے۔ یہ امر لازمی ہے کہ نئی حکومت کے بارے میں عوام اس انداز میں سوچیں کہ اس نے ہر شخص کو

بالکل مطمئن کر دیا ہے یہاں تک کہ ملک میں جرائم کا بھی خاتمہ ہو چکا ہے۔ جرائم کا ظرف ان کا شکار ہونے والوں یا ان لوگوں کو ہونا چاہئے جو اتفاقیہ طور پر ان کو دیکھ لیں۔ کسی اور کو قطعاً ان سے آگاہ نہیں ہونا چاہئے۔

یہودیت کے استحکام کی خاطر

لوگوں کو طاعت و فرمانبرداری کا عادی بنانے کے لئے انہیں عجز و انکسار سے متعلق درس دیئے جانے چاہئیں۔ اس مقصد کے پیش نظر سامان تعیش کی پیداوار میں بھی کمی کرنا ہو گی۔ اس طرح ہم اخلاق کی اصلاح کر سکیں گے جو تعیشات کے دائرہ میں رشک و مسابقت کے باعث پستیوں کو چھو رہے ہیں۔

ہم چھوٹے صنعت کار سرمایہ داروں کو صنعتیں لگانے پر آمادہ کریں گے۔ یہ عمل بڑے بڑے صنعت کاروں کے نجی سرمائے تلے سرنگ بچھانے کے مترادف ہو گا۔ یہ اقدام اس لئے بھی ناگزیر ہے کہ بڑے بڑے صنعت کار اگرچہ ہمیشہ شعوری طور پر نہ سہی، بالعموم عوام کی سوچ کے دھارے کو حکومت کے خلاف موڑنے میں بہت بڑا کردار ادا کرتے ہیں۔ جس قوم میں چھوٹے صنعت کار ہوں اس کے افراد بے روزگاری سے ناآشنا رہتے ہیں۔ حکومت وقت سے وابستگی کا اظہار کرتے اور نتیجہ حکومت کے استقلال و استحکام کا باعث بنتے ہیں۔ ہر حکومت کے لئے عوام کی بیروزگای انتہائی خطرناک امر ہے ہمارے ہاتھوں میں انتقال اقتدار کے ساتھ ہی اس کا کردار یا عمل ختم ہو جائے گا۔

چونکہ الکحل کے زیر اثر انسان درندگی کا اظہار کرتا ہے اس لئے شراب نوشی قانوناً ممنوع قرار پائے گی اور اسے انسانی فطرت کے خلاف ایک مستوجب سزا جرم قرار دیا جائے گا۔

میں ایک بار پھر اس امر کو دوہراؤں گا کہ عوام صرف ایسے طاقت ور حکمران ہی کی اندھا دھند اطاعت کرتے ہیں جو ان کے اثر سے مکمل طور پر آزاد ہو۔ کیونکہ وہ اسے اپنے دفاع کے لئے شمشیر براں اور سماجی ظلم و ستم کے خلاف اپنی پناہ سمجھتے ہیں۔ انہیں بادشاہ کی ملکوتی

صفات سے کیا غرض ہو سکتی ہے؟ وہ تو اسے قوت و طاقت کے مجسمے کی حیثیت سے دیکھنا چاہتے ہیں۔

ہمارا حکمران اعلیٰ موجودہ دور کے تمام حکمرانوں کا قائم مقام ہو گا، جو اپنے آپ کو ایسے معاشروں میں گھسیٹ رہے ہیں جو ہمارے ہاتھوں اخلاقی لحاظ سے تباہ ہو چکے ہیں جو اللہ تعالیٰ کے وجود سے بھی منکر ہیں اور چاروں طرف سے نفاق و انتشار کی آگ میں جل رہے ہیں۔ برسراقتدار آتے ہی وہ سب سے پہلے اس نکل جانے والی آگ کے شعلوں کو سرد کرے گا۔ اسے ان معاشروں کا خاتمہ کرنا ہو گا خواہ اسے انہیں اپنے خون سے بھی نہلانا پڑے۔ وہ ان کی از سر نو تشکیل اس انداز سے کرے گا کہ وہ ایسے منظم اور باقاعدہ لشکروں میں تبدیل ہو جائیں جو ریاست کے ڈھانچے میں ناسور پیدا کرنے والی ہر برائی کے خلاف صف آرا ہوں۔

خدا کا یہ محبوب اسی کی طرف سے منتخب ہو گا تاکہ وہ ان تمام بے حس اور احمق طاقتوں کو صفحہ ہستی سے مٹا دے جو عقل و دانش کی بجائے جذبات سے اور انسانیت کی بجائے درندگی سے کام لیتی ہیں۔ یہ قوتیں اس وقت آزادی اور حقوق کے اصولوں کی آڑ میں ہر قسم کی جبر و تشدد کو روا رکھتی ہیں اور ڈاکہ زنی کی وارداتیں کر کے فخر محسوس کرتی ہیں۔ انہوں نے معاشرتی و سماجی نظام کی تمام صورتوں کو زیر و زبر کر دیا ہے تاکہ ان کے کھنڈرات پر یہودیوں کے بادشاہ کا تخت سلطانی تعمیر ہو سکے لیکن اس کے اقتدار سنبھالتے ہی ان کا کردار ختم ہو جائے گا انہیں اس کے راستے سے ہٹانا لازمی ہو جائے گا جہاں کسی قسم کی بھی کوئی رکاوٹ نہیں رہنی چاہئے۔

اس وقت ہم دنیا کی تمام اقوام کو یہ کہہ سکیں گے خدا کا شکر ادا کرو اور اس کے سامنے جھک جاؤ جس کے قبضہ اقتدار میں انسانی تقدیر سربمہر ہے جس تقدیر کے راستے خود خدا نے ہمارے بادشاہ کے لئے کھول دیئے ہیں۔ اور یہ اسی کی ذات ہے جس نے ہمیں تمام استبدادی قوتوں اور برائیوں سے نجات دے دی ہے۔

ساری دنیا پر چھا جاؤ!

اب میں شاہ داؤد کے گھرانے کی جڑوں کو زمین کے آخری پرت تک مضبوط و مستحکم

کرنے کا طریق کار بیان کرونگا۔ یہ استحکام ان قواعد و ضوابط کے مرہون منت ہو گا جن پر آج تک قدامت پرستی کی وہ قوت مبنی رہی جس کی بدولت ہمارے فاضل رہنما دنیا کے تمام مسائل حل کرتے رہے اور تمام انسانیت کے افکار و خیالات کی تربیت و رہنمائی کرتے رہے۔

داؤد کی نسل سے کچھ افراد' بادشاہوں اور ان کے وارثوں کو حکمرانی کے لئے تیار کریں گے۔ وہ حکمران طبقے کا انتخاب حق وراثت کی بجائے صلاحیتوں اور قابلیت کی بنا پر کریں گے۔ اس پر سیاست ' مملکت کے رموز و اسرار منکشف کئے جائیں گے۔ اسے حکومت کے منصوبوں سے آگاہ کیا جائے گا لیکن اس امر کا خاص خیال رکھا جائے گا کہ کوئی اور شخص ان رازوں سے آگاہ نہ ہونے پائے۔ اس طرز عمل کا مقصد سب لوگوں پر یہ واضح کرنا ہے کہ حکومت کا کاروبار ان لوگوں کے سپرد نہیں کیا جا سکتا جنہیں اس فن کے خفیہ رازوں سے آشنا نہ کیا گیا ہو۔

صرف انہیں لوگوں کو مذکورہ منصوبوں سے متعلق عملی طریقوں' سیاسی و اقتصادی تحریکوں نیز عمرانی علوم سے صدیوں کے تجربات کی روشنی میں روشناس کرایا جائے گا۔ المختصر ان تمام غیر مبدل قوانین کی روح ان میں پھونک دی جائے گی جنہیں انسانی تعلقات کو متعین کرنے کے لئے خود فطرت نے تشکیل کیا ہے۔

اگر دوران تربیت براہ راست ورثا نے کسی قسم کی بزدلی یا نرم مزاجی کا مظاہرہ کیا تو انہیں حکومت کے حق سے محروم کر دیا جائے گا۔ کیونکہ یہ خصوصیات نہ صرف انہیں حکمرانی کے نااہل بنا دیتی ہیں بلکہ شاہی منصب کے لئے بھی مہلک ہیں ہمارے فاضل رہنماؤں سے عنان اقتدار صرف وہی لوگ حاصل کر سکیں گے جو غیر مشروط طور پر مستقل مزاجی اور ثابت قدمی کا مظاہرہ کر سکیں بلکہ حکومت چلانے کے لئے براہ راست ظلم و تشدد کے حربے سے بھی کام لے سکیں۔

اگر کوئی بادشاہ عزم و ارادے کی کمزوری کے باعث بیمار پڑ جائے یا کسی اور معذوری کے باعث حکمرانی کے قابل نہ رہے تو اسے از روئے قانون نئے اور اہل افراد کو حکومت کی باگ ڈور سونپ دینا ہو گی۔

حال اور مستقبل کے امور' وسائل سے متعلق بادشاہ کے منصوبے اور تجاویز سب لوگوں سے پوشیدہ رہیں گے۔ یہاں تک کہ اس کے قریبی مشیر بھی ان سے آگاہ نہیں ہونے پائیں گے۔ صرف بادشاہ اور اس کے تین معتمدین ہی کو یہ معلوم ہو گا کہ کیا پیش آنے والا ہے ؟ بادشاہ کی شخصیت کو جو اپنے مضبوط اور ناقابل تسخیر عزم کے باعث اپنی اور تمام انسانیت کی حکمران ہو گی لوگ اپنا مقدر اور اس کے پراسرار اعمال سے تعبیر کریں گے۔

کسی کو بھی یہ معلوم نہیں ہو سکے گا کہ بادشاہ کن عزائم کی تکمیل کرنا چاہتا ہے۔ لہٰذا کوئی شخص اجنبی راہوں پر جانے کی جرات نہیں کرے گا۔ یہ لازمی امر ہے کہ بادشاہ کی ذہنی وسعت اور لیاقت ایسی ہونی چاہئے کہ وہ اپنی حکومت کے منصوبوں سے بخوبی نپٹ سکے۔ یہی وہ مقصد ہے جس کے لئے ہمارے فاضل رہنما تاجپوشی سے پہلے ان کا ذہنی امتحان لیں گے۔

عوام سے اپنا تعارف کرانے اور ان کے دلوں میں اپنی محبت پیدا کرنے کے لئے بادشاہ کے لئے ضروری ہے کہ عوام سے بازاروں میں برسرعام گھل مل کر بات چیت کرے۔ اس طرح دونوں قوتوں کے تعلقات استوار ہوں گے۔ جنہیں ہم نے دہشت گردی کے ذریعے ایک دوسرے سے بہت دور کر رکھا ہے۔ دونوں قوتوں کے علیحدہ علیحدہ طور پر ہمارے تسلط میں آنے تک یہ دہشت گردی ہمارے لئے ناگزیر تھی۔

یہودیوں کا بادشاہ اپنے جذبات خصوصاً نفسانی خواہشات کا غلام نہیں ہو گا۔ وہ کسی حالت میں بھی بہیمانہ جذبات کو عقل پر غالب آنے کی اجازت نہیں دے گا۔ کیونکہ نفسانی خواہشات سب سے زیادہ ذہنی صلاحیتوں نیز غیر مبہم' واضح اور روشن خیالات میں انتشار کا باعث بنتی ہیں جس سے انسانی افکار و اعمال حیوانی پستیوں کو چھونے لگتے ہیں۔

داؤد کی مقدس نسل سے تمام دنیا کے حاکم اعلیٰ کی شخصیت کی صورت میں انسانیت کے سہارے کو' عوام کے لئے اپنے ذاتی رجحانات و جذبات کی قربانی دینا ہو گی۔

یہود و ہنود ایکتا

آپ نے اخبارات میں اکثر اس نوعیت کی خبریں پڑھی ہوں گی کہ پاکستان کے ایٹمی پلانٹ کہوٹہ پر بھارت یا اسرائیل کی طرف سے حملے کا خطرہ۔ اللہ تعالیٰ پاکستان کو تمام آفات و بلیات سے محفوظ رکھے لیکن کمینے دشمن کی طرف سے آنکھیں بند کرلینا بھی دانشمندی نہیں۔ یہود ہو یا ہنود دونوں ایک ہی تھیلی کے چٹے بٹے ہیں۔ دونوں کے درمیان ہمیشہ سے تعاون بھی موجود رہا ہے۔

منافقت بھارت کی خارجہ حکمت عملی کا حقیقی اور بنیادی اصول ہے۔ یہ الگ بات ہے کہ بھارت ہمیشہ ناوابستگی کا لبادہ اوڑھ کر اپنے حقیقی چہرے کو چھپانے کی کوشش کرتا رہا ہے۔ وہ اپنی مقصد برآمدی' کے لئے مختلف ممالک کو مختلف چہرے دکھاتا ہے۔ پاکستان قدرتی طور پر سب سے زیادہ بھارت کی اس دو چہرہ حکمت عملی کا شکار رہا ہے۔ بھارت نے ہمیشہ دنیا کے سامنے امن کا ڈھنڈورا پیٹا اور پاکستان کے خلاف جنگ میں ہمیشہ ہی پہل کی' پاکستان بلاشبہ بھارت گزیدہ ہونے میں سب سے آگے ہے۔ لیکن بہرحال اس سلسلے میں تنہا نہیں ہے۔ بھارت نے اسرائیلی توسیع پسندی کے خلاف عربوں کی جدوجہد میں بھی اس دورخی پالیسی سے کام لیا ہے۔ ایک طرف بھارت عربوں کے موقف کا بہت بڑا حامی ہونے کا دعوے دار ہے اور دوسری جانب عسکری اور جوہری شعبوں میں بھارت نے ہمیشہ اسرائیل سے قریبی تعلقات قائم رکھے ہیں۔ اسرائیل اور بھارت کا یہ گٹھ جوڑ سال بہ سال بڑی تیز رفتاری سے ترقی کرتا رہا ہے۔

آج بھارت بظاہر تو عربوں کا دوست بنا ہوا ہے لیکن درحقیقت عربوں کے موقف کے لئے بھارت کی حمایت ایک ڈھونگ سے زیادہ کچھ نہیں ہے اور وہ دراصل عرب دوستی کا لبادہ

اوڑھ کر لارنس آف عریبیا کا کردار ادا کر رہا ہے۔

بھارت کے اسرائیل کو تسلیم کرتے ہی 1950ء میں بمبئی میں اسرائیلی قونصلیٹ نے کام کرنا شروع کر دیا تھا بعد کے سالوں میں بھارت اور اسرائیل کے درمیان وفود کا تبادلہ جاری رہا۔ 1962ء میں دونوں ممالک میں جوہری تعاون کا معاہدہ طے پایا اسرائیل کے اٹامک انرجی کمیشن کے ایک رکن الادن برگنمان (Aladan Burgnmmon) نے اسرائیلی حکومت کی طرف سے اس معاہدے پر دستخط کئے۔ یہی معاہدہ بھارت کی ایٹمی پالیسی میں سنگ میل کی حیثیت رکھتا ہے۔

اپریل 1963ء میں اسرائیل کے جنرل شٹیل (General Shatel) نے بھارت کے چیف آف آرمی سٹاف جنرل جے۔ ایم چودھری سے مذاکرات کے لئے بھارت کا دورہ کیا۔ ان مذاکرات میں ایک خفیہ معاہدہ طے پایا۔ فیصلہ کیا گیا کہ آئندہ اسرائیل بھارت کو اسلحہ فراہم کرے گا اور یہ کہ دونوں ممالک اپنے فوجی تربیت کے اداروں میں ایک دوسرے کے افسران کو تربیت فراہم کریں گے جنرل شٹیل نے بھارت کے اسلحہ ساز کارخانوں کا دورہ بھی کیا۔ اس ضمن میں دونوں ممالک نے تربیتی افسران کا تبادلہ کیا بعد کے سالوں میں جنرل شٹیل کے ساتھ طے پانے والے معاہدے پر حرف بحرف عمل درآمد کیا گیا اس معاہدے کے کچھ ہی عرصہ بھارتی فوج کے کرنل ایم۔ ایم سندھی نے اسرائیل کے مقام حیفہ کا دورہ کیا اور فوجی ساز و سامان دیکھا کیونکہ بھارتی فوج کو اس سامان کی ضرورت تھی۔ چین کے ساتھ بھارت جنگ لڑ چکا تھا اور اپنی ہزیمت مٹانے کے لئے اب پاکستان پر حملے کی تیاری کر رہا تھا۔ بھارتی کرنل کے اس خفیہ دورے کا انکشاف بیروت کے اخبار "الیوم" نے اپنی 11 دسمبر 1963ء کی اشاعت میں کیا۔ بھارت یقیناً اس خبر کی تردید کر دیتا۔ لیکن اخبار نے بھارت کے "آرمی جنرل ہیڈ کوارٹرز" کے ڈائریکٹوریٹ آف ویپنز اینڈ ایکوپمنٹ' کی ایک خفیہ دستاویز شائع کر کے اسے ناممکن بنا دیا۔ دستاویز پر نمبر درج ہے۔ No 94653/MC WE-3 مورخہ یکم اپریل 1963

اس دستاویز کو خفیہ قرار دیا گیا ہے اور اس پر بریگیڈیر ایس۔ این انیتا کے دستخط ہیں۔

اس میں کہا گیا ہے کہ مارچ 1963ء میں اسرائیل نے بھارت کو 190 مارٹر اور پچاس ہیوی مارٹر بم فراہم کئے۔ بھارتی توپخانے کے قیام میں اس امداد نے اہم کردار ادا کیا اخبار الیوم نے اس دستاویز کے علاوہ حکومت ہند کی وزارت دفاع کا اپنے چیف آف آرمی سٹاف کے نام وہ خط بھی شائع کر دیا جس میں انہیں صدر جمہوریہ کی طرف سے کرنل ایم۔ایم سندھی کے وفد کے لئے باضابطہ اجازت کی اطلاع دی گئی تھی۔ اس خط کی اشاعت سے عرب حلقوں میں سنسنی پھیل گئی اور عرب ممالک نے سنجیدگی سے بھارت کے ساتھ تعلقات کا جائزہ لینا شروع کیا۔

جس وقت نئی دہلی اور تل ابیب میں بھارت اسرائیل سمجھوتے کے بارے میں غور کیا جا رہا تھا، جنرل شٹیل نے بھارت میں متعین اسرائیل کے قونصل جنرل کی معیت میں بھارت کا خفیہ دورہ کیا اور جنرل چودھری کے ساتھ کئی طویل ملاقاتیں کیں۔ یاد رہے یہ وہی جنرل شٹیل ہے جس کے یروشلم میں عربوں پر حملہ آور ہونے والے صیہونی گروہوں کی قیادت کی تھی۔ بھارت اسرائیل فوجی تعاون کو فروغ دینے کے لئے صیہونی رجحانات رکھنے والے دو یہودی افسروں کو بھارت کی وزارت دفاع میں تعینات کیا گیا یہ افسران بھارتی فوج کے 65ء کی جنگ میں پاکستان پر حملے کے لئے بھارت کو مشورے اور ٹریننگ دیتے رہے اور بھارتی جی ایچ کیو میں انہوں نے بڑا اہم کردار ادا کیا۔

انڈین نیوی کے کیپٹن ریجس شرین ڈیوڈ (Regies Sirrin David) کو بھارتی وزارت دفاع میں ڈیفنس ڈائریکٹوریٹ میں متعین کیا گیا اور ایک دوسرے سینئر افسر ریر ایڈمرل بنجمن ابراہام سیمسن (Benjamin Abraham Samson) جو کہ انڈین نیوی میں فلیگ آفیسر کمانڈنگ تھے، کی خدمات بھی بھارتی حکومت نے بھارت اسرائیل رابطہ اور اشتراک کی منصوبہ بندی کے لئے طلب کرلیں۔

یہ بات بھی قابل ذکر ہے کہ بعد میں ایک مرتبہ جب دونوں ممالک کی مشترکہ مساعی ہم آہنگی پیدا کرنے کے لئے ایڈمرل سیمسن نے اسرائیل کا دورہ کیا تو عرب پریس میں سختی سے اس کا نوٹس لیا گیا۔ جب یہ خبر پھیل گئی تو قاہرہ کے سفارت خانے نے اس کی تردید کی اور کہا کہ ایڈمرل سیمسن محض علاج کی غرض سے اسرائیل گئے تھے۔ یہاں شاید یہ بتانا غیر ضروری

ہو کہ ایڈمرل کسی ایسے مرض کا شکار تھے جس کا علاج اسرائیل کے فوجی ماہرین کے پاس تھا، طبی معالجین کے پاس نہیں۔ یاد رہے کیپٹن ڈیوڈ اور ایڈمرل سیمسن دونوں بمبئی کی یہودی کونسل (Jewish Council) سے منسلک رہ چکے ہیں۔ بھارت کے سینئر صیہونی افسروں میں ایک نمایاں نام میجر جیکب Jacob کا ہے۔ یہ وہی صاحب ہیں جنہوں نے ڈھاکہ میں پاکستانی فوج سے ہتھیار ڈلوانے کے سلسلے میں مذاکرات کئے تھے اور تعریف کے انداز میں اپنے ملک سے اسرائیل کا موزانہ کیا تھا۔

ایک مشہور عربی اخبار "الھدف" نے بھارت اسرائیل کے فوجی گٹھ جوڑ پر تبصرہ کرتے ہوئے بھارت کی وزارت دفاع کے ایک خط کا عکس بھی شائع کر دیا۔ اخبار لکھتا ہے:-

اگرچہ بھارتی مشن اور عرب ممالک میں بھارت کے ترجمان اسرائیل کے ساتھ بھارت کے قریبی گٹھ جوڑ کی ناقابل تردید رپورٹوں کی مسلسل تردید کرتے رہے ہیں لیکن اس کے باوجود یہ حقیقت اپنی جگہ اٹل ہے۔

"بھارتی وزارت دفاع کے ریکارڈ سے شہادت حاصل ہو جانے کے بعد یہ بات ہر قسم کے شک و شبہ سے بالا نظر آتی ہے"

"باوثوق ذرائع کے مطابق 1963ء سے اب تک بھارت ایک لاکھ بڑی طاقت کے دھماکہ خیز بم خرید چکا ہے۔ ایک سو مارٹر اور اسلحہ اور گولہ بارود کی ایک بہت بڑی تعداد اس کے علاوہ ہے۔ کچھ عرصہ پہلے ہونے والی اطلاعات سے یہ معلوم ہوا تھا کہ بھارت نے اسرائیل سے خاصی تعداد میں سٹین کاربائن خریدے تھے"

یہ بتانے کی ضرورت نہیں کہ اسرائیل سے اتنے کثیر اسلحہ خریدنے کا لازمی نتیجہ یہ ہو گا کہ اس کی اسلحہ ساز صنعت کو فروغ حاصل ہو گا اور اس کی یہ طاقت عربوں کے خلاف اور فلسطین پر تسلط کو قائم رکھنے کے لئے استعمال ہو گی۔ ہم یہ جاننا چاہتے ہیں کہ بھارت اس سلسلے میں کیا کہتا ہے۔

بھارت کی وزارت دفاع کا ایک اور خفیہ مکتوب بہت سے دوسرے حقائق سے پردہ اٹھاتا ہے اس مکتوب پر بریگیڈیئر انیتا کے دستخط ہیں اور یکم اپریل 1963ء کی تاریخ درج ہے۔ اس

میں ان اسلحہ گولہ بارود اور فوجی ساز و سامان کی فہرست دی گئی ہے جو بھارت نے امریکہ و اسرائیل اور آسٹریلیا سے حاصل کئے۔ مارچ 1963ء میں اسرائیل اور آسٹریلیا نے بھارت کو پچاس ہیوی مارٹر اور ننانوے 190 ایچ-ای مارٹر 190 HE Mortar بم فراہم کئے۔ اسی سال کے آغاز یعنی جنوری 1963ء میں اسرائیل اور بھارت کے درمیان جو فوجی مذاکرات ہوئے تھے۔ ان مذاکرات کے فوراً بعد اسلحہ کی اتنی بڑی سپلائی کا مطلب اس کے سوا اور کیا ہو سکتا ہے کہ ان مذاکرات کے نتیجے میں یقیناً بھارت اور اسرائیل کے درمیان کوئی خفیہ فوجی معاہدہ طے پا گیا تھا جس کے ایک ماہ مارچ 1963ء کی تفصیلات کسی وجہ سے منظر عام پر آگئی ہیں۔ بھارت اور اسرائیل کے فوجی تعلقات کی وسعت کو اس پر بخوبی قیاس کیا جا سکتا ہے۔ یہ بھی نہیں بھولنا چاہئے کہ اسلحہ کی فراہمی مذاکرات کے محض تین ماہ بعد شروع ہو گئی تھی۔

1962ء کے چین بھارت تنازعہ کے دوران بھارت نے محسوس کیا کہ کوہستانی جنگ کے لئے اس کے پاس سامان کی بہت کمی ہے۔ اس لئے اس نے مدد کے لئے اسرائیل سے رجوع کیا۔ پیرس کے اخبار لمونڈ La Monde کے نامہ نگار ژاں ویز Jean Wetz نے دہلی سے اپنے اخبار کو ایک مراسلہ بھیجا جس میں اہم انکشافات کئے گئے ہیں:۔

اکتیس اور ایک سو بیس ملی میٹر کے ہلکے مارٹر Mortar حاصل کرنے کے لئے نئی دہلی کے رہنماؤں نے اسرائیل سے رجوع کیا۔ انہوں نے درخواست کی کہ مطلوبہ سامان جس جہاز کے ذریعے بھارت پہنچایا جائے اس پر اسرائیل کا جھنڈا نہ لہرا رہا ہو۔

اس درخواست پر بن گوریاں Ben-Gurion نے سختی سے جواب دیا "جھنڈا نہیں تو اسلحہ بھی نہیں"

بالآخر فیصلہ ہو ہی گیا اور اسرائیل کے مال بردار یارڈن نے بمبئی کی بندرگاہ پر وہ سامان لا کر اتار دیا جس کی بھارت کو اشد ضرورت تھی۔ اس جہاز پر اسرائیل کا جھنڈا نہیں تھا۔ اس معاملے کو خفیہ رکھنے کی ہر ممکن کوشش برٹش انٹیلی جنس نے ناکام بنا دی جس کے ایجنٹ نے اس "ڈیل" کو طشت از بام کر دیا۔

1967ء کی جنگ میں جب صیہونی جارحیت پسند عربوں کی سرزمین پر قبضہ کر رہے تھے تو

بھارت کے حکمران اسرائیلی فوجوں کی پیش قدمیوں کی خبریں سن سن کر پھولے نہ سماتے تھے۔ لوک سبھا میں تقریر کرتے ہوئے بھارت کے وزیر خارجہ سورن سنگھ نے کہا تھا:۔

اسرائیل کی مسلح افواج کی کامیابیوں نے خاص طور پر انتہائی مختصر وقت میں ان کی بر سر عمل آجانے کی صلاحیت نے بھارت کو گہرے طور پر متاثر کیا ہے۔ ہمیں یہ جاننے سے دلچسپی ہے کہ اسرائیل نے اپنی تمام افواج کو چوبیس گھنٹے کے اندر اندر حرکت میں لے آنے اور اس سے مثبت نتائج حاصل کرنے میں کس طرح کامیابی حاصل کی۔

اسرائیل سے بھارت کے خفیہ فوجی معاہدہ کے بعد دونوں ممالک کے درمیان فوجی افسران کے سرکاری اور غیر سرکاری دوروں کا جو سلسلہ شروع ہوا تھا۔ جون 67ء کی عرب اسرائیل جنگ کے بعد اس میں نمایاں اضافہ ہوا۔ جب فرانسیسی حکومت نے اسرائیل کو اسلحہ کی فراہمی پر پابندی عائد کر دی تو بریگیڈیر جنرل ارائیل شیرون Ariel Sharon نے فوراً دہلی کا دورہ کیا۔ یہ وہی صاحب ہیں جو 1967ء کی جنگ میں سینائی میں اسرائیل کے آرمڈ دستوں کے قائد تھے۔ اس دورے کا مقصد فرانس کے مسٹیئر Mystyere اور گرگن Gurgan جہازوں کے فاضل پرزے بھارت سے حاصل کرنا تھا۔

فرانس کے 21 ایم ایکس (13) ٹینکوں کے فاضل پرزے بھی بھارت سے خریدے گئے۔ یہ ٹینک بھارت اور اسرائیل دونوں ممالک میں کام کر رہے تھے۔ کچھ وقت کے بعد رپورٹ آئی کہ مطلوبہ سامان کی پہلی قسط بھارت سے براستہ یونان اسرائیل روانہ کر دی گئی ہے۔ اس تمام معاملے کا انتظام سوئٹزرلینڈ کی ایک فرم نے کیا۔ سوئٹزرلینڈ کا انتخاب شاید اس کی بین الاقوامی غیر جانبدار حیثیت کے پیش نظر کیا گیا۔

ایک طرف بھارت نے اسرائیل کو وہ فاضل پرزے مہیا کئے جن کی اس کو اشد ضرورت تھی اور دوسری طرف اس نے مغرب کے اسلحہ ڈیلروں کے ذریعے اسرائیلی اسلحہ سویت گائیڈڈ میزائل Guided Missiles اور ایسا فوجی ساز و سامان اسرائیل سے خریدنے کے لئے بات چیت شروع کر دی جو اسرائیل نے 1967ء کی جنگ سینائی کے دوران عربوں سے چھینا تھا۔

بھارت کے وزیر دفاع سورن سنگھ نے تجویز پیش کی کہ بھارت کے ماہرین اسرائیل کا دورہ کریں اور اس کے فوراً ہی بعد یکے بعد دیگرے کئی وفود اسرائیل پہنچنا شروع ہو گئے دورہ کرنے والوں میں سب سے نمایاں شخصیت انڈین پارلیمنٹری ڈیفنس کونسل کے بانی رکن اور یو' پی سے لوک سبھا کے ممبر میجر رنجیت سنگھ کی تھی۔ انہوں نے 1967ء میں عربوں کے خلاف اسرائیلی کی جنگی حکمت عملی کا موقعہ پر پہنچ کر جائزہ لیا۔ واپسی پر انہوں نے بھارت کو بھی پاکستان اور چین کے خلاف اسرائیل جیسا ہی دفاعی نظام قائم کرنے کا مشورہ دیا۔ میجر رنجیت سنگھ نے موشے دایان کے حوالے سے بتایا کہ اسرائیل نے 1967ء کی جنگ میں عربوں کے خلاف بعض ایسی جنگی چالیں استعمال کیں جو بھارت نے 1965ء کی جنگ میں پاکستان کی خلاف استعمال کیں تھیں۔ یہ الگ بات کہ بھارت ہار گیا اور اسرائیل کامیاب رہا۔

میجر رنجیت سنگھ کے دورے کی رپورٹ دیتے ہوئے لندن کے جیوش کرانیکل نے لکھا ہے:۔

" بھارت کو اسرائیل کے نہول " Nahol " (کسان سپاہی) نظام دفاع جیسے نظام کی ضرورت ہے بھارت چین اور پاکستان کی جارحیت سے اپنی سرحدوں کی حفاظت صرف اسی صورت میں کر سکتا ہے۔ میجر سنگھ یہ سمجھتے ہیں کہ چھ روزہ عرب اسرائیل جنگ اپنے آغاز' رفتار اور نتائج کے اعتبار سے 1965ء کی پاک بھارت جنگ سے خاصی مشابہت رکھتی ہے۔

وہ الم انگیز حالات جن میں متحدہ عرب جمہوریہ کی فضائی فوج کو اسرائیلی بمباروں کے ہاتھوں بھاری جانی نقصان اٹھانا پڑا۔ ابھی ایک راز ہے لیکن استنبول سے آنے والی ایک رپورٹ سے بعض ایسے حیرت انگیز انکشافات سامنے آئے ہیں جن میں اس ہزیمت کی ذمہ داری مصری فضائیہ کو تربیت دینے والے ہندوستانی افسروں پر ڈالی گئی ہے۔ رپورٹ میں کہا گیا ہے:۔

"5 جون کی صبح کو اسرائیلی فوج کے " Blitzkrieg " مقابلے میں مصری فوج کو جو دھکا پہنچا' اس میں بھارتی فضائیہ کے افسران کی نااہلیت کا بھی بڑا دخل ہے جو مصری فضائیہ کو

تربیت دیتے رہے اور جن کی وفاداری بالیقین مشکوک ہے۔

مصر نے جس طرح روس سے دوستی کی قیمت ادا کی اسی طرح اس نے ہندو دوستی کی قیمت بھی 67ء میں چکائی تھی۔

بھارت روس دفاعی معاہدے کے تحت بھارتی فضائیہ کے افسران کئی سالوں سے مصری فضائیہ کو تربیت دے رہے ہیں۔ بھارتی فضائیہ کے مشن میں کل بیس افسران اور انسٹرکٹر شامل تھے۔ متحدہ عرب جمہوریہ کو پہلے ہی بتا دیا گیا تھا کہ یہ لوگ ناقابل اعتماد ہیں۔ ان افسران کے بمبئی میں اسرائیل قونصل جنرل سے تعلقات کے بارے میں شواہد بھی مصری حکومت کے سامنے پیش کر دیئے گئے تھے۔ بہرحال انتباہات پر کوئی توجہ نہیں دی گئی اور دفاعی معاملات میں بھارت مصر تعاون بڑھتا چلا گیا۔

باوثوق ذرائع نے اطلاع دی کہ مصری فضائیہ کے بہت سے راز بھارتی فضائیہ کے افسروں نے اسرائیل کے پاس پہنچا دیئے اور جس معیار کی تربیت ان بھارتی معلموں نے مصری فضائیہ کو دی تھی۔ اس کا عملی مظاہرہ اس صورت میں ہوا کہ پانچ جون کی صبح کو مصری فضائیہ کے تقریباً تمام لڑاکا اور بمبار طیارے ایک قطار میں کھڑے کر دیئے گئے تاکہ حملہ آور اسرائیلی طیاروں کو کسی قسم کی دقت کا سامنا نہ کرنا پڑے۔ اسرائیلی فضائیہ کے کامیاب Blitzkrieg نے جنگ کے پہلے دو گھنٹے میں ہی نتیجے کا فیصلہ کر دیا۔

1967ء کی جنگ کے بعد بھی بھارت اسرائیل گٹھ جوڑ قائم رہا۔ مئی 1970ء میں بھارتی فضائیہ کا ایک اعلیٰ اختیاراتی وفد جو سات فوجی طیاروں پر مشتمل تھا۔ قبرص کے راستے اسرائیل پہنچا۔ اس وفد کے دورے کا مقصد 1967ء کے معاہدے کی تین سالہ کارکردگی کا جائزہ لینا تھا۔ وفد کے دورے کی خبر خفیہ رکھی گئی تھی لیکن کسی نہ کسی طرح یہ خبر گھانا پہنچ گئی اور اپنی 20 مئی 1970ئی کی اشاعت میں گھانا پوسٹ نے اسے شائع کر دیا۔

اس دورے کے جواب میں اکتوبر 1971ء میں اسرائیل کا ایک فوجی وفد نئی دہلی گیا' جس میں تینوں مسلح افواج کے نمائندے شامل تھے۔ اس وفد نے ایک معاہدے پر بات چیت کی' جس کا مقصد یہ تھا کہ اسرائیل بھارت کو فوجی ساز و سامان مہیا کرنے کے ساتھ ساتھ فوجی

مہارت بھی فراہم کرے گا۔ جس کے بعد یہ سلسلہ مستقل جاری ہے اور کئی دفعہ پاکستانی ایٹمی پلانٹ کہوٹہ پر بھارت اور اسرائیل نے مل کر حملے کی مشق کی ہے۔

اسرائیل کے ساتھ بھارت کی کمٹمنٹ کی نوعیت کیا ہے۔ 1967ء کی عرب اسرائیل کشیدگی کے دورے کے ایک عجیب وغریب واقعہ سے اس کا جواب بخوبی مل جاتا ہے۔ ہوا یہ کہ ہندوستانی جہاز پاربتی جیانتی ایک اسرائیلی شیل کا نشانہ بن گیا بھارتی سفیر اے۔ بی پنت نے اس جہاز کے کپتان کو فوراً یہ ہدایت کردی کہ وہ اس کے بارے میں صحافیوں سے کوئی بات نہ کرے ایک سفیر موصوف کی ہدایت سے صاف طور پر ظاہر ہوتا ہے کہ بھارت عرب دنیا کو اپنا جو چہرہ دکھاتا ہے وہ اس کا حقیقی چہرہ نہیں ہے ایک عربی صحافی کے بقول:-

"ہندوستان والوں کو ہمیشہ یہ فکر کھائے جاتی ہے کہ کہیں اسرائیل اس سے ناراض نہ ہو جائے۔"

جو لوگ خبروں کے تسلسل پر نظر رکھتے ہیں اور اسرائیل کے ساتھ بھارت کے دوستانہ تعلقات کے متعلق جانتے ہیں۔ ان کے لئے یہ کوئی حیرت انگیز انکشاف نہ ہو گا کہ بھارت ہمیشہ سے ہی اسرائیل کی خوشنودی کا طالب رہا ہے۔ اور یہ بات بھی آسانی سے سمجھ میں آنے والی ہے کہ سفیر موصوف نے غیر ملکی نامہ نگاروں کو کپتان سے انٹرویو کرنے سے کیوں روک دیا تھا۔ ان کا یہ اقدام حقیقت میں یہ کہنے کے مترادف تھا۔ "جہاز کی بات چھوڑو۔ دو بھائیوں کے تعلق میں ایک جہاز کی آخر حیثیت ہی کیا ہے۔"

پاکستان کو توڑنے میں اسرائیل نے کیا کردار ادا کیا اور کس طرح بھارت کی امداد کی۔ اس سوال کا جواب مندرجہ ذیل پریس رپورٹ میں تلاش کیا جا سکتا ہے۔ اسرائیل مشرقی پاکستان کی علیحدگی پسند تحریک کو بڑے پیمانے پر اسلحہ اور گولہ بارود فراہم کرتا رہا۔ یہ سپلائی حکومت بنگلہ دیش کے لئے امداد کے نام پر کی جاتی تھی اور کلکتہ کا گورنمنٹ ہاؤس اس کا مرکز تھا۔ اسرائیلی ہتھیاروں کی قیمت برطانیہ، یورپ اور شمالی امریکہ میں جمع کئے جانے والے فنڈ سے کی جاتی تھی۔ پھر علیحدگی پسندوں کا ایک گروپ بھارت سے تین ملین سٹرلنگ کے برابر پاکستانی روپیہ لے آیا۔ یہ گروپ مارچ اپریل 1971ء میں بھاگ کر بھارت چلا گیا۔ کلکتہ میں

ڈیلی ٹیلیگراف کے نمائندے نے بھی اس خبر کی تائید کی۔ بھارت نے اسرائیلی اور یورپی ممالک سے اسلحہ کے حصول میں علیحدگی پسندوں کی ہر ممکن مدد کی۔"

علیحدگی پسندوں کے ایک ترجمان نے ٹائمز کے نمائندے پیٹر ہیزل ہرسٹ --Peter Hazle Hurst-- کو بتایا۔ ہم سرحد پار سے جو روپیہ لائے 'بلیک مارکیٹ میں اسے بدلوانے سے ہمیں تیس ملین سٹرلنگ حاصل ہوئے۔ بھاگنے والے لاتعداد علیحدگی پسندوں کے ذریعے سو روپے اور پانچ سو روپے کے بے شمار منسوخ شدہ نوٹ لندن، یورپ کے دوسرے تمام تجارتی مراکز اور کابل پہنچے (افغانستان میں کرنسی پر پابندیاں عائد نہیں ہیں) اور کابل کی اس منڈی کا استعمال بہت بہت زور شور سے کیا گیا۔

مارچ اپریل 1971ء میں اسرائیل کی طرف سے بھارت اور علیحدگی پسندوں کو دی جانے والی اسلحہ کی امداد کے بارے میں خفیہ مذاکرات شمالی امریکہ میں ہوئے۔ اس وقت تک بھارت اور بنگلہ دیش کے ایجنٹ وہاں پہنچ چکے تھے۔ اس کے بعد یورپ اور اسرائیل میں صیہونی ایجنٹوں کے ساتھ اس قسم کے مذاکرات جاری رہے۔ اور یہ بات ثبوت کو پہنچ چکی ہے کہ قادر بانی کے جنرل قدر نے امریکہ کی ریاست کیلئے فورنیا کے شہر لاس اینجلس میں "موساد" کے ایجنٹوں سے طویل مذاکرات کئے جنہوں نے اسے تخریب کاری کے لئے جدید ترین ہتھیار اور تربیت بہم پہنچائی۔ ایک اور پریس رپورٹ کے مطابق:-

"دارالحکومت کے سفارتی حکومت نے انکشاف کیا کہ بھارتی وزیر اعظم مسز اندرا گاندھی اور اسرائیل کے وزیر خارجہ ایبا ایبان نے یورپ کے ایک نامعلوم فوجی اڈے پر ملاقات کی۔ یہ مذاکرات دو گھنٹے تک جاری رہے اور ان کے نتیجے میں ایک معاہدے پر دستخط کئے گئے۔ اس معاہدے کے مطابق یہ طے پایا کہ بنگالیوں پر مشتمل ایک فوج قائم کی جائے۔ اسرائیل نے وعدہ کیا کہ وہ اس فوج کو ہر قسم کی مدد دے گا۔ اسرائیل نے اس بات پر بھی آمادگی ظاہر کی کہ وہ اس فوج کی تربیت کے لئے اپنے ماہرین بھیجے گا اور اسے اسلحہ بھی فراہم کرے گا"

کیا ان رپورٹوں کی موجودگی میں بھی بھارت اسرائیلی گٹھ جوڑ کے بارے میں کسی قسم کا

شبہ باقی رہ جاتا ہے۔ یہودی بھارت میں اپنے اتنے بہت سے اثر و رسوخ کو بھی ناکافی سمجھتے ہیں۔ اس لئے وہ بحیرہ عرب میں اپنا اثر بڑھانے کی کوشش کر رہے ہیں۔ اب عرب سفارتی حلقوں نے انکشاف کیا ہے کہ اسرائیل نے بحیرہ ہند میں اپنی کاروائیوں کے مرکز کے طور پر سنگاپور کا انتخاب کیا ہے۔ اسرائیل نے اس ساحلی ملک کو اپنے مشیروں اور فنی ماہرین کی خدمات کی پیش کش کی اور 1968ء میں یہاں اسرائیلی مشیروں کی تعداد ایک سو انتیس تھی۔ بمبئ جہاں اسرائیلی قونصل جنرل کا دفتر ہے، پہلے ہی صیہونی سرگرمیوں کا مرکز ہے۔ اس سے یہ ظاہر ہوتا ہے کہ اسرائیل اور بھارت مل کر اس علاقے میں اس خلا کو پر کرنا چاہتے ہیں جو بحیرہ ہند سے برطانیہ کے انخلاء کے نتیجے میں پیدا ہوا ہے۔

مسلمانوں کی غفلت سے فائدہ اٹھا کر ہی پر گیری اور دوسری یورپین اقوام نے بحیرہ ہند میں جہاز رانی کا آغاز کیا تھا اور جنوب مشرقی ایشیا کے مسلمان علاقوں پر قبضہ کر لیا تھا۔ کہیں ایسا نہ ہو کہ یہی تاریخ پھر سے دہرائی جائے۔ بھارت اور اسرائیل کے اس علاقے میں بڑھتے ہوئے اثر و نفوذ پر کڑی نظر رکھی جانی چاہئے اور ان کے فوجی گٹھ جوڑ کے خطرناک اثرات کا مقابلہ کرنے کے لئے مناسب اقدامات کئے جانے چاہئیں۔ اس علاقے کے مسلمان ممالک کی سالمیت اور آزادی کے تحفظ کے لئے یہ سب کچھ بہت ضروری ہے۔

اب جب کہ عراق کو اپنی بیوقوفی اور عالم اسلام کی بے حسی کے سبب زبردست نقصان اٹھانا پڑا تو اسرائیل کو اس خطے میں بدمعاشی کے مکمل اختیارات مل گئے ہیں اور کچھ بعید نہیں کہ یہودی اور ہندو مل کر عالم اسلام کی دوسری ایٹمی طاقت پاکستان کے خلاف شیطانی کھیل کا آغاز کریں کیونکہ عراق کے ایٹمی پلانٹوں کی تباہی کے بعد اب اسرائیل کو عالم اسلام میں صرف پاکستان کی ایٹمی قوت سے خطرہ ہے۔

آیئے دیکھتے ہیں کہ جوہری میدان میں دونوں شیطانوں نے ایک دوسرے کا کس حد تک ساتھ دیا ہے۔

بھارت اور اسرائیل دونوں ممالک اپنے وجود میں آنے کے فوراً بعد سے ہی جوہری میدان میں تگ و تاز شروع کر دی تھی۔ گذشتہ تین عشروں میں ان دونوں ممالک نے جوہری

توانائی کے میدان میں ایک دوسرے سے بھرپور تعاون کیا 60ء اور 70ء کے درمیانی عشرے میں دونوں نے کام کی رفتار تیز کر دی جس کا سلسلہ آج تک جاری ہے دونوں ایک دوسرے کے تجربات سے مستقل فائدہ حاصل کر رہے ہیں۔

اسرائیل نے 1961ء میں ہی اٹامک ری ایکٹر کی تعمیر کا کام شروع کر دیا تھا۔ مارچ 1961ء میں عرب وزرائے خارجہ بغداد میں اجلاس کر کے اس سے پیدا ہونے والی صورت حال پر غور کیا۔ ری ایکٹر کی تعمیر سخت حفاظتی انتظامات میں خفیہ طور پر کی جا رہی تھی۔ بھارت بھی اپنے جوہری اسلحہ کے پروگرام کو توسیع دینا چاہتا تھا اور اس معاملے میں اسے اسرائیل کے تعاون کی ضرورت تھی کیونکہ اسرائیل کی جوہری مہارت افریقہ اور ایشیا کے دوسرے تمام ممالک سے بڑھی ہوئی ہے اور ڈیمونا Dimona کے مقام پر اس نے جو ری ایکٹر فرانس کی مدد سے تعمیر کیا ہے وہ دنیا بھر کے جدید ترین ری ایکٹروں میں سے ایک ہے۔ لیکن اسرائیل کو بھی ایک سخت مشکل درپیش تھی۔ اسے خام مال کی ضرورت تھی۔ دوسری طرف بھارت کے پاس تھوریم Thorium کا جو ذخیرہ ہے وہ دنیا کے وسیع ترین ذخائر میں سے ایک ہے۔ اسرائیل کا مفاد اسی میں تھا کہ وہ بھارت سے اس نوعیت کے تعلقات رکھے کہ کسی بھی وقت ضرورت پڑنے پر اس کے جوہری خام مال سے فائدہ اٹھا سکے۔ یوں ایک طرف جوہری مہارت کی برتری اور دوسری طرف جوہری خام مال کی فراوانی ان دونوں عوامل نے مل کر ایک ایسی صورت حال پیدا کر دی کہ دونوں ممالک کے مفادات میں گہری وابستگی پیدا ہو گئی سوئٹرزلینڈ کے یہودی سرمایہ داروں کا ایک گروپ بھارت میں اس شرط کے ساتھ ایندھن سازی کے ایک پلانٹ پر سرمایہ لگانے پر رضامند ہو گیا کہ اسرائیل کو اس سے فائدہ اٹھانے اور اس کی مصنوعات استعمال کرنے کی اجازت دی جائے گی۔

بھارت تو اس پیش کش پر گویا جھپٹ ہی پڑا اور اس نے فوراً جادوگدا کی مقام پر ایندھن سازی کا کارکارنہ نصب کر ڈالا۔ بھارت اسرائیل کے ساتھ جوہری معلومات کا تبادلہ بھی کرتا رہا ہے۔ اس سلسلے میں اسرائیل اٹامک انرجی کمیشن کے چیئرمین آرنسٹ برگمان اور بھارت کے اٹامک کمیشن کے چیئرمین کے درمیان ایک معاہدہ بھی ہوا تھا۔ اس معاہدے پر عرب

پریس کے رد عمل کا ذکر کرتے ہوئے لاہور کے ایک اخبار نے پاکستان پریس ایسوسی ایٹڈ کے حوالے سے لکھا ہے:

"لبنان کے پریس کی اس خبر کو بڑی دلچسپی سے پڑھا گیا ہے کہ اسرائیل کے ایٹمی ماہر برگمان Burgmann کو ابتدائی گفت و شنید کے لئے بھارت بلایا گیا ہے۔ مقصد یہ تھا کہ ایٹمی تحقیق کے میدان میں بھارت اور اسرائیل کے قریبی تعاون کے امکانات کا جائزہ لیا جائے"

بیروت کے ایک کثیرالاشاعت "اخبار الحیات" نے یہ رپورٹ اس تبصرے کے ساتھ شائع کی کہ اس خبر سے مقامی حلقوں میں اضطراب محسوس کیا گیا ہے۔

بیروت کے ایک اور کثیرالاشاعت اخبار "المسا" نے یہ خبر سرورق پر شائع کی، اور یہ کہا کہ حکومت ہند نے عربوں کے سب سے نازک مسئلے فلسطین کے معاملے میں ان کے خلاف سازش شروع کر دی ہے -- یہ مسئلہ عربوں کے لئے زندگی اور موت کا مسئلہ ہے -- اخبار نے اس صورت حال کو سنگین قرار دیا ہے اور تمام عرب ریاستوں سے اپیل کی کہ وہ سوال پر بھارت سے احتجاج کریں۔ بھارت نے عالم عرب کے احتجاج پر کوئی توجہ نہ دی اور اپنے بہت سے سائنسدانوں کو جوہری ٹیکنالوجی کی تربیت حاصل کرنے کے لئے اسرائیل بھیج دیا۔ ان میں سے ایک سائنس دان نے تل ابیب میں ریڈیو بیالوجی کی خصوصی تربیت حاصل کی۔

انٹرنیشنل اٹامک انرجی ایجنسی ---International Atomic Energy Agency-- کے آٹھویں سالانہ اجلاس کے موقعہ پر بھارت اور اسرائیل نے باہمی مشورے سے یہ طے کیا کہ وہ ایجنسی کو اپنی ایٹمی تنصیبات کے معائنے کی اجازت نہیں دیں گے۔

"مدراس کے نزدیک کالپاکام کا ایٹمی ری ایکٹر اسرائیل کے تعاون سے نصب کیا گیا ہے"

"یہ انکشاف بھابھا اٹامک ریسرچ سینٹر بمبئی کے ڈائریکٹر ہومی سیٹھنا نے کیا۔ انہوں نے یہ بھی بتایا کہ اس سینٹر کو چلانے کے لئے پلوٹینم Plutinum بھی اسرائیل سے حاصل کی گئی۔ - - ء میں بھارت نے اسی ری ایکٹر سے مقامی طور پر پلوٹینم کی تیاری شروع کر دی۔

بمبئی کے باہر تارا پور کے مقام پر 1380 MWZ اٹامک ری ایکٹر کی تعمیر میں بھی اسرائیل نے بھارت کی مدد کی تھی۔ اس ری ایکٹر نے اکتوبر 1969ء میں کام شروع کر دیا تھا۔

جنوبی افریقہ کی نسل پرست حکومت کے اسرائیل سے بڑے دوستانہ تعلقات ہیں۔ کیونکہ یہ ملک ایشیا اور افریقہ کے کسی بھی دوسرے ملک سے زیادہ یورانیم Uranium فراہم کر سکتا ہے۔ جنوبی افریقہ کے پاس تین لاکھ ٹن سے زائد یورانیم کے ذخائر موجود ہیں۔ یہ ایسے ذخائر ہیں جن سے نفع بخش بنیادوں پر مناسب قیمت خرچ کرکے یورانیم حاصل کی جا سکتی ہے۔ بھارت اپنے اسرائیلی دوستوں کے ذریعے جنوبی افریقہ سے یورانیم حاصل کر سکتا ہے۔ یہاں یہ بتا دینا بھی مناسب ہوگا کہ یہ تینوں ممالک جنوبی افریقہ اسرائیل اور بھارت جوہری اہلیت حاصل کر چکے ہیں۔ بھارت نے تو 1974ء میں راجستھان میں جوہری دھماکہ بھی کر دیا ہے۔ بھارت کسی بھی درجے کی سائنسی مہارت کے ذریعے یہ صلاحیت محض اپنے بل بوتے پر حاصل نہیں کر سکتا تھا جیسا کہ ایک امریکی زیلنڈ ہیزرڈ Zehand Hazard نے کہا ہے:

سائنسی ترقی کے میدان میں بھارت بہت پیچھے ہے۔ 1930ء کے بعد سے کسی بھارتی کو فزکس میں نوبل پرائز نہیں ملا۔ یہ بڑی کمزوری کی بات ہے۔ سائنسی میدان میں اتنی پسماندہ قوم کا جوہری ایٹمی توانائی جیسے مشکل میدان میں تمام حدوں کو عبور کر جانا اور تمام کامیابیوں کو پالینا بجائے خود ایک معمہ ہے۔"

لیکن اس شخص کے لئے یہ بات کوئی معمہ نہیں رہتی جو یہ جانتا ہو کہ اسرائیل اپنی تمام تر جوہری مہارت کے ساتھ بھارت کے جوہری پروگرام کی سرپرستی کرتا رہا ہے۔ اسلامی سیکریٹیٹ کے سابق سیکرٹری جنرل حسن التہامی نے کوالالمپور میں مسلمان ممالک کے وزرائے خارجہ کو بتایا تھا:

"بھارت کے ایٹمی سائنس دان ہمیشہ سے ہی اور خاص طور پر 60 کے بعد کے عشرے کے ابتدائی سالوں سے اسرائیلی سائنسدانوں سے قریبی رابطہ قائم کئے ہوئے ہیں"

عالمی پریس میں یہ بات بڑے تسلسل اور تکرار کے ساتھ کہی جاتی رہی ہے کہ بھارت نے اپنی مہم جو وزیر اعظم مسز اندرا گاندھی کی قیادت میں نومبر 84ء کے آخری دنوں میں پاکستان پر حملے کا پلان بنایا تھا اس ضمن میں سری نگر اور جموں میں ادھم پور کے ہوائی اڈوں پر بھارت اور اسرائیل کے پائلٹ پاکستان ایٹمی پلانٹ کہوٹہ پر حملے کی مشترکہ مشقیں کرتے

رہے ہیں۔

ان مشقوں میں دونوں ممالک کے پائلٹوں نے " جیگوار طیارے " استعمال کئے اور " کہوٹہ " نامی ایک ڈمی ٹارگیٹ بھی تیار کیا گیا تھا۔

شاید قدرت کو یہ منظور نہیں تھا کہ نومبر کے پہلے ہفتے میں ہی مسز اندرا گاندھی اپنے سکھ محافظوں کے ہاتھوں ماری گئی جس کے بعد یہ حملہ منسوخ ہو گیا کیونکہ ان کے سپوت مسٹر راجیو گاندھی جو بعد میں بھارت کے وزیر اعظم بنے مسلم دشمنی خصوصاً پاکستان دشمنی میں تو اپنی ماں کے صحیح جانشین ثابت ہوئے لیکن وہ اتنے بڑے حملے کا خطرہ مول لینے سے ڈرتے تھے۔ اس کی وجہ بھارتی پنجاب میں سکھوں کی شورش تھی۔ ان کے ہندوؤں کے خلاف بھڑکے ہوئے جذبات دیکھ کر یوں لگتا تھا جیسے پنجاب کے محاذ پر ہزیمت بھارتی فوج کا مقدر بن گئی ہے۔

بھارتی جرنیل جانتے تھے کہ فیصلہ کن معرکہ انہیں پنجاب اور کشمیر کی سرحدوں پر لڑنا پڑے گا۔ جہاں حالات ان کے مخالف تھے اور سکھ حریت پسندوں کی طرف سے بھارتی فوج کی پشت مکمل نامحفوظ ہو چکی تھی۔

آج بھی بھارت اور اسرائیل اپنے خفیہ گٹھ جوڑ کے تحت پاکستانی ایٹمی پالیسی کے خلاف سرگرم عمل ہیں۔ ان کی للچائی ہوئی نظریں کہوٹہ پر لگی ہیں۔ اب جبکہ عراق کی طرف سے پیدا ہونے والے تمام خطرات سے اسرائیل بے نیاز ہو چکا ہے تو اسے اس گھناؤنے منصوبے کو روبہ عمل لانے کے لئے کافی فرصت میسر آچکی ہے اور ضرورت اس بات کی ہے کہ پاکستانی سیاستدان اس نازک مرحلے پر اپنی قومی ذمہ داریوں کا احساس کریں اور پاکستان کا دفاع مضبوط سے مضبوط تر کرنے کی سمت اپنا سفر جاری رکھیں۔